www.iqbalkalmati.blogspot.com

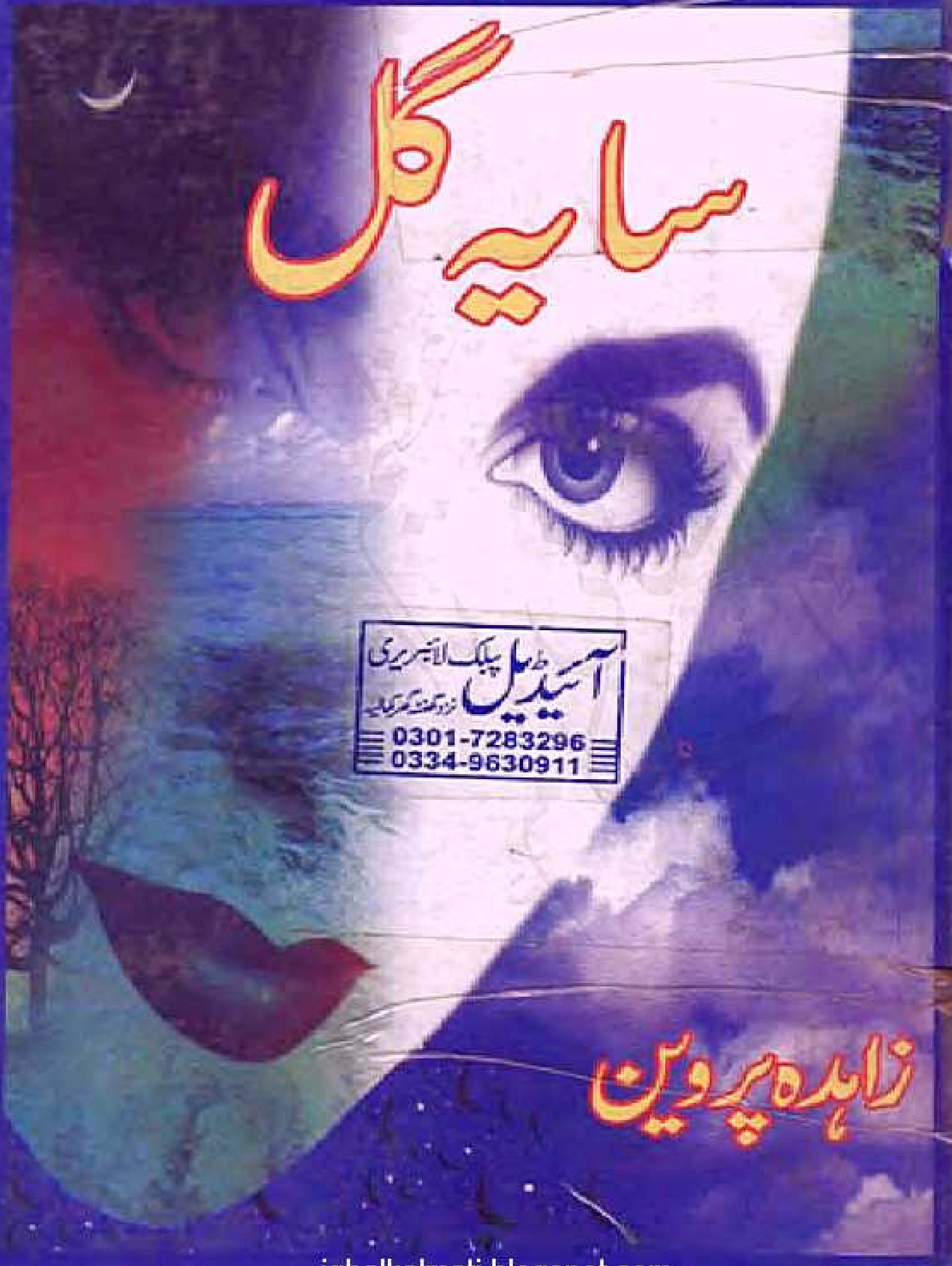

www.iqbalkalmati.blogspot.com

0301-7283296
0334-9630911

انتساب

اباجی

کے نام

جو ہم سے یکم اگست 1999ء کو بچھڑ گئے۔

تاحشر تیرے سائے کو ترسیں گی نگاہیں
یوں تجھ سے بچھڑنے کا نہ تھا وہم و گماں بھی!

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش لفظ

میرا خیال ہے کہ ہر کسی کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موڑ ضرور آتا ہوگا جب اس کے بہت سے کہے اور ان کہے جذبوں کو نیند سی آنے لگتی ہو۔ ایسا ہی شاید کچھ عرصہ سے میرے ساتھ ہونے لگا تھا۔ غالباً میں اونگھ رہی تھی جب --- ساگر پبلشرز نے مجھے بیدار کیا۔ اور میں ہڑبڑا کر اپنی لکھی اور بے لکھی چیزیں ٹٹولنے لگی۔

"سایہ گل" ہے تو میرا دوسرا ناول، مگر اس اعتبار سے پہلا کہ کتابی صورت میں پہلی کوشش ہے اور پہلے ناول "اندھیرے اجالے" کی طرح قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔

میں نہیں جانتی کہ فنی اعتبار سے یہ ناول کہاں تک کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار ہوتا ہے تاہم میں اس کے لئے دعا گو ضرور رہوں گی۔ اس سلسلے میں آپ سب کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ہی آئندہ کیلئے مشعل راہ ہوگی۔ گو کہ میری آپ کی جان پہچان کا عرصہ گزشتہ تمیں سالوں کی طوالت پر محیط ہے مگر کتابی صورت میں تو بہر طور یہ پہلی ملاقات ہی ہے۔

اس موقع پر اگر طارق اسمٰعیل ساگر صاحب کا ذکر نہ کروں تو بات بھی ادھوری رہے گی اور میری کم ظرفی بھی ہوگی۔ "سایہ گل" کو اک نئی آب و تاب دے کر آپ کے سامنے لانا در حقیقت انہی کا کارنامہ ہے۔ ساگر صاحب کی کوشش کہاں تک بار آور ہوئی اور میرا قلم کس حد تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

زاہدہ پروین

نومبر 1999ء

المدینہ کشیدہ کاری
0301-7283296
0334-6830911
[redacted]

اس روز چلچلاتی دھوپ چاروں اطراف پھیلی تھی۔

غضب کی گرمی اور گھٹن کا دور دورہ تھا۔ گرم گرم لو کے تھپیڑے جان و تن جھلسائے ڈال رہے تھے شاید ایسی گرم دوپہروں کے لئے یہ کہاوت مشہور ہے کہ چیل انڈا چھوڑ رہی تھی۔

اس جھلستی دوپہر کو جب لوگ باگ جلدی جلدی اپنے روزمرہ کے کاموں سے ہٹ کر اپنے کچے گھروندوں میں چھپے ہوئے تھے اور کھیت کھلیان، پگڈنڈیاں، باغات اور گلی کوچے ویران تھے۔ ایسے میں شہر کی طرف سے آنے والی کچی سڑک پر ایک یکہ نمودار ہوا اور "ٹخ ٹخ" کا ساز بجاتا اس گاؤں کے رہائشی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کچے راستے کے دونوں جانب پھلدار درخت قطار در قطار کھڑے تھے۔ اس شدت کی گرمی میں کوئی پھول پتا تک ہلتا نظر نہ آ رہا تھا۔ رس دار کالے کالے جامن اور موٹے موٹے شہتوتوں سے ڈالیاں لدی پڑی تھیں۔ فضا میں آموں کی میٹھی میٹھی خوشبو اور کبھی کوئل کی درد بھری پکار سے معمور تھیں۔

یکے پر چاروں طرف سے ایک چادر منڈھی تھی۔ آخری گوشے سے ایک چودہ پندرہ برس کی معصوم چہرہ لڑکی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی نگاہیں پیڑوں کی بلندیوں کا طواف کرنے لگتیں۔ کبھی ان پیڑوں کے عقب میں جھانکنے کی کوشش کرتیں۔ اور پھر ہر طرف سے مایوس سی ہو کر تیزی سے پیچھے سرکتی سڑک کو گھورنے لگتیں۔

سرمئی سڑک پر پکے پکے جامن، شہتوت اور کہیں کہیں ٹپکے ہوئے آم بچھے پڑے تھے مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہی۔ اس کے دل و دماغ کسی خاص سوچ میں ڈوبے ہوئے لگ رہے تھے یوں جیسے اس کا ننھا سا دماغ کسی گتھی کو سلجھانے میں مسلسل مصروف ہو۔

گود میں بیٹھے ہوئے نو دس ماہ کے بچے کو اس نے اپنی نازک نازک بانہوں میں مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مبادا ہاتھوں سے چھوٹ نہ جائے۔

یکے کی اگلی سیٹ پر ایک باریش صاحب براجمان تھے۔ سرخ و سپید شکل و شباہت اور چوڑی ہڈی سے خاندانی اور بارعب شخصیت معلوم پڑتے تھے۔ داڑھی گو کہ سفیدی مائل تھی، تاہم صحت کے لحاظ سے حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھے۔ اس وقت سیکن کلیوں دار کرتے اور علی گڑھی پاجامے میں ملبوس انتہائی جامہ زیب لگ رہے تھے۔ ان کے برابر میں پہلو سے پہلو ملائے کالا ریشمی برقعہ اوڑھے ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ گو رنگت خاصی گہری سانولی سی تھی مگر نقوش تیکھے اور رکھ رکھاؤ میں غایت درجے کا بانکپن پایا جاتا تھا۔ عمر کوئی یہی رہی ہوگی۔ تیس پینتیس سال۔ دبلا پتلا چھریرا بدن۔ اس وقت گلابی رنگ کا خوب کامدار غرارہ اور سبز سیکن کرتا پہنے تھیں۔ چہرے پر بلا کی آسودگی اور شادمانی کے آثار تھے۔

یکے بان بار بار گردن اور پیشانی سے بہتا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس حبس آلود دوپہر میں سڑک پر اور اس کے آس پاس کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ درختوں کے ہریالے سایوں کے باوجود ٹھنڈک کا احساس مفقود تھا۔ یکے کا گھوڑا بھی مرے مرے قدموں

سے جیسے سوچ سوچ کر چل رہا تھا۔ شاید گرمی اور لو کی تپش سے گھبرا کر مالک نے بھی اسے اس کی مرضی پر آزاد چھوڑ دیا تھا۔

"اماں ... اماں... " اچانک پچھلی سیٹ سے ایک باریک سی آواز ابھری۔

مگر خاتون پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح لاتعلق سی بیٹھی رہیں۔

"اماں۔ اماں۔ ۔!" آواز پھر ابھری۔ "مجھے پیاس لگی ہے اماں۔ پانی پلا دیجئے۔ اماں .... اماں۔"

"چپکے بیٹھے رہو۔" انہوں نے دفعتہً گردن موڑے بغیر اسے جھڑک دیا۔

بچہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ ایک سات آٹھ برس کا سہما سہما سا لڑکا تھا جو یکے کی پچھلی نشست پر ایک کونے میں سکڑا بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کا ننھا سا وجود پسینے کی بوندوں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس کے روتے ہی جلدی سے پاس بیٹھی بہن نے ایک ہاتھ سے اسے اپنی طرف سمیٹ لیا اور اس کا سر تھپکتے ہوئے دلگیر لہجے میں دھیرے سے بولی۔

"نہ۔ نہ..... روتے نہیں ہیں بھیا! رونے کی کیا بات ہے۔ بس ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔ پھر جتنا چاہے پانی پی لینا۔"

آگے بیٹھے ہوئے شخص نے اس گفت و شنید میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی لاتعلق سے انداز میں بیٹھے رہے۔

لڑکے کی ہلکی ہلکی سسکیاں اب تک ابھر رہی تھیں۔

❁

بڑے سے حویلی نما کچے گھر کے آنگن میں دوپہر سنسنا رہی تھی۔

نیم کے بلند و بالا تناور درخت کے پتوں میں کتنی ہی ننھی منی چڑیاں پروں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چونچ چھپائے ہانپ رہی تھیں۔ ہینڈ پمپ کے قریب بہت سارے سوکھے پتے جمع تھے۔ ایک طرف کیاریوں میں مہندی کے جھاڑ لگے تھے۔ بیچ آنگن میں لیموں کے دو پیڑ سر نہواڑے کھڑے تھے۔ گھر کے رہائشی حصے سے بہت دور مویشی خانہ تھا۔ جس کی حدود سے قبل کچی مٹی کی ایک نیچی سی دیوار تھی۔ اس کے اندر ہی چارہ کاٹنے کی مشین لگی تھی۔ باڑے میں چند بکریوں کے سوا باقی سارے جانور باہر چرنے گئے ہوئے تھے۔ اس گرمی کی شدت میں بکریاں جگالی کرنا بھی بھولے ہوئے تھیں۔

باڑا تو باڑا۔۔۔ رہائشی حصے کی طرف بھی الو بول رہا تھا۔ کشادہ صحن کے بعد ایک طویل و عریض برآمدہ تھا برآمدے کے عقب میں اونچی اونچی چھتوں اور بڑے بڑے مضبوط دروازوں والے چھ کمرے تھے۔

مگر دوپہر کی ان سنسناتی گھڑیوں میں ہر دروازہ اندر سے بند تھا۔

لپا پتا یہ صاف ستھرا دیہاتی گھر اس وقت بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے مکینوں سے خالی ہو لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی موجود تھا۔ لیکن کثرت عورتوں بچوں اور لڑکیوں کی تھی۔ غالباً گھر کے مرد اپنے کام پر ہوں گے۔

ایک کمرے میں دو الگ الگ چارپائیوں پر دیورانی اور جیٹھانی لیٹی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک اور چارپائی پر دو تین بچے آڑے ترچھے لیٹے سو رہے تھے۔

باہر کی قیامت خیز گرمی کی نسبت کمرہ کہیں آرام دہ اور ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ دیواریں کچی مٹی کی تھیں سیمنٹ بجری کی نہیں۔ یہاں کی نیم تاریکی، فرحت بخش اور سکون آور معلوم دے رہی تھی۔

دیورانی نے گود کے بچے کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف لٹاتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلاتے ہوئے جیٹھانی کو مخاطب کیا۔

"ہائے بھابی میری تو حیرانی کم نہیں ہوئی۔ آخر یہ ابا میاں کو سوجھی کیا؟ بھلا کبھی

پہلے بھی کنبے برادری میں یہ بات سنی ہے؟"

جیٹھانی نے اس سے بھی حیران لہجے میں جواب دیا۔ "ارے میں نے جب سے سنا ہے دل کو پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ سچی بات ہے میں تو جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ مجھے یقین نہ آئے گا۔ ہائے رئیسہ! ابا میاں کی صورت یاد آتی ہے تو تعجب سے دم گھٹنے لگتا ہے۔"

رئیسہ نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں بھابی سکینہ بات ہی کچھ ایسی حیران والی ہے۔ لیکن یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ گل بھیا تو کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتے اور پھر وہ بھی اپنے ہی باپ کے خلاف۔۔۔! یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو تینوں بھائی ہی باپ سے کس قدر ڈرتے ہیں اور اور پھر گل بھیا سے کسی فضول بات کی توقع کون کر سکتا ہے؟"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو۔" سکینہ بھابی نے فوراً اس کی تائید کی۔

"گل نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاتھوں کا پروردہ ہے۔ وہ تو اگر کوئی جھوٹ بات بھی کہہ دے تو سچ نکلے۔ ابا میاں سے سب میں زیادہ وہی تو قریب ہے اور پھر اس کا کہنا ہے کہ وہ خود نکاح میں شریک تھا۔ بلکہ ابا میاں نے جتنی خریداری کروائی، جوڑے سلوائے، زیورات بنوائے، گل ہر تیاری میں پیش پیش تھا۔ بھلا وہ تو لکھنؤ کا کیڑا ہے۔ ہر بازار میں اور ہر گلی کوچے سے واقف۔۔۔۔"

اچانک رئیسہ کا بچہ رونے لگا وہ "اللہ اللہ" کر کے اسے تھپکنے لگی۔

بھابی سکینہ نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑتے ہوئے پھر کہا۔ "میں کہتی ہوں رئیسہ اب تو اللہ رکھے ابا میاں کی اولاد بھی سیانی ہو گئی تھی۔ سب سے چھوٹا گل تھا، ماشاءاللہ وہ بھی جوان ہو گیا۔ اب بھلا انہیں دوسری شادی کی آفت ہی کیا آئی تھی؟ اونہہ! چلے ہیں بڑھاپے میں شادی رچانے۔ ایمان سے سارے گاؤں میں شور مچ گیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ یوں تو سارے گاؤں والے اپنے ہی کنبے کے لوگ ہیں مگر ایسی انہونی باتیں کنبے والے ہی تو زیادہ اڑاتے ہیں۔ کل تایا کے ہاں سے ان کی بڑی بہو آئی تھی سنا تھا وہ کیا کہہ رہی تھی؟"

رئیسہ نے افسوس کے لہجے میں کہا۔ "یہ بات تو ہر کوئی کہے گا۔ سچ ہی تو ہے کہ اگر شادی کرنی ہی تھی تو اپنے کنبے میں کر لیتے۔ کوئی نہ کوئی رانڈہ بیوہ مل ہی جاتی۔"

"بھلا گاؤں کی رانڈہ بیوہ انہیں کیا بھلی لگتی!" سکینہ بھابھی نے تھوڑا ہنس کر مذاق کے انداز میں کہا۔ "انہیں تو لکھنؤ والوں سے رشتہ داری جوڑنی تھی اس بڑھاپے میں۔ اللہ کی شان! بیاہ رچایا تو وہ بھی بچوں کی اماں سے۔"

"آپ بھی کمال کر رہی ہیں بھابھی۔" رئیسہ نے مسکرا کر انہیں ٹوک دیا۔ "اس عمر میں کوئی بیوہ نہ ملے گی تو کیا کنواری ملے گی۔ تین بچوں کی اماں ہی تو ہے۔ جبکہ خود ابا میاں کی اولادیں بڑھاپے کی دہلیزوں کو چھو رہی ہیں۔ آخری اولاد گل بھیا ہیں تو وہ بھی جوان ہو چکے ہیں۔ ماشاءاللہ ابا میاں، نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں والے ہو گئے۔ اے میں تو کہتی ہوں بھابی سکینہ! بھلا ابا میاں جب اپنی ان لکھنؤ والی بیگم صاحبہ کے ساتھ یہاں گاؤں میں آئیں گے تو کس دل گردے سے آئیں گے؟" پھر خود ہی ہنسی ضبط کرتی ہوئی بولی۔ "ایمان سے سچ کہتی ہوں بھابی! اگر خدانخواستہ میں ابا میاں ہوتی تو مجھے بہت شرم آتی۔ میں تو کبھی گاؤں میں اپنے عزیز رشتے داروں کو صورت دکھانے بھی نہ آتی۔"

رئیسہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہ سب شہر میں رہنے کی صفت ہے۔ وہیں کے آزادانہ اور بے باک قسم کے طور طریقے اپنا لئے ہیں ابا میاں نے ۔ لو بھلا پھوپھی اماں (ساس) کی زندگی سے شہر میں رہتے آئے ہیں۔ اول تو انہوں نے یہی غلط کیا کہ اچھی گھر کی زمینداری چھوڑ کر شہر میں نوکری کی اور سدا وہیں کی رہائش بھی رکھی۔ میں نے

اکثر بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ بچپن سے ہی زیادہ تر گاؤں سے باہر رہے۔ انہیں کھیتی باڑی اور ہل بیل سے کبھی رغبت ہی نہیں رہی بس عید تہوار گھر آتے تھے، پھوپھی اماں اللہ انہیں جنت نصیب کرے، ہمیشہ اسی بات پر کڑھتی رہیں مرتے مرتے بھی یہی ایک غم اپنے ساتھ قبر میں لے گئیں۔ اب ان دوسری بیگم صاحبہ کا کیا حال ہوتا ہے! یہ دیکھنا ہے؟"

"ہوں اس خیال میں مت رہنا!" سکینہ بھابی نے طنزیہ انداز میں ایک ابرو چڑھا کر کہا۔ "ہر عورت ہماری ساس جیسی صبر والی نہیں ہوتی۔ شہر والیوں اور دیہاتی عورتوں میں بہت فرق ہوتا ہے اور پھر یہ دوسری بیگم صاحبہ ہیں بھی کہاں کی؟ لکھنؤ شہر کی جو نزاکت و نفاست میں سب سے آگے ہے وہ تو یہاں گاؤں میں ایک دن بھی نہ رہ پائیں گی۔ سچ کہتی ہوں رئیسہ! اگر انہیں یہاں ہر چیز میں گوبر کی بدبو نہ آئے تو نام بدل دینا میرا۔"

رئیسہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "چلو ابا میاں کا مزاج تو درست کرے گی ہمیشہ انہوں نے اپنے من کی کی۔ کیا خبر اب حساب کتاب کا وقت آ پہنچا ہو اور یہ دوسری بیگم صاحبہ انہیں اپنے اشاروں پر چلائیں اور اپنے اور اپنے بچوں کے سوا کسی کا بھی نہ رہنے دیں۔"

"دیکھ لینا تم بالکل ایسا ہی ہوگا۔" سکینہ بھابھی نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔

"کیا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ ذرا ہم بھی تو سنیں!"

گل نے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے کہا اور آتے ہی بڑی بھاوج سے پوچھا۔

سکینہ بھابی نے دیور کو دیکھ کر بات پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ نہیں۔ ہم ذرا بچوں کی باتیں کر رہے تھے۔ تم سناؤ صبح سے کدھر غائب تھے؟"

گل نے اپنے آپ کو رئیسہ چارپائی پر گراتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"ارے غائب کہاں ہونا تھا بھابی۔ گندم کی کٹائی ہو رہی ہے وہیں کھیتوں پر ڈیوٹی لگا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھی تھی بھائی صاحب نے۔ آپ کے سر کی قسم! صبح سے کتائی کرنے والوں کے سر پہ کھڑے کھڑے یہ وقت آگیا۔ بمشکل تمام جان چھڑائی ہے۔ وہ تو منجھلے بھائی صاحب نے چھٹی کروادی ورنہ بڑے بھائی صاحب تو بیل ہی سمجھتے ہیں۔ اس غضب کی گرمی ہے آج کہ ایڑی سے چوٹی تک دھاروں دھار پسینہ بہہ رہا تھا۔ بے چارے کتائی کرنے والوں کی تو بری حالت ہے---- توبہ، توبہ۔" انہوں نے رئیسہ کے دوپٹے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

دونوں بھاوجیں اس کی درگت پر ہنس پڑیں۔

"اچھا تو آپ کو ہنسی سوجھ رہی ہے اور یہاں گرمی نے حشر بگاڑ رکھا ہے۔" گل نے برا سا منہ بنا کر جواباً کہا۔ پھر بھاوج کا شانہ ہلا کر رعب سے بولے۔ "یہ آپ بیٹھی ہوئی "ٹھی ٹھی" کیا کیے جارہی ہیں۔ اٹھیے! اٹھ کر ذرا دیور جی کے لئے میٹھی لسی کا اہتمام کیجیے۔"

رئیسہ بدستور ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ذرا دیر بعد جب تینوں دیور بھابی لسی پی رہے تھے تو سکینہ بھابھی نے بڑی ہوشیاری سے اپنا پسندیدہ موضوع سخن دوبارہ چھیڑ دیا۔ "گل! تم نے تو اپنی نئی امی خوب پاس سے دیکھ لی ہوگی! کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کیسی ہیں؟ آخر کو وہ ہماری ساس صاحب بن گئی ہیں۔"

گل نے رئیسہ کو گلاس دیتے ہوئے شوخی سے جواب دیا۔ "خیر--- وہ آپ کی ساس تو کسی طرف سے بھی نہیں لگتیں۔ ایسی طرحدار، نازک نازک سی--- وضع دار خاتون ہیں بھابی کہ بس کچھ مت پوچھیے۔ شوقین مزاج بھی بہت ہیں۔ اچھے سے اچھا پہننا اوڑھنا تو جیسے ان کی سرشت میں داخل ہے اور کھانا تو اتنا مزیدار پکاتی ہیں کہ گھنٹوں زبان اسی لذت سے آشنا رہتی ہے۔"

رئیسہ نے بے صبری سے ان کی بات کاٹ دی اور آنکھیں نچا کر بولیں۔ "تب تو ابا میاں ان سے بہت راضی رہیں گے۔"

"ارے ایسے ویسے۔" گل نے ایک طویل سانس لے کر بتایا۔ "جب ابا میاں دورے پر نہ گئے ہوں، انہیں باورچی خانے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ ویسے حقیقت یہ ہے بھابی کہ وہ بھی ابا میاں کی چاہ بہت کرتی ہیں۔ کیا مجال ہے کہ ابا میاں کی موجودگی میں ان کے بچے کبھی اونچے لہجے میں بول بھی جائیں۔ اور ان کی غذا، آرام، نیند اور کپڑے لتوں کی ایسی فکر رکھتی ہیں اتنی دیکھ بھال اور سنبھال رکھتی ہیں کہ کوئی دوسری بیوی رکھ نہیں سکتی۔ ایمان سے سچی بات تو یہ ہے کہ شوہر کے سامنے وہ اپنے تینوں بچوں کی طرف توجہ نہیں کرتیں۔ میں نے وہاں اتنے دن رہ کر یہی کچھ دیکھا۔ حتیٰ کہ ابا میاں جب دورے پر جاتے ہیں تو دسیوں قسم کے حلوے، سالم بھونی مرغیاں اور روغنی پراٹھے وغیرہ اور چٹنی مربے اچار سمیت یہ بڑے بڑے دو ٹفن کیریئر ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بے چارے چپراسی سے سنبھالے بھی نہیں جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے ان کے ہاتھ میں لذت بھی بہت دی ہے اور برکت بھی بے حد ہے، چیز ختم ہونے میں نہیں آتی۔"

"چلو جی--- گل میاں بھی گئے کام سے۔" سکینہ بھابی نے ننھا سا قہقہہ لگا کر طنزیہ انداز میں کہا۔

رئیسہ بھی جل کر بولی۔ "ارے یہ سب چلتر چند دن دکھاوے کے ہیں۔ یہ تو سمجھی ہی ہوں گی کہ ابا میاں بڑے زمیندار بھی ہیں اور اتنی اونچی سرکاری ملازمت بھی ہے اگر اس طرح کے چلتر دکھا کر دل مٹھی میں نہ کریں گی تو دھن دولت پہ قبضہ کس طرح کریں گی۔ آخر پہلے شوہر کے بچوں کے لئے ابا میاں کے صحیح وارثوں کا اسی صورت میں تو حق ماریں گی اور پھر جو جو کچھ پکاتی رہتی ہیں کون ابا میاں اکیلے کھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتے ہوں گے؟ان کے اپنے بچے ہی کھاچاٹ جاتے ہوں گے"

"ارے چھوڑیئے بھی۔" گل نے ان کی لمبی چوڑی تقریر سن کر برا سا منہ بنایا۔ "کیا کھاچاٹ جاتے ہیں ان کے بچے! میں کہتا ہوں ایک لحاظ سے تو وہ اپنے بچوں کے لئے بڑی کنجوس ثابت ہو رہی ہیں۔ پہلے پہل خود میرا بھی یہی حال تھا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے بچوں کے لئے ہی کرتی ہیں لیکن جب میں وہاں رہا تو رفتہ رفتہ میری آنکھیں کھلتی گئیں اور مسلمان ہیں تو یقین کیجئے ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے اپنے سطحی اور پنچ خیالات پر خود بخود ندامت ہونے لگی اور میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنی کمینگی پر معافی مانگی۔ اللہ پاک کی قسم بھابی . . "

سکینہ نے اس کی بات کاٹ دی اور چمک کر بولی۔ "اے بس اب ان کے اوصاف بیان کر بھی چکو۔ ایسا بھی کیا تم نے دیکھا کہ اپنے آپ کو کمینہ بھی بنالیا اور خدا سے توبہ و استغفار بھی کرنے لگے۔"

لیکن گل ان کی بات کا برا مانے بغیر سنجیدگی سے کہتے رہے۔ "دنیا میں ایسی کوئی عورت آپ نے دیکھی ہوگی کہ شوہر جب تک سو کر اٹھ نہ جائے نہا دھو کر تیار ہو کے ناشتہ پانی سے فارغ ہو جائے اور آرام سے ڈیوٹی نہ چلا جائے بچوں کو ناشتہ بھی نہ کرنے دے؟ ابامیاں کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتی ہیں؟ شاہی نوکری ہے شاہی۔ دس ساڑھے دس بجے سے قبل کبھی دفتر گئے ہی نہیں۔ جب تک وہ سو کر نہ اٹھ جائیں کسی بچے کو رونے تک کی اجازت نہیں۔ اور بچے بھی کونسا سمجھ دار ہیں۔ سب میں بڑی لڑکی تیرہ چودہ برس کی ہے۔ ایک لڑکا پانچ چھ سال کا اور سب میں چھوٹا تو ابھی پوری طرح چلنا بھی نہیں سیکھا۔ میں تو کہتا ہوں آفرین ہے اس لڑکی پر مجال ہے ابامیاں یا اپنی اماں کے پاس ان بچوں کو پھٹکنے دیتی ہو --! ہر وقت مرغی کے چوزوں کی طرح گھیرے بٹورے رکھتی ہے مجال ہے جو ماں کے حکم کے بغیر کوئی بچہ رو جائے یا اوپر کی منزل چلا جائے؟

مختلف حیلے بہانوں سے دونوں کو نیچے ہی بہلائے رکھتی ہے۔ ابامیاں جب دن کے دس بجے تیار ہو کے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے نیچے اترتے ہیں تو آخری سیڑھی پر ان کا اردلی ان کے انتظار میں اٹین شن ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ روانہ ہوتے ہیں دونوں لڑکے...... بہن کا ہاتھ چھڑا کر اوپر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھابی اس وقت صبح کے دس بجے ہوتے ہیں۔ بڑا نیچے پھلانگتا ماں کے پاس یوں پہنچتا ہے جیسے قید خانے سے چھوٹا ہو۔ تب بہن چھوٹے والے کو گود میں سنبھالے اوپر آتی ہے۔

پھر ایک اور تعجب خیز پہلو سنئے۔ ان کی اماں جو ناشتہ ان کو دیتی ہیں، اس کے بعد لڑکے تو قدرے آزادی سے کھیل کود میں مگن ہو جاتے ہیں اور لڑکی کی دوبارہ شامت آجاتی ہے۔ اپنے کمزور سے ہاتھ پیروں سے وہ جھاڑو لگاتی ہے۔ برتن مانجھتی ہے۔ آٹا گوندھنا، مصالحے پیسنا، ملازموں کے اوپر والے سارے کام ذرا سی حجت کئے بغیر مشین کی طرح کئے جائے گی۔ جب تک میں وہاں تھا کوئی ملازمہ وغیرہ تو ملی نہیں تھی۔ چند ایک سے کہہ رکھا تھا شاید اب مل گئی ہو تو بے چاری کی جان چھوٹ گئی ہو۔"

سکینہ بھابی اور رئیسہ جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ داستان امیر حمزہ سن رہی تھیں، گل کے خاموش ہوتے ہی بیک وقت پوچھنے لگیں۔ "ذرا سی بچی سے کام کرواتی ہیں اور وہ کیا کرتی ہیں سارا دن!"

گل نے ایک طویل سانس لیا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "بیکار تو وہ بھی نہیں رہتیں۔ باورچی کو خود ہی چھٹی کروا دی کہ عمدہ کھانا نہیں پکاتا۔ حالانکہ وہ ابامیاں کا بہت پرانا باورچی تھا اور خاصا ڈھنگ کا کھانا تیار کر لیتا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ ابامیاں نے بیک جنبش زبان بے چارے کی چھٹی کر دی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ لڑکی سے تو اوپر کا کام لیتی ہیں اور خود پکاتی ہیں، مزید حتی اور گھارتی ہیں۔ مثلاً لڑکی سے چاول بنوا لئے، مصالحے پسوا لئے وغیرہ اور چولہے پر بیٹھ کر بگھارے خود۔ دم خود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا۔ چپاتیاں بھی خود پکاتی ہیں۔ ابامیاں اور خود اپنے لئے پکانے کے بعد باقی کا آٹا لڑکی کو دے دیتی ہیں پکانے کو۔ ارے بھابی! ہر روز دو تین ہانڈی تو پکتی ہیں ان کے ہاں۔ ہر دوپہر نئے فروٹ کا اہتمام ہوتا ہے آپ کبھی دوپہر کو جائیں تو محسوس کریں گے جیسے کوئی مہمان آ رہے ہوں کھانے پر۔۔۔ ایمان سے بہت نفاست اور سلیقے سے پکاتی ہیں۔ ابامیاں کی زبان گن گاتے نہیں تھکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے ساری زندگی ایسا سکھ چین نہیں ملا تھا۔ لیکن معصوم بچوں کے ساتھ ماں کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے تو بہت رحم آتا تھا۔ ایک طرح انہوں نے اپنے بچوں کو ابامیاں سے ڈرا رکھا ہے اور ابا میاں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کتنے غرور کی حد تک کم سخن ہیں! جب ماں ہی توجہ نہیں کرتیں تو سوتیلے باپ کو کیا ضرورت ہے پرائی اولاد کا خیال رکھے۔ کم سے کم میں نے تو کبھی ان کو اپنے بچوں سے پیار کرتے نہیں دیکھا۔ لڑکی اتنی خوددار ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں سمیت ان کے سامنے کبھی پڑتی ہی نہیں۔ یا پھر شاید اماں نے منع کر رکھا ہوگا۔"

سکینہ بھابی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر متردد انداز میں کہا۔ "ہاں بھئی۔ دنیا میں ہر قماش کی عورتیں ہوتی ہیں ورنہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر وہ بچوں کو ابا میاں سے مانوس ہونے دیں تو اتنے سنگدل تو وہ بھی نہیں ہیں کہ ان سے سوتیلا سلوک کریں گے۔ وہ تو کہو بچوں کی اماں جانے کس مصلحت کے تحت خود ہی ان لوگوں کو دور دور رکھتی ہیں۔ ورنہ یتیم بچوں کا ساتھ دینا اور ان کے ساتھ پیار محبت سے پیش آنا ثواب کا کام ہے۔"

باتوں کے دوران دونوں دیورانی جیٹھانی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور کچھ کچھ رنجیدہ بھی ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔

پھر رفیعہ نے تھوڑا سا مسکرا کر پوچھا۔ "اور وہ شوقین مزاجی والی کونسی بات بتا رہے تھے تم! وہ تو بیچ میں رہ گئی۔"

گل نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "شوقین مزاجی یہ کہ تین بچوں کی اماں ہو کر بھی ہر وقت سولہ بلکہ سترہ اٹھارہ سنگھار کئے رکھتی ہیں۔ سرمہ مسی، کنگھی چوٹی، بس نئی نویلی دلہن معلوم ہوتی ہیں۔ لباس ایسے دیدہ زیب اور چٹک بھڑک کر بس دیکھا کرو۔ بہت ہی شوخ رنگ پسند ہیں ان کو پھیکے۔ دھیمے اور ہلکے رنگوں کو "ڈے فوج" کہہ کر دور پھینک دیتی ہیں۔ یہ بڑے بڑے ریشمی غرارے اور اونچی کوالٹی کی ساریاں باندھتی ہیں۔ ارے بھابی! ہر شام تو ایک لونڈا ملازم ان کے لئے موتیا کے ہار گجرے پہنچا کے جاتا ہے۔ پھولوں سے تو اس قدر عشق ہے ان کو اپنے جوڑے اور کلائیوں میں باندھے رہیں گی ہی، پائی کی صراحی تک پہ پھولوں کے ہار لپٹے رہتے ہیں۔ خوش مزاج اور خوش مذاق بھی بہت ہیں۔ میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی تھیں۔"

رفیعہ نے شرارت سے دیور کو چڑانے کے مارے ہنس کر کہا۔ "اچھا۔۔ تو یہ تھی ان کی شوقین مزاجی!"

گل بیچ بیچ چڑ گئے۔ اور غصے سے منہ لال کر کے بولے۔ "تو پھر سنئے اصلی شوقین مزاجی۔۔۔وہ۔۔۔ آپ کی ساس صاحبہ "سنیما" بھی دیکھتی ہیں۔"

"ہائیں۔۔۔ سنیما!!!"

حیرت کی شدت سے ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

گل بھاوجوں کی کیفیت سے لطف اٹھانے لگے اور بھتیجے کو گدگداتے ہوئے کہنے لگے۔ "اب آیا مزہ دونوں کو۔"

تھوڑی دیر بعد سکینہ بھابی کے حواس درست ہوئے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور پیشانی کا پسینہ خشک کرتی ہوئی بولیں۔ "تب تو بھیا وہ دیکھنے کی چیز ہوں گی۔ مجھے تو بہت اشتیاق ہو گیا۔"

ابھی پورے طور پر الفاظ ان کی زبان سے ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی نے زور دار لات رسید کی۔ ایک دھماکے سے دونوں کواڑ کھل گئے۔

دھماکہ اس زور کا ہوا کہ سوئے ہوئے بچے بھی جاگ اٹھے۔

یہ تینوں حیران ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

دفعتہً گل بوکھلا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہکلا کر بولے "اب ... ابا میاں ... "

"کیا بات ہے ... یہاں تو سب اس طرح گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں جیسے یہ دن نہ ہو ... بلکہ آدھی رات کا وقت ہو۔" بارعب، سرخ و سپید رنگت اور قابل رشک صحت کے مالک ابا میاں بیچ کمرے میں آ کر اپنی پاٹ دار آواز اور گونجیلے لہجے میں دھاڑے۔

تیرہ چودہ برس کی معصوم چہرہ لڑکی کی گود میں دبکا ہوا بچہ سہم کر رونے لگا۔ چھ سالہ لڑکا دبے پاؤں چلتا ہوا گل کی ٹانگوں سے جا لگا اور منمنا کر بولا۔

"بھائی جان پانی ... پانی پلا دو بھائی جان۔"

گل نے دھیرے سے، بے حد نرمی کے ساتھ اسے اپنے سے قریب کر لیا۔

لڑکی روتے ہوئے بچے کو لے کر ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔

کمرے کی فضا ایک دم ہی بوجھل ہو گئی تھی۔

ابا میاں کی کڑی نگاہیں ایک ایک کر کے چہرے پر انگاروں کی طرح برس رہی تھیں مگر یہاں تو سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

جواب کون دیتا؟

دیورانی جیٹھانی کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ گل سر جھکائے کھڑے تھے۔ بچے سہم گئے تھے اور --- ابا میاں! بیچ کمرے میں کھڑے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ خود بخود ہی ان کا پارہ چڑھتا گیا تھا۔ شاید یہ بھی آگ برساتی گرمی کا کرشمہ تھا۔

سیاہ ریشمی برقعے والی خاتون نہایت اطمینان سے کھڑی اس طرح ہر چیز اور ہر فرد

کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جیسے سحائے پر نکلی ہوں۔ آنکھوں میں گہری اجنبیت تھی۔

ابا میاں چند لمحے کھڑے سب کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے رہے پھر دروازے سے باہر جاتے ہوئے آہستگی اور ملائمت سے بولے۔ "آئیے نائمہ بیگم ... آئیے آپ ہمارے ساتھ آئیے۔"

نائمہ بیگم جو اوپر کا برقعہ اتار کر ہاتھ میں لے چکی تھیں دھیرے دھیرے چہرے کا پسینہ خشک کرتی ہوں ان کے پیچھے پیچھے "اف اف ... ہائے گرمی۔" کے الفاظ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں بچوں کی طرف انہوں نے ... پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ گویا ان بچوں سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

اس ایک لمحے ---

لڑکی کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پریشانی اور فکر مندی کے سائے ڈولنے لگے۔ وہ بچے کو گود میں لئے لئے تیزی سے ماں کے پیچھے لپکی۔

"مشکبار ... مشکبار!" گل نے آواز دبا کر دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا۔

اس کے قدم آپ ہی آپ تھم گئے اور وہ مڑ کر استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تم یہاں آ جاؤ مشکبار ... بھابی کے پاس بیٹھو۔" گل نے نرمی سے اسے واپس بلایا۔

وہ مرے مرے قدموں سے واپس لوٹی اور سکینہ بھابی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

گل نے کھڑے کھڑے تعارف کرایا۔

"بھابی ان کا نام مشکبار ہے۔ اور بھئی یہ ہیں ہماری چھوٹی بھابی اور یہ بڑی بھابی۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی ٹکر ٹکر سب کی صورتیں تک رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کھلے دروازے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی طرف دیکھنے لگتی جہاں اس کی اماں اور ابا میاں باہر گئے تھے۔

گل نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ تشفی آمیز لہجے میں بولے۔ "گھبراؤ مت مشکبار۔ یہاں سب تمہارے دوست ہیں۔ تم ان دونوں بھائیوں کو اور ان کے سارے لشکر (بچوں) کو بہت محبت کرنے والے پاؤ گی۔ یہاں غیریت والا ماحول ہی نہیں ہے۔ سب اپنائیت سے ملیں گے۔ اب تم آرام اور سکون سے بیٹھ کر بھابی سے باتیں کرو میں جا کر ابا میاں کی طرف ٹھنڈا مشروب وغیرہ پیش کر آؤں دوپہر بہت سخت ہے نا اس لئے وہ لوگ آرام کرنے چلے گئے ہیں۔"

پھر رئیسہ کو مخاطب کر کے بولے۔ "آپ ان دونوں بچوں اور مشکبار کو سنبھالئے۔ شربت وغیرہ پلائیے۔ شاید یہ تینوں سو جائیں کیونکہ گرمی کا احساس باقی رہا تھا نہ اپنی تھکاوٹ کا۔ ان لمحوں میں ان کی تیز طراری اور برق رفتاری قابل دید تھی۔

مشکبار چھوٹے بھائی کو گود میں دبائے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دوسرا بھائی گل کے چلے جانے کے بعد بہن کے شانے سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

رئیسہ جلدی جلدی روح افزا کی بوتل کھولنے لگی۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔

ابا میاں بیٹھک میں تنہا نیم دراز حقہ گڑگڑائے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی سوچ کا تاثر تھا مگر مجموعی طور سے چہرہ مطمئن اور آسودہ تھا۔

دفعتہً زیادہ گہرا کش لینے سے انہیں کھانسی کی دھانس اٹھی تو وہ آپ ہی آپ چونک گئے اور حقے کی نے ایک طرف کر کے سیدھے ہو بیٹھے۔ شرفو کو بلا کر دو گھونٹ پانی پیا پھر اسے مخاطب کر کے بولے۔ "اندر جاؤ۔ دیکھو اگر عباس اور الیاس آ گئے ہوں تو انہیں ادھر بھیج دو۔"

"بہت اچھا میاں!" شرفو نے ادب سے جواب دیا اور گلاس لئے لئے وہاں سے ہٹ گیا۔

دوپہر کی نسبت اس وقت شام خاصی خوشگوار تھی۔ ہلکی ہلکی جی کو بھلی لگنے والی ہوا چل پڑی تھی۔ دن بھر جو گرمی سے طبیعتیں بولائی بولائی رہی تھیں، اب سکون پذیر ہو گئی تھیں۔ کھیتوں کھلیانوں کی طرف سے ہرے ہرے چارے سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں شہر کی طرف آنی شروع ہو گئی تھیں۔ چلچلاتی دھوپ سمٹ کر رخصت ہو چکی تھی۔ تو گھروں کے کچے آنگن اور ویران گلیاں آباد ہو گئی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ باورچی خانوں سے نکلتی دھوئیں کی لکیریں آسمان کی طرف محو پرواز تھیں۔ غرضیکہ دن کے موسم اور اس وقت کی رت میں بے حد تضاد حائل تھا۔ جس سے انسان تو ایک طرف چرند پرند نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔

ابا میاں کا موڈ بھی دوپہر کی نسبت اب خاصا خوشگوار تھا۔ ورنہ دوپہر کو وہ جس قہر برساتے موڈ میں گرجتے برستے نمودار ہوئے تھے، اس نے تو سب کا خون خشک کر ڈالا تھا۔ مگر پھر دوپہر بھر کے آرام اور اب ہوا کے جھونکوں نے انہیں بحال کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مسجد سے مغرب کی نماز پڑھ کر یہاں اپنے مخصوص تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آ بیٹھے تھے اور حقہ گڑگڑاتے ہوئے کچھ سوچے جا رہے تھے۔

چند لمحوں بعد الیاس اور عباس دونوں بھائی آگے پیچھے چلتے ہوئے آئے اور باپ کو ادب سے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔

گو یہ دونوں بچوں بچیوں والے تھے اور اچھی خاصی عمروں کے سنجیدہ اور بردبار مرد تھے مگر اپنی خاندانی قدروں اور ذاتی اوصاف کی بنا پر باپ کا احترام اور خوف کی حد تک کرتے تھے۔ ان کے سامنے کبھی اونچی آواز سے یا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

دوپہر کو جب سے ابا میاں بیوی اور بچوں کے ساتھ آئے تھے، عباس اور الیاس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ دونوں خاصی دیر پہلے کھیتوں سے آ گئے تھے پھر باپ کے سامنے ان کے بلانے ہی آئے تھے۔ اب ان لمحوں میں نظریں جھکائے باپ کے کچھ بولنے کے منتظر تھے۔ چہرے دونوں کے پر اضطراب تھے اور اندر سے دل بے چین!

تھوڑی دیر گھبراسناٹا طاری رہا جسے ابا میاں کے حقے کی گڑگڑاہٹ مجروح کر رہی تھی۔ پھر انہوں نے جلدی جلدی دو چار کش لئے اور نے ایک طرف کر کے پوچھا۔

"گندم کی فصل کیسی جا رہی ہے؟ کٹائی کس سے کروا رہے ہو؟"

الیاس چونک پڑے بڑے بھائی کی طرف دیکھنے لگے مگر عباس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "خدا کا شکر ہے پچھلے برس کی نسبت یہ فصل زیادہ تگڑی ہے اور مزدور تو میں نے وہی رکھے ہیں جو ہر فصل پر ہوتے ہیں با اعتبار لوگ ہیں بے چارے۔"

"ہوں۔" انہوں نے گویا اطمینان کا ہنکارا بھرا۔ پھر دونوں بیٹوں کی صورت غور سے دیکھ کر بولے۔ "میں نے آج اپنے یہاں پہنچنے کی اطلاع کروا دی تھی پھر بھی تم لوگوں نے سواری اسٹیشن پر نہیں بھیجی؟ اس تجاہل عارفانہ کو میں کیا سمجھوں؟"

عباس اور الیاس حیران رہ گئے۔ مارے تعجب کے جیسے ان کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔ عباس نے پریشان ہو کر باپ کی طرف دیکھا اور ہکلا کر بولے۔ "آپ نے اطا.. .اطلاع کروائی تھی! کمال ہے ہمیں معلوم بھی نہیں۔"

"معلوم کیسے نہیں۔" وہ غصے سے سرخ ہو کر بولے۔ "یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے سہارن پور سے یہاں گاؤں میں اپنے آنے کی خبر پہنچوائی ہو اور نہ پہنچی ہو۔ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟ یہ کہو تم لوگ اپنی ناخلفی اور نالائقی کا ثبوت دینے پر تل گئے ہو۔ آج مجھے ذاتی سواری کے ہوتے ہوئے اسٹیشن سے یہاں تک کرائے کے یکے میں آنا پڑا۔ جبکہ زنانہ سواری بھی ہمراہ تھی۔ تف ہے تم لوگوں کے تعصب اور سطحی خیالات پر۔۔۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ اتنے گرے ہوئے اور پنچ ذہنیت کے بچے ہو تو بیٹھے بیٹھے

تم سب کی کھال کھنچوا لیتا۔ زبانیں راکھ لگوا کر کھنچوا لیتا۔۔۔ یہاں اسٹیشن پر اترے ہیں تو دور دور تک گھر کے کسی فرد کا پتہ نہ تھا۔ گھر پہنچے تو۔۔۔ معلوم ہوا کہ سب خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔۔۔ گویا ہمارا یہاں آنا نہ آنا سب کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

الیاس اور عباس کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ صورتوں پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ پریشانی سے برا حال تھا۔

یوں تو ابا میاں کی عادت میں غصے کی آمیزش کچھ زیادہ ہی تھی۔ ان کے جلالی مزاج سے چھوٹا بڑا ہر کوئی گھبراتا تھا۔ مگر آج کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ غیظ و غضب سے منہ سے کف جاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

اس غضبناک کیفیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ دوسرے نکاح کے بعد دل و دماغ کے کسی خفیہ گوشے میں کوئی نہ معلوم سا احساس انہیں بار بار یہ سمجھا رہا تھا کہ درحقیقت اس اقدام سے ان کی اولاد ناخوش ہو گی۔ چنانچہ اس سوچ کی روشنی میں انہیں ہر بات الٹی دکھلائی دیتی رہتی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ تازہ واقعہ وقوع پذیر ہو گیا تھا۔

وہ ابھی تک خشمگیں نگاہوں سے بیٹوں کو گھور رہے تھے۔

الیاس تو کبھی ان کے سامنے بول ہی نہیں سکتے تھے۔ عباس نے قدرے جرأت و ہمت سے کام لیا اور بہت سنجیدگی سے بولے۔ "جی۔۔۔ ہاں۔ ایسا کبھی ہوا تو نہیں کہ آپ نے آنے کی اطلاع دی ہو اور یہاں سے اسٹیشن سواری نہ بھجوائی گئی ہو۔ آپ کی بدگمانی اپنی جگہ درست ہے لیکن ... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع کس کے ذریعے بھجوائی تھی؟ وہ کون ہے؟"

ابا میاں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر حقے کی نے دوبارہ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے تمسخر اڑانے والے انداز میں بولے۔ "جناب! ہم نے اس ڈاکئے کے ذریعے یہ خبر بھجوائی تھی جو ہر ہفتے سہارن پور سے اس طرف کے دیہاتوں میں ڈاک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقسیم کرنے نکلا ہے۔ اب بہانہ تلاش کیجئے آپ!"

الیاس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لے کر پہلو بدلا۔ عباس کے چہرے پر بھی سرخی سی چھا گئی۔ باپ کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پرجوش لہجے میں اطمینان سے کہنے لگے۔ "بس تو پھر آپ کی بدگمانی فضول ہے۔ کیونکہ آپ گاؤں میں کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ اس ہفتے یہاں کی ڈاک ہی وصول نہیں ہوئی۔ آج کل وہ ڈاکیہ موضوع سخن ہے۔ ممکن ہے اچانک بیمار پڑ گیا ہو بے چارہ ورنہ وہ تو مدت سے ڈاک لاتا ہے۔"

اس تازہ اطلاع پر ابا میاں نے گھور کر عباس کو دیکھا مگر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا شاید دل ہی دل میں اعتبار آ گیا تھا۔

مزید کچھ بولنے کو تھے لیکن اسد اللہ کو دیکھ کر خاموش رہ گئے جو حقہ ایک ہاتھ میں پکڑے کھنکارتے ہوئے آ گئے تھے۔

ان کے بعد ایک ایک کر کے عزیز و اقارب آ بیٹھے۔

ان سب کی موجودگی میں خلاف معمول ابا میاں آج خاصے خوش خوش لگ رہے تھے اور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے۔

آنے والوں کے سلام کے جواب کے سوا نہ حسب معمول مزاج پرسی کر رہے تھے نہ گندم کی فصل کا حال چال پوچھ رہے تھے۔ ورنہ ہمیشہ گاؤں آ کر ہر عزیز سے فرداً فرداً اسی نوعیت کی باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔

حقہ گڑگڑاتے ہوئے اچانک اسد اللہ بولے۔ "عبدالرحمن! سنا ہے تم نے وہاں شہر میں نکاح کر لیا ہے۔"

سب کے چہروں پر دبی دبی سی دلچسپی کے آثار دوڑ گئے۔ سب ہمہ تن گوش ہو بیٹھے لیکن ابا میاں نہ [illegible] اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "تم

نے شاید صرف نکاح کا سنا ہے اور ہم اپنی منکوحہ سمیت آج گاؤں پہنچ چکے ہیں۔ یہ نہیں سنا تم نے؟"

اس کڑوے کسیلے جواب پر اسد اللہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

گفتگو ویسے نازک موڑ پر آ پہنچی تھی کہ عباس نے بڑوں کی اس محفل سے اٹھ جانا چاہا۔ الیاس نے بھی ان کی تقلید کی مگر ابا میاں کی بارعب آواز نے ان کے قدم تھام لئے۔

"بیٹھ جاؤ میاں، کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟"

چار و ناچار دونوں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر مکمل خاموشی طاری رہی۔

سب لوگ اپنے اپنے ذہن سے سوچ رہے تھے کہ ابا میاں کیا کہنے والے ہیں۔ انہوں نے شرفو کو پکار کر حکم دیا۔ "دیکھو! گل کہیں ہو تو اسے بھی بلا لاؤ۔"

گل اسی وقت شام کی سیر سے لوٹے تھے۔ سفید مہین لان کے کرتے اور پاجامے میں بہت جامہ زیب اور کھلے کھلے سے لگ رہے تھے۔ اس اچانک بلاوے پر وہ حیران و پریشان بڑے بھائیوں کے پاس آ بیٹھے۔

ابا میاں نے عادت کے مطابق دو چار لمبے لمبے کش لگانے کے بعد حقے کی نے ایک طرف کر دی پھر بلا تمہید اور کسی کو مخاطب کئے بغیر سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"میں خوب اچھی طرح اس امر سے آگاہ ہوں کہ آج کل میری اولاد سمیت میرے عزیز و اقارب کس طرح کی باتیں کرتے اور سوچتے رہتے ہیں اور میں اس حقیقت سے بھی نابلد نہیں کہ اس عمر میں بلا شبہ ہر کسی کو میرے اچانک نکاح کر لینے پر اچنبھا ہوا ہوگا۔ لیکن اس وقت میرے بچوں سمیت اتفاق سے آپ سب بھی موجود ہیں اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ ذرا وضاحت سے معاملہ سب کے گوش [illegible] ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ دوسرا نکاح کوئی عیب نہیں۔ اس میں نہ عمر کی قید ہے نہ وقت کی، قانون اور شرع کے لحاظ سے خدا جس کو فراغت دے اور اس نعمت سے نوازے کہ وہ ہر دو کے اخراجات بے فکری سے ادا کر سکے، حقوق پورے کر سکے، وہ دوسرا نکاح کر سکتا ہے۔ اور میں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بہت عرصے بعد یہ اقدام کیا ہے اور ظاہر ہے خلاف شرع نہیں کیا، لیکن --- چونکہ ہم پسماندگی کا شکار ہیں اور چھوٹے دل و دماغ سے سوچنے کے عادی ہیں اس لئے حقیقت پسند بھی نہیں ہیں۔"

ان کے آخری جملے سب کو ناگوار گزرے اور سب میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اسد اللہ سے ضبط نہ ہو سکا تو برا مان کر ٹوک بیٹھے۔

"عبدالرحمن! تمہارے اندر یہ بہت بڑی خامی ہے کہ تم اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ و ارفع خیال کرتے ہو۔ خود سوچو! اس وقت پسماندگی کا طعنہ کیوں دیا تم نے؟ کونسی جہالت دیکھی تم نے ہم لوگوں میں؟"

ابا میاں نے چڑے بغیر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کسی کے کردار پر بلاوجہ نکتہ چینی کرنا اور جبکہ اس کے خلاف کوئی جرم بھی سرزد نہ ہوا ہو، پسماندگی اور جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کم از کم اپنے مذہب اسلام سے اس حد تک تو ہر کسی کو ضرور ہونی چاہئے کہ اسلام، صاحب حیثیت افراد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے یہاں میرے اپنے رشتے داروں میں میرے خلاف جیسی جیسی باتیں اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں میرے کانوں سے سب گزر چکی ہیں۔"

وہاں موجود سارے افراد کو چپ سی لگ گئی۔ جو کچھ ابا میاں کہہ رہے تھے اس میں ایک بات بھی غلط نہ تھی۔

ابا میاں کے پھوپھی زاد اور ہم عمر بھائی یعقوب نے تیکھے انداز میں کہا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سب کچھ ہم سمجھ رہے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس حد تک

مذہب سے ہم بھی آگاہ ہیں کہ مرد کو ایک چھوڑ چار شادیوں کی اجازت ہے۔ ہم تمہارے نکاح پر نکتہ چینیاں ضرور کرتے رہے ہیں لیکن کیا تم اس بات کی وضاحت کرو گے کہ تم نے اپنے گاؤں اور برادری سے باہر یہ شادی کیوں رچائی؟ کیا کنبے میں تم کو کوئی رانڈ بیوہ نظر نہ آئی تھی پچاس کوس دور لکھنؤ میں جا کر شادی رچائی! کیا ہمارے لئے یہ قابل غور بات نہیں ہے!"

الیاس اور عباس نے پاس ادب کے خیال سے اس محفل سے اٹھ جانا چاہا۔ کیونکہ اب ان کے باپ پر بار بار تنقید ہو رہی تھی اور ان دونوں کو لحاظ آ رہا تھا۔ مگر اس دفعہ ابا میاں نے اٹھتے دیکھ کر زور سے ڈانٹ دیا۔

"کیا پریشانی ہے تم لوگوں کو! بیٹھے رہو اسی جگہ پر، آج تمہارے سامنے پچھلے تین ماہ سے ہونے والی تنقید اور نکتہ چینی کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم تینوں بھائی بھی کان کھول کر سن لو اور آئندہ کے لئے دلوں میں کسی بدگمانی اور شک و شبہ کا بیج پرورش نہ پا سکے۔

اتنا کہہ کر وہ تھم گئے۔ اس وقت ان کا صحت مند چہرہ غصے کی شدت سے تپ کر سرخ ہو رہا تھا۔ خدوخال میں ایک بارعب سا جاہ و جلال ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ان پر یہ کیفیت بہت کم طاری ہوتی تھی۔

چند لمحے رک کر انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"جیسا کہ میں آغاز میں آپ حضرات سے کہہ چکا ہوں کہ بلاشبہ میں نے نکاح ثانی کیا ہے۔ خلاف شرع کوئی جرم نہیں کیا۔ چنانچہ جب میں خدا کا مجرم نہیں تو کسی بندے کی کیا مجال ہے کہ میرے اقدام کو قابل سزا قرار دے سکے۔

دوسری بات یہ کہ میں نے کنبے برادری سے باہر نکل کر کیوں نکاح کیا۔ اس سلسلے میں یہاں جو جو باتیں ہوئی ہیں وہاں سہارن پور میں برابر مجھ تک پہنچتی رہی ہیں۔ لیکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں یہاں آنے کے لئے گرمی کی تعطیلات کا انتظار کر رہا تھا آم کا موسم یہاں گزارنے ایک بہانہ ہے۔ ورنہ میں صرف اپنے نکتہ چیں عزیزوں کی خدمت میں ان کی چہ میگوئیوں کا جواب دینے ہی حاضر ہوا ہوں۔ میں آج --- اپنی اولاد سمیت --- سب کے روبرو صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کنبے برادری کا قائل نہیں۔ میری نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ ہر کسی کو مولا نے ایک مٹی سے تخلیق کیا ہے۔ کوئی بڑا نہیں کوئی چھوٹا نہیں۔ آپ کی نہیں، میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ میرے خیالات محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ میں نے عملی طور پر ایسا کر دکھایا ہے اور اللہ کا شکر ہے، احسان ہے کہ مجھے کوئی ندامت بھی نہیں، پچھتاوا بھی نہیں۔ بلکہ خوشی ہے کہ میں کسی بے سہارا خاتون کا آسرا بن گیا ہوں۔ تین یتیم بچوں کا سر کا سایہ بن چکا ہوں۔ یہ صرف ہماری غلط سوچوں کا تحفہ ہے کہ ہم کنبے برادری کا چکر نکال کر بیٹھ جاتے ہیں ورنہ خدا نے تو آسمانوں سے ہمیں الگ الگ کنبے اور ذاتوں میں تقسیم کر کے نہیں تخلیق کیا اور اس دنیا میں محض تعصب اور فساد برپا کرنے کے لئے بھیج دیا -- لہٰذا میں نے ان تمام خرافات سے علیحدہ ہو کر یہ فیصلہ کیا اور بصد احترام و بخوشی آج سے تین ماہ قبل نائمہ بیگم کو اپنے عقد میں لے آیا۔ یہاں میں اپنے بڑے بچوں کو یہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس خوف میں مبتلا نہ ہوں کہ زمین جائداد یا مال اسباب میں ان کی حق تلفی ہو گی یا خدا نخواستہ کل کو بٹوارے ہوں گے --- نہیں! سب کو تسلی رکھنی چاہئے۔ حوصلے بلند اور نظر وسیع رکھنی چاہئے۔ انشاءاللہ کبھی ایسا نہ ہو گا --- میں نے جو کچھ کیا ہے، اپنے تئیں اور سوچ سمجھ کر بہتر کیا ہے۔ یوں بھی میں ذاتی طور پر خود مختار اور اپنی مرضی کا مالک ہوں اور کسی کو قطعی حق نہیں پہنچتا کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہو۔ یوں نکتہ چینیاں کرنا، بات سے بات نکالنا یا فضول بازی کرنا بھی ہر کسی کا ذاتی فعل ہے۔ جو مجھ کہنا تھا، میں نے کہہ دیا۔ کسی کی باتوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔

ایک آخری بات --- جو میں ہر کسی سے کہنا چاہتا ہوں، یہ بات میں اپنی صفائی میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اسی لمحہ کی ایک کڑی ہے، اسی لئے بتا رہا ہوں اور وہ یہ کہ اتنے برسوں کے بعد کہ جب ماشاءاللہ میری اولاد بھی جوان ہو گئی ہے اور مجھے ان کی پرورش و دیکھ بھال کی بھی کوئی پریشانی نہیں ہے تو میں نے نکاح ثانی کیوں کیا؟

اس بات کا جواب میں اس لئے بھی ضرور دینا چاہ رہا ہوں کہ میرے سابقہ کئی سسرالی عزیزوں نے اس بات کو خاصی شہرت دی ہے کہ خدا جنت الفردوس عطا فرمائے جب ان بچوں کی والدہ کا انتقال ہوا تو گل فقط چھ ماہ کا تھا -- چنانچہ مجھے نکاح ثانی اس وقت کرنا چاہئے تھے تاکہ بچے کو دوسری ماں کی گود نصیب ہو سکتی، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ خدا میری ہمشیرہ کو نیکی دے گل کو انہوں نے ماں کی کمی کا احساس ہی نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ کلیجے سے لگائے رکھا اس لئے کبھی مجھے پورے طور پر آگاہی نہ ہو سکی کہ بچوں کے لئے دوسری ماں کا وجود ضروری ہے۔

دوسرا اہم سبب یہ کہ جیسا آپ سبھی کو معلوم ہے کہ میں اپنی ملازمت کی وجہ سے زیادہ تر سہارن پور میں رہا اس لئے بچوں کے سارے مسئلے مسائل یہیں والے حل کرتے رہے۔ اس طرح میں بے فکر رہا۔

اور اب --- کچھ بات ایسی بنی کہ چند دوست احباب کی وساطت سے میرا موجودہ رشتہ طے ہو گیا۔ میں اپنے باورچی خانے کے ہاتھوں الٹے سیدھے کھانے کھاتے کھاتے تنگ آ گیا تھا۔ مگر بحالت مجبوری سب جائز تھا۔ کیونکہ مرحومہ بیوی نے تو اپنی پرانی اقدار و آباؤ اجداد کا گاؤں کبھی عارضی طور پر چھوڑنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ کبھی رشتے داروں نے حوصلہ افزائی کی تھی۔ خیر --- یہ سب تو گئی گزری باتیں ہو گئیں --- کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نکاح کی بات چلی تو میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اب خدائے ذوالجلال کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ میں ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنی ساری زندگی میں کبھی اس درجہ آرام اور آسائش نصیب نہیں ہوئی جیسی اب ہے۔

بس مجھ کو اسی قدر کہنا تھا۔ آپ سب کا شکریہ، کہ سب نے میری باتیں توجہ اور خاموشی سے سنیں مجھے اجازت دیجئے۔"

اتنا کہہ کر ابا میاں تخت سے نیچے اترے۔ پیروں میں جوتے پہنے اور باوقار انداز میں چلتے ہوئے اندر چلے گئے۔ یہاں سب گم صم بیٹھے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہ گئے۔

بنیادی طور سے ابا میاں کا تعلق زمیندار طبقے سے تھا۔ اور ان کی ذاتی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی واحد نرینہ اولاد تھے۔ ویسے کو تو قدرت نے چودہ بچے دیے تھے مگر والدین کی قسمت کہ صرف دو زندہ سلامت رہے تھے۔ ابا میاں بڑے تھے اور فاطمہ ان سے کئی برس چھوٹی جنہیں ابا میاں کے بچوں نے --- "پھوپھی جان-- پھوپھی جان---" کہہ کر پورے گاؤں کی پھوپھی جان بنا ڈالا تھا۔

یہ ایک وسیع و عریض گاؤں تھا۔ یہاں سب ایک ہی کنبے کے افراد رہتے تھے۔ اس طرح سے جوں جوں بچے جوان ہوتے جاتے ان کے شادی بیاہ آپس ہی میں رچائے جاتے اور یوں گھرانوں میں گھرانے پھیلتے جاتے۔ انسان بڑھتے جاتے اور آتے جاتے موسم دیکھتے کہ ایک پود کی جگہ دوسری پود لے رہی ہے۔

ابا میاں کی اکلوتی بہن فاطمہ کے ساتھ بھی قدرت نے عجب بے انصافی کی تھی۔ ایسی کہ دور و نزدیک کوئی مثال ملنی مشکل تھی۔

دیہات کے پرانے رسم و رواج کے مطابق وہ گاؤں میں ہی اپنے سگے تایازاد سے منسوب تھی اور کچھ یوں کہ بچپن کا نکاح تھا۔ جو بڑے بھائی کی شادی کے موقع پر پڑھوا دیا گیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب فاطمہ سیانی ہوگئی تو تائی، تایا، تائی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھوائے رخصتی کی تاریخ مانگنے آئے۔ کچھ بزرگ اکٹھے ہو بیٹھے اور یوں بصد خوشی رخصتی کی تاریخ طے پاگئی۔

دونوں طرف اپنی اپنی حیثیت کے مطابق زور و شور سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دونوں طرف کئی روز پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی۔ لڑکیاں بالیاں ادھر بھی گانے آجاتیں اور ادھر بھی جاتیں۔ رات رات گئے تک ہنسی مذاق کا سلسلہ چلتا۔ ایک دوسری سے چھیڑ چھاڑ اور بلند بانگ قہقہوں میں پوری پوری رات بیت جاتی۔ شادی کیا تھی، پورے گاؤں میں رونق اور گہما گہمی کا عالم طاری تھا۔

رخصتی کی شبھ گھڑی میں ایک دن باقی تھا۔ اگلے دن ابا میاں کی دہلیز پر باراتی آنے کو تھے--- وہ فاطمہ کے کنوارپن کی آخری رات ہوتی--- اگر سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو پاتا۔

رات کا وقت تھا۔ دیہات کے جفاکش اور محنتی لوگ۔ دولہا بھی دل میں ہزار ارمان اور مسرتوں کی پھلجھڑیاں سمیٹے اگلے دن کے مبارک سورج کا منتظر تھا۔ مگر ان تمام خوشیوں کے ساتھ ساتھ اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں اور کاموں سے جی نہ چرایا تھا۔

اس رات اتفاق سے دولہا والوں کا پانی کا وارہ تھا۔ وہ حسب معمول رات کو باریوں کے کام کا جائزہ لینے نکلا۔ اور تب--- وہ تاروں بھری رات--- منحوس اور زہریلی رات بن گئی۔ پل بھر میں معصوم اور الہڑ فاطمہ کی مانگ اجڑ گئی اور پورے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔

جس پانی کے نالے سے کھیتوں کو باری کا پانی دیا جا رہا تھا، دولہا وہیں کھڑا کدال چلاتے باری سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا اور چاروں طرف کا جائزہ بھی لے رہا تھا، کہ جانے کب اور کیسے--- کسی جھاڑی کی اوٹ سے رینگتے ہوئے سانپ نے اس کے ٹخنے پر کاٹ لیا۔

سانپ اتنا زہریلا اور ظالم تھا کہ اس نے پوری طرح سورج بھی نہ ابھرنے دیا اور صبح صادق کے وقت فاطمہ کے دولہا نے باپ کے زانو پر سر رکھے رکھے عالم غنودگی میں دم توڑ دیا۔

چاروں اطراف اک کہرام مچ گیا اس کے جوان لاشے پر بہنیں اور ماں باپ پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ نالہ و شیون کی آوازوں سے گاؤں کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا۔ وہ مہمان جو دور دور سے شادی کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے شام ہونے سے پہلے پہلے اس کے جنازے میں شریک ہوئے۔ اس کی موت کی خبر کہیں بھی پہنچانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی تھی۔ سب پہلے ہی سے جمع ہو گئے تھے۔ مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی دولہاؤں کی باراتیں اس صورت--- اور اس المناک انداز میں بھی سجائی پڑتی ہیں۔ سہرے کے پھول، قبر کے مغموم ہاروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ایک رات قبل دیہاتی رسموں کے مطابق جو اس کے ہاتھوں میں مہندی رچائی گئی تھی اس کی تر و تازہ مہک، لحد کی تاریکیوں میں جا بسی۔

اور یوں--- فاطمہ سہاگن ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی۔ اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہوگئی۔ سیاہ بالوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں چاندی کے تار جھلملا اٹھے، مگر اس نے کسی سے گلہ نہ کیا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ہی تہجد گزار ہوگئی۔ گھر کے ماحول میں نماز، روزے اور عبادت کی خوشبو آنکھ کھول کر رہی تھی۔ سو اسی میں مدغم ہوتی چلی گئی۔ سسرال میں نہ کوئی جیٹھ تھا نہ دیور، جس کے لئے سسرال والے دوبارہ رجوع ہوتے، اس طرح وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ عبادت سے جو وقت فرصت کا ملتا وہ بڑے بھائی کے بچوں کی دیکھ بھال اور چاؤ چونچلوں میں گزر جاتا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا فاطمہ نے کبھی عبادت سے "تو" "تک نہ کی۔ بلکہ جب ابا میاں کی بیوی کا انتقال ہوگیا تو اس نے عباس، الیاس اور گل کی پرورش اتنی محبت اور حقیق

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انداز میں کی کہ ہر کوئی عش عش کر اٹھا۔ اس وقت گل کی عمر نو کل چھ ماہ تھی، رات کو جاگ کر اسے بہلانا، دودھ تیار کر کے دینا اور اس ننھے بچے کی خدمت فاطمہ کا نصب العین بن گیا۔ وقت اس طرح بیتا کہ احساس تک نہ ہوا۔

یوں تو فاطمہ کو الیاس اور عباس سے بھی بہت محبت تھی۔ مگر گل تو اس کی جان بن کر رہ گیا تھا۔ نام تو اس کا کچھ اور ہی تھا مگر فاطمہ نے پیار ہی پیار میں جو "گل" کہا تو بس چہار جانب "گل" کا ہی ڈنکا بجنے لگا۔ اور یوں اس کا صحیح نام کسی کو بھی یاد نہ رہا۔

یہ تینوں بچے پھوپھی کو عزیز از جان رکھتے تھے۔ پھوپھی کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی ان تینوں کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ان بچوں کو فاطمہ سے، محبت سے زیادہ عقیدت اور عقیدت سے زیادہ محبت تھی۔ لوگ جگ پھوپھی بھتیجوں کی محبت اور خلوص پر رشک کرتے۔

وقت کا پنچھی اپنے پنجوں میں لمحوں کی ڈور تھامے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ بچے جوان ہوتے گئے۔

معمول سے وقفے کے ساتھ ابا میاں اور فاطمہ کے والدین راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ فاطمہ نے بڑے بھتیجوں عباس اور الیاس کی شادیاں اپنی پسند اور سمجھ کے مطابق اپنے کنبے میں ہی کر لیں۔ دونوں بہوئیں اسی گاؤں میں ان کے اپنے نزدیکی رشتے دار بھی ہیں۔

الیاس اور عباس ابا میاں سمیت، کسی نے فاطمہ کی مخالفت کی نہ حجت۔ انتہائی خوش اسلوبی اور راضی بہ رضا یہ شادیاں انجام پائیں۔ چند سالوں میں کئی پیارے پیارے بچوں کا اضافہ ہوا اور یوں ابا میاں کے صحنِ گلشن میں رونق اور گہما گہمی اتر آئی چہل پہل اور شور و غوغا ہونے لگا۔

گل کی منگنی بھی فاطمہ نے اپنی حسبِ پسند کرلی تھی۔ گل کی منگیتر اسی گاؤں میں

تھی اور رات دن کا آنا جانا تھا۔

ان تمام مدوجزر کے ساتھ ساتھ، ابا میاں وہیں کے وہیں تھے۔ گاؤں میں کئی انقلابات آئے۔ خود ان کی زندگی کئی خوشیوں اور کئی غموں کی زد پر آئی، مگر ان کے ذاتی معاملات میں کچھ فرق نہ آسکا۔ انہوں نے ان بچوں کی ماں اور اپنے والدین کی زندگی ہی میں اپنے لئے کچھ اصول اور قواعد وضع کر لئے تھے اور اسی پر کاربند ہو گئے تھے۔ وہی اپنی ملازمت پر سہارن پور میں رہنا۔ عید تہوار یا گرمی کی تعطیلات میں گاؤں آتے۔ یا کسی شادی بیاہ یا موت زندگی وغیرہ پر ہفتہ عشرہ رہتے اور پھر واپس سہارن پور چلے جاتے۔ دراصل گاؤں کی زندگی اور یہاں کے رہن کو وہ قبول کر ہی نہ سکے تھے۔ گاؤں بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل تھے۔ اور اپنی ذہانت اور قابلیت سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

یہاں زمینوں کی دیکھ بھال، فصلوں کے اتار چڑھاؤ اور آتے جاتے موسموں کے ردوبدل میں سیاہ و سفید کے مالک عباس اور الیاس تھے۔ مگر یہ ابا میاں کی خوش نصیبی ہی تھی کہ ان کی اولاد انتہا سے زیادہ فرمانبردار اور سعادت مند تھی اور وہ پوچھتے یا نہ پوچھتے ہر سال پوری فصلوں کا حساب کتاب اور کھاتے کے کھاتے باپ کے سامنے رکھ دیا کرتے۔

سہارن پور میں ابا میاں جہاں کرائے کی دو منزلہ بلڈنگ میں اکیلے اپنے نوکروں کے ساتھ رہا کرتے تھے عباس اور الیاس کا تو وہاں بہت کم آنا جانا رہتا تھا، بس کبھی کبھار کسی کام سے شہر آتے تو باپ کی خدمت میں بھی سلام کرنے آ گئے مگر گل زیادہ تر انہی کے پاس رہتے تھے۔

تینوں بیٹوں میں یہ باپ سے کافی نزدیک بھی تھے اور ان کے چہیتے بھی۔ ابا میاں کو بھی اس بیٹے سے حد درجہ الفت و محبت تھی۔ شاید سب میں چھوٹے ہونے کی بنا پر وہ ان کے دل سے زیادہ قریب تھا۔ کچھ ابا میاں نے گل کی اس خوبی کو بھی پہچان لیا تھا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ہر عادت اور طور طریقے میں خود انہی کی مثال تھے۔

وہی دیہاتی رسم و رواج اور قاعدوں سے دور بھاگنا۔

طبیعت میں رچی بسی وہی نفاست، آزادی اور صاف گوئی و حق پرستی، جو ابا میاں کے مزاج کا خاصہ تھی، گل کے اندر بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

بعض اوقات تو ابا میاں کو وہ بالکل ہو بہو اپنا عکس معلوم ہوتے، تعلیم سے رغبت اور دلچسپی کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے گل کا ذہنی رجحان تعلیم کی طرف دیکھا تو پوری پوری اس کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ ہر ممکن طریقے سے ان کے اس رجحان اور شوق کو مزید تقویت اور چمک بہم پہنچائی۔ گاؤں سے اپنے پاس لا کر رکھا۔ ان کی ضروریات اور ذمہ داری صحیح معنوں میں ایک باپ کی حیثیت سے بہت عمدہ اور احسن طریقے سے سرانجام پہنچاتے رہے ابتدائی جماعتوں سے ہی ٹیوٹر مہیا کیے اور بیٹے کی ذہانت اور قابلیت کو جلا بخشی۔

اور پھر وہی ہونہار اور لائق فائق گل تھے جو سہارن پور کے بہترین لاء کالج میں وکالت پڑھ رہے تھے، یہ ان کا پہلا سال تھا وکالت کا۔

تعلیم میں پوری طرح مستغرق و منہمک ہو جانے کی غرض سے ابا میاں نے انہیں کالج کے ہوسٹل میں داخل کروا دیا تھا تاکہ کسی صورت بھی ان کی دل شکنی اور نہ تعلیمی حرج ہو سکے۔

تین ماہ قبل جب ایک دوست کی وساطت سے ابا میاں کا نائمہ بیگم سے رشتہ طے ہوا، گل ہر کام میں پیش پیش تھے، انہوں نے ہر طرح سے باپ کا ساتھ دیا۔ اپنے ایک کلاس فیلوں کی بہنوں کے ذریعے زنانہ چیزوں، لباسوں اور نکاح کے سامان وغیرہ کی خریداری کی اور خود بھاگ دوڑ کر کے زیورات بنوائے، نکاح میں بھی وہ برابر کے شریک رہے۔ اور بیٹے کے بجائے دوست اور مخلص ساتھی کی طرح ہر کام خوش اسلوبی

سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

بعد ازاں گاؤں میں اس نکاح کی اطلاع بھی انہی کی زبانی پہنچی۔ اس خبر سے یہاں جو شور و غلغلہ اٹھا جیسی جیسی چہ میگوئیاں اور بے بات کی افواہیں اڑائیں اس سے قطع نظر گل نے ذاتی طور پر اپنی زبان سے نہ بڑھا چڑھا کر یہ معاملہ پیش کیا اور نہ اچھائی برائی منوائی۔ نہ ہی انہوں نے باپ کے اس نکاح کی مخالفت کی تھی۔ مخالفت تو عباس اور الیاس نے بھی نہیں کی تھی مگر چند ایک بار اپنی بیویوں کے اکسانے پر احتجاج ضرور کیا تھا، جو بعد کو ابا میاں نے حکمت عملی اور اپنی فطری بے باکی سے کام لے کر خود ہی دبا دیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں اپنے اوام کی وضاحت کر دی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں سب کی زبان بند کر دی تھی۔

شام کا وقت تھا۔

ہلکی ہلکی مدھ بھری ہوا چل رہی تھی۔

لیموں کے پیڑ میں بہت ساری چڑیاں ایک ساتھ چہچہا رہی تھیں۔

مہندی کے پودوں میں سے دھیمی دھیمی دلنواز مہک چاروں طرف پھیلنے لگی۔

نائمہ بیگم آنگن میں تخت پر اطمینان سے بیٹھی پان چبا رہی تھیں۔ پشت نرم نرم روئی کے تکیوں سے ٹکا رکھی تھی۔ سامنے یہ بڑا سا قلعی دار سہارن پوری پاندان کھلا رکھا تھا۔ تھالی ہرے ہرے تازہ پانوں سے بھری تھی۔ ان کی بڑی بیٹی مشکبار دوسرے پلنگ پر دونوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ چھوٹا والا تکیے پر سر رکھے بے خبر لیٹا سو رہا تھا۔

دوسرے تخت پر فاطمہ پھوپھو جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

نائمہ بیگم کے سامنے صحن سے قدرے اونچے چبوترے پر دو چولہے ساتھ ساتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنے تھے۔ چکنی مٹی سے لیپے پتے چولہے چھوٹی سی دیوار، برتن اور باورچی خانے کا سامان رکھنے کے طاق سب کے سب آئینے کی طرح چمک رہے تھے۔ چولہوں میں بڑی بڑی لکڑیاں جل رہی تھیں۔

ایک چولہے پر سکینہ بھابی مرغی کا گوشت پکانے کی تیاری کر رہی تھیں اور دوسرے پر رئیسہ جلدی جلدی چاول بگھار رہی تھی۔ قریب ہی بڑی سی لگن میں آٹا گندھا رکھا تھا۔

گاؤں میں ابا میاں کے قیام کے دوران یوں تو ہمیشہ سے کھانے وغیرہ میں خاص اہتمام برتا جانے لگتا تھا۔ ہر شام ایک دو مرغے ضرور ہی ذبح ہوتے اور پھر گل کے شکار کئے ہوئے بٹیر، تیتر اور مرغابیاں الگ بھنتیں، کیونکہ ابا میاں کی صورت دیکھتے ہی گل اپنی شکاری بندوق لے کر کھیتوں، باغوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں انہیں ابا میاں کی پسند ناپسند کا بہت خیال رہتا تھا۔

مگر جب سے ابا میاں کے ساتھ نائمہ بیگم بھی تشریف لائی تھیں گھر کی دونوں بہوئیں بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ گل کی زبانی ان کی نفاست اور سلیقہ مندی کے قصے سن سن کر دل ہی دل میں مرعوب ہو گئی تھیں۔

اس وقت بھی سکینہ بھابی نے اپنے حسابوں بے حد نفاست اور ستھراپے سے گوشت کو خوب اچھی طرح دھویا۔ اور چولہے پر چڑھی دیگچی میں تڑتڑاتے ہوئے گھی کے اندر خوب بہت سی کٹی ہوئی پیاز جھم سے ڈال دی۔

نائمہ بیگم یہ سب منظر بغور بیٹھی ہوئی مشاہدہ کر رہی تھیں۔

جیسے ہی سکینہ بھابی نے چاہا کہ گوشت بھی اس پیاز میں ڈال دیں، غرارہ سنبھالتی ہوئی نائمہ بیگم چیل کی طرح جھپٹا مار کر ان کے سر پر جا پہنچیں اور زور سے ڈانٹا۔

"ہائیں... ہائیں ... یہ کیا کرتی ہو؟"

سکینہ بھابی کے ہاتھوں میں کفگیر لرزنے لگی اور وہ گھبرا کر ان کی صورت تکنے لگیں۔ چاول بگھارتی رئیسہ بھی حیران و پریشان ہو کر ادھر متوجہ ہو گئی۔

نائمہ بیگم کسی کی پرواہ کئے بغیر رعب دار لہجے میں بولیں۔ "یہ مرغی بگھارنے کا کیا طریقہ ہے؟ نہ پیاز گلابی کی نہ گرم مصالحہ ڈالا اور بوٹیاں ہنڈیاں میں ڈالنے چلی تھیں؟"

"ہم تو سدا اسی طرح پکاتے ہیں۔" سکینہ بھابی جواب قدرے سنبھل چکی تھیں، سادگی سے بولیں۔

"اسی لئے تو تمہارے ہاں سالن میں لذت نہیں ہے۔ جب تک بوٹیوں کی بساندھ نہ جائے گی، کھانے میں خاک لطف آئے گا!"

یہ کہتے کہتے انہوں نے دیگچی ٹیڑھی کر کے پیاز چمچ سے نکال لی اور گھی کڑکڑا کر اس میں کھڑا گرم مصالحہ ڈال دیا اور سارا گوشت دھیمی سی آنچ پر تل کر ایک صاف برتن میں دوبارہ نکال لیا اور باقی بچے ہوئے گرم گھی میں مہین پسے ہوئے تمام مصالحے ڈال کر بھوننے لگیں۔

سکینہ بھابی بے چاری خجل سی ہو کر ایک طرف جا بیٹھی تھیں۔

تخت پر بیٹھی بیٹھی دیکھ تو فاطمہ پھوپھو سب کچھ رہی تھیں، مگر اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں بولیں۔

رئیسہ بھی چپ چاپ گردن جھکائے چاول پکاتی رہی۔

اس روز کے بعد سے کھانا پکانے کی ذمہ داری خود بخود نائمہ نے اپنے سر لے لی۔ ادھر شام ہوئی اور وہ پان کلے میں دبائے۔ غرارہ سنبھالتی چولہے کے پاس پہنچیں۔

ان دنوں گل کی ذمہ داریوں میں ایک دم ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ خوشی خوشی ہر کام سرانجام دیتے۔ ان کا ایک پیر اندر تو دوسرا باہر، ابھی مچھلی کے شکار پر گئے ہیں تو شام کو پرندوں کا شکار ہو رہا ہے۔ باغوں سے آم اور جامن کے تازہ جھوے تڑوا تڑوا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نرلا رہے ہیں۔ گاؤں سے شہر تک کے پھیرے تو ہر دن بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہوتے۔ ہر روز تازہ بہ تازہ پان اور نائرہ بیگم کی فرمائشی چیزیں لانی ضروری ہوتیں کہ یہ نہ صرف نائرہ بیگم کی فرمائش ہوتی بلکہ ان پھیروں میں ابا میاں کا حکم بھی شامل ہوتا ہے۔ مگر گل میاں کی پیشانی پر معمولی ترین بل تک نہ آتا۔ انتہائی خندہ پیشانی سے سب کام کرتے۔ گرمی کی شدت تک کا احساس جاتا رہتا۔

ادھر سکینہ بھابی اور رئیسہ چولہے چوکے سے تو بخوشی دستبردار ہو گئی تھیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کی جان دوسری نوعیت کے عذاب میں آ گئی تھی۔

ہر طرح کے اپنے دل پسند کھانے تیار کرنے، پکانے اور چکھ رکھنے کی ذمہ داری تو واقعی از خود نائرہ بیگم نے اپنے سر لے لی تھی، مگر ان دونوں کے ساتھ سلوک وہی شروع ہو گیا تھا جو بقول گل سہارن پور میں وہ اپنی بہن مشکبار سے کرتی تھیں۔ یعنی وہی اوپر کا سارا کام ان دونوں سے لینا اور پکانا ریندھنا خود۔

نت نئے مصالحے پیستے پیستے اور ہر کھانے کی علیحدہ تیاری کرتے کرتے سکینہ بھابی اور رئیسہ کا ناک میں دم آ جاتا مگر ابا میاں کے ڈر سے ایک لفظ بول سکتیں۔ نہ نائرہ بیگم کو جواب دے سکتی تھیں۔

باقی رہیں خود نائرہ بیگم --- تو انہیں بھلا کسی کے بگڑنے یا بسورنے کی پرواہی کب تھی! وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ وہ فطری طور پر حاکمانہ مزاج لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ اپنی من مانی کرنا اور حکم منوانا ان کی سرشت میں شامل تھا، اس کو کیا کہا جائے کہ ان کی فطرت ہی اس نوعیت کی تھی!

حقیقت یہی ہے، نائرہ بیگم اپنے فطری رجحان کے ہاتھوں بے بس تھیں۔ اچھا کھانے کے شوقین تو بہت ہوتے ہیں مگر اچھے سے اچھا پکا کر پیش کرنے کے شوقین قدرے کم ہی ہوتے ہیں بس یہی عادت نائرہ بیگم کی تھی۔ وہ کھانے میں کسی طرح کی

کمی اور گڑبڑ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے پکاتیں اور ہر کسی سے داد وصول کرتیں۔

اس عادت کے علاوہ بھی ان میں کئی ایک عادات ایسی تھیں جو یہاں دیہات کے ماحول میں رہنے والوں کے لئے باعث حیرت بن جاتیں۔ مگر نائرہ بیگم کبھی کسی کی حیرت اور فکر مندی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ وہی چوبیس گھنٹے سولہ سنگھار کئے رکھنا، ہونٹوں پر مسی اور پان کی دھڑی جمائے رکھنا، اچھے سے اچھے لباس زیب تن کرنا۔ گاؤں کی فضا، ان شہری لوازمات سے پاک ہونے کے باوجود اپنے لئے سازگار سمجھتی تھیں اور ہر روز نت نئی ساریاں باندھنا یہاں بھی ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ بالوں اور کلائیوں میں موتیا کے گجرے مہکتے رہتے۔ جس طرح وہ گھر کی عورتوں سے فری تھیں۔ اسی طرح آنے جانے والے رشتے دار مردوں سے بھی آزادانہ گھل کر ملتیں اور گھنٹوں باتیں کرتیں بلکہ دعوتیں تک کر ڈالتیں۔

گھر اور کنبے کی عورتیں آپس میں کھسر پھسر کرتیں مگر یہ سرگوشیاں نائرہ بیگم قطعی طور پر نظر انداز کر دیتیں۔ کنبے کی چند عورتیں جہاں بھی مل بیٹھتیں، ان کا دل پسند موضوع گفتگو یہی ہوتیں۔ دیہاتوں میں یوں بھی کوئی ایک موضوع دنوں لوگوں کی زد زبان رہتا ہے۔ پھر یہاں تو خاص انہی کے گھر کی بات تھی۔

ہوتا ہوتا ایسا ہوا کہ عورتوں کی کسی محفل میں کسی زیادہ ذہین خاتون یا لڑکی نے نائرہ بیگم کو "لکھنؤ والی" کا خطاب بھی دے ڈالا۔ اور یہ دلچسپ خطاب کچھ ایسا مقبول و ہر دلعزیز ہوا کہ عورتوں نے انہیں "لکھنؤ والی" ہی کہنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے یہ نام عورتوں کے حلقے سے نکل کر مردوں تک پہنچا۔ اور پھر کچھ بزرگوں نے بھی یہ نام پسند کر لیا اور نائرہ بیگم کو "لکھنؤ والی" کہنے لگے۔ یوں یہ خطاب اس کنبے میں خاصا مقبول ہو گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گو کہ یہ نام غیریت کا بھرپور تاثر دیتا تھا مگر جانے کیوں خود نائرہ بیگم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور نہ کبھی برا مانا۔ یوں یہ نام ان کی موجودگی میں بھی کافی آزادانہ طور پر لیا جانے لگا اور پھر چند ہی دنوں میں پرانا بھی ہو گیا۔

دن بھر غضب کی گرمی پڑی تھی۔

مگر شام ہوتے ہوتے موسم میں زبردست تغیر رونما ہوا اور ایسا کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ چرند پرند، پیڑ پودے اور پھل پھلواری بھی نہال ہو ہو گئے۔ ذرا ہی دیر میں گرمی نام کو بھی نہ رہی اور سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ بارش سے بوجھل بوجھل نمناک جھونکے چلنے لگے۔۔

مشرق سے امنڈ امنڈ کر سیاہ گھنگھور گھٹائیں اٹھیں اور سارے آسمان کا احاطہ کر لیا۔ پل کی پل میں آسمان سے زمین تلک رم جھم برستی صاف و شفاف بوندوں کی باراتیں جلترنگ بجاتی اور ناچتی گاتی اترنے لگیں۔ چہار سو برسات کی سبز پری اپنا ہریالہ لباس زیب تن کر کے رقص کرنے لگی اور لوگ مارے خوشی کے گھروں سے نکل کر کھلے میدانوں میں جمع ہونے لگے۔ ننھے بچے تنگ دھڑنگ ہو کر خوشی اور سرمستی کے عالم میں بارش کے پانی میں نہانے کے لئے گلیوں میں آ گئے۔ غرض یہ کہ گہما گہمی اور رونق کا عالم طاری ہو گیا۔ گرمی کی شدت اور تپش مینہ کی بوچھاروں میں ہی دھل گئی اور ہر کسی نے سکون کا سانس لیا۔

گھر کے اندر نائرہ بیگم کی مصروفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے سب سے اول کام یہ کیا کہ بڑی سی کڑھائی چولہے پر رکھوا دی اور خود دھانی دوپٹہ اوڑھ کر پاس آ بیٹھیں اور پھر جو برساتی پکوان کی میٹھی میٹھی خوشبو کڑھائی سے نکل کر ہر طرف پھیلی

بکھری تو مٹی کی سوندھی سوندھی مہک کے ساتھ مل کر ایک عجیب مزہ دینے لگی۔

سب لوگ ان پکوانوں کی سمت کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔ آن کی آن میں ہر کسی کی زبان پر "لکھنؤ والی" کے لذت سے پر پکوانوں کی تعریف و توصیف کے کلمے تھے۔۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی مردانے میں بھی میٹھے پکوان کو پکوریوں، چٹ پٹے چنوں، دہی بڑوں اور ہری مرچوں کے تلے ہوئے پکوڑے خوان بھر کے بھیجے گئے۔ یوں تو برسات کی رت میں سب کا دل پکوان تلنے اور کھانے کو چاہتا ہے شہر ہو یا دیہات۔۔ ہر جگہ یہ اہتمام اپنے اپنے وسائل کے تحت کر ہی لیا جاتا ہے۔ مگر یہ تو خاص نائرہ بیگم کے ہاتھوں تیار کئے ہوئے پکوان تھے۔ بے حد لذت اور شہد آفرینی لئے ہوئے۔

اس روز شام گئے تک یہی تذکرہ چلا۔

برسات کی یہ شام ایک دم ہی حسین تر اور پرلطف ہو گئی تھی۔ نائرہ بیگم کے سگھڑاپے نے اس ہریالی رت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر بڑی بردباری اور متانت کے ساتھ سب سے داد وصول کر رہی تھیں۔

تمام رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی۔

اور پروا کے ٹھنڈے جھونکے ہر ذی روح کو فرحت کا احساس بخشتے رہے۔

صبح دم کوئل کی "کوکو" کے ساتھ آنکھ کھلی۔ مینہ کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر ہلکی ہلکی پھوار اب بھی برس رہی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نائرہ بیگم نے باہر سے گل کو بلوا بھیجا۔ گل حکم کے بندے۔ پل بھر میں اللہ دین کے چراغ کے جن کی مانند آن حاضر ہوئے۔

"گل۔۔!" انہوں نے چھالیہ کترتے ہوئے حکمیہ انداز میں اعلان کیا۔ "آج اور۔۔ اسی وقت اپنے آم اور جامن کے سب سے بڑے باغ میں جھولے ڈلوا دو۔ ساون کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ ہم وہیں کڑھائی بھی چڑھوائیں گے اور جھولا جھولیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گے۔ سارا انتظام دوپہر سے پہلے پہلے کروا دو۔ ہمارے ساتھ اور بھی رشتے دار عورتیں لڑکیاں ہوں گی۔"

"جی!!"

گل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ ان کے فرشتوں کو بھی یقین نہ تھا کہ نائمہ بیگم اس حد تک آزاد اور خود مختارانہ رویہ اختیار کر لیں گی اور وہ بھی ان کے گاؤں جیسے پسماندہ ماحول میں! یہاں کی عورتیں تو یوں کھلے بندوں باغ باغیچوں میں جا کر کھیل کود کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

انہوں نے پریشانی کے عالم میں پہلو بدلا اور ڈرتے ڈرتے ہکلا کر کہنے لگے، "امی جان..... باغ میں جھولا؟"

"اے ولا رے لونڈے!" وہ فوراً تیور بدل کر اور بگڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "میں نے کونسی فارسی بولی جو تمہاری سمجھ میں نہ آئی؟ باغ میں جھولے ڈلوانے کو تو کہا ہے۔ تمہارے ہاں کے جانے کیا اوندھے سیدھے دستور ہیں کہ ساون آ گیا اور کسی کو خبر ہی نہیں ہے۔ لے کیا یہ موسم چپ کا موسم ہے جو ہر کسی کو سانپ سونگھے ہوئے ہے۔ اے ہاں اللہ کڑھائیاں چڑھ رہی ہیں نہ ساون گائے جا رہے ہیں نہ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگ رہی ہیں اب ایسی بھی کیا بے حسی!"

گل چپ چاپ گردن جھکائے ان کی لعن طعن سنتے رہے۔

وہ آج ایسے زور زور سے بول رہی تھیں کہ فاطمہ پھوپھو بھی اٹھ کر قریب آ گئیں۔ رئیسہ اور بھابی سکینہ بھی اپنے اپنے کام ادھورے چھوڑ کر آ کھڑی ہوئیں۔

نائمہ بیگم کے پر جلال لہجے نے سب کو دنگ کر دیا تھا۔

لیکن فاطمہ پھوپھو سے نہ رہا گیا۔ وہ نائمہ بیگم کا یہ نیا مطالبہ اور ساری گفتگو سن چکی تھیں دھیرے سے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور نائمہ بیگم کا ہاتھ تھام کر ملائمت سے کہنے لگیں۔

"گاؤں اور شہر کے طور طریقے میں بڑا فرق ہوتا ہے، گل کی جھجک کی وجہ یہی ہے کہ یہاں کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ باغوں میں جھولے ڈالے جائیں، ہاں تم کو شوق ہے تو بسم اللہ۔ گھر میں یہ بڑی سی چھتنار نیم کھڑی ہے۔ لو میں ابھی کسی مزارع سے کہہ کر جھولا ڈلوائے دیتی ہوں۔ جتنا جی چاہے جھولو۔ ساون مناؤ۔ اور اس کے علاوہ جیسا بھی چاہو انتظام کروا دیا جائے گا---"

نائمہ بیگم جل بھن کر کلا بتو ہو گئیں۔ یہ نئی تجویز سن کر ان کی ایڑی سے لگی تو چوٹی تک پہنچی۔ غصے سے تمتما کر بولیں۔ "نہیں چاہیے مجھے آپ کا کوئی بھی انتظام، گل! اپنے بابا کو اندر بھیجو۔ میں خود ان سے بات کروں گی۔ لو بھلا اندھیر ہو گیا۔ یعنی ہم ساون ہی نہ منائیں۔ بھاڑ میں گئیں یہاں کی ریتیں رسمیں..... ایسی کیا لوٹ پڑی ہے کہ چہار دیواری سے باہر نہ نکلو۔ بابا وان کو میں ذرا پوچھوں کہ یہاں گاؤں میں کیوں لا ڈالا ہے---"

انہوں نے سر و تہ تھالی میں پٹخا اور مارے طیش کے طنطناتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

❁

یہاں سب ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہ گئے۔

نائمہ بیگم کے مزاج کا یہ پہلو آج سب نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

سب میں زیادہ تشویش فاطمہ پھوپھو کو تھی۔ وہ اک ذرا سی بات کہہ کر چور ہو گئی تھیں۔ اور اب پچھتا رہی تھیں کہ ناحق بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دیا۔

مگر ان کا کہنا بھی اپنے مقام پر بہتر تھا۔ وہ اس گھر کی بڑی تھیں۔ اس لئے ہر اچھی بری بات کو نگاہ میں رکھنا ان کا فرض تھا۔ چنانچہ یہی سوچ کر انہوں نے ابا میاں کو اندر بلوا بھیجا۔

تھوڑی دیر بعد ابا میاں کھنکارتے آ پہنچے۔ نائمہ بیگم اب تک اپنے کمرے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محصور تھیں۔ سو موقعہ غنیمت جان کر فاطمہ پھوپھو نے تسبیح ہلاتے ہلاتے سارا قصہ ان کے گوش گزار کر دیا اور آخر میں کہنے لگیں۔

"بھائی میاں! ساری بات آپ کو بتا دینی ضروری تھی اب جو بھی آپ فیصلہ کریں، میں نے تو اپنی طرف سے کچھ ایسی غلط بات کہی نہیں۔"

انہوں نے ایک ثانیہ توقف کیا۔ پھر دائیں ہاتھ سے داڑھی کھجاتے ہوئے بولے۔"بات تو اپنی جگہ بھی ٹھیک ہے فاطمہ! مگر نائمہ بیگم کا دل میلا کرنا بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ان کی ضد بے جا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان ناز برداریوں اور رسموں وغیرہ کی اس حد تک عادی ہیں کہ اگر اس بڑھاپے میں میں چاہوں بھی تو ان پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے چند منٹ سوچتے رہے پھر فیصلہ کن لہجے میں بولے۔"اگر وہ ایسا ہی چاہتی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ ان کے حسب منشا انتظامات کروا دیئے جائیں گے۔ یوں تو پورا گاؤں ہی اپنا ہے، یہاں غیر کون ہے اور بھلا کسی کی کیا مجال ہے کہ ہمارے گھر کی عورتوں کو میلی نظر سے بھی دیکھ سکے۔ تاہم بڑے باغ میں خصوصی انتظام کر دیا جائے گا کہ آج کے دن کوئی مرد حتی کہ چھوٹی عمر کے لڑکے بھی اس طرف جانے نہ پائیں۔ کچھ اپنے گھر کے افراد حفاظتی طور پر باغ کی طرف جانے والے راستے کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ تم بے فکر رہو۔ ہاں ... گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کو ہماری طرف سے باغ میں ساون منانے کی دعوت گھر گھر بھجوا دو۔"

اتنا کہہ کر ابا میاں تیز تیز قدموں سے اپنے اس کمرے کی طرف بڑھ گئے جہاں نائمہ بیگم جا کر روپوش ہو چکی تھیں۔ ظاہر ہے اب ان کو منانا ضروری تھا۔

فاطمہ پھوپھو چوکی پر گم صم بیٹھی رہ گئیں ان کے فرشتوں کو بھی اب سے پہلے گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے اپنے بھائی میاں بھی اس طرح گاؤں کے ماحول کو نظر انداز کر کے نائمہ بیگم کے ہم زبان ہو سکتے تھے!!

کچھ بھی تھا --- آج ان کو پوری طرح یقین آ چکا تھا کہ نائمہ بیگم کی خاطر وہ بڑے سے بڑا اقدام بھی راضی خوشی کر سکتے تھے۔

نائمہ بیگم سچ مچ تھیں بھی ایسی نعمت عظمٰی ابا میاں کے واسطے۔

اور ساون کی اس دوپہر ----

نائمہ بیگم کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

کسی طرف سے بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ تین عدد بچوں کی ماں ہیں۔ وہ اس شان سے آم کے باغ میں اتریں کہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

یہ لمبا چوڑا دھانی رنگ کا شرارہ، دھانی ہی چنا ہوا دوپٹہ اور سرخ چھوٹی سی قمیص، خوب بڑے بڑے بال بنے ہوئے۔ مسی، سرمے کا اہتمام۔ پھولوں کے گجرے اور زیورات پہنے ہوئے۔

ابا میاں کے بلاوے پر باغ میں جمع تو بہت سی خواتین ہو گئی تھیں۔ مگر اکثریت تو سادہ لوح دیہاتی عورتوں کی تھی جو جیسی اور جس حالت میں بیٹھی تھیں، اٹھ کر چلی آئی تھیں۔ وہ بھی ساون منانے سے زیادہ نائمہ بیگم کو قریب سے دیر تک دیکھتے رہنے اور ان کی باتیں وغیرہ سننے کے شوق میں۔

چنانچہ اس اجتماع میں ان کا رنگ روپ اور اہتمام چیخ چیخ کر آج انہیں برسات کی پری ثابت کر رہا تھا۔

باغ میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے کمن کے اس سامان کا جائزہ لیا جو ابا میاں نے ان کے آرڈر پر پہنچوایا تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ جھولوں کے پاس آئیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھابی سکینہ ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ جامن کے تین بڑے بڑے تناور اور گھنے درختوں سے مضبوط جھولے بندھے ہوئے تھے۔

جھولے کا آغاز سب سے پہلے نائمہ بیگم نے ہی کیا اور سکینہ بھابی نے پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ دوسری عورتیں پہلے پہل جھجکیں۔ کوئی بھی آگے بڑھ کر جھولے پر نہیں بیٹھ رہی تھی۔ مگر جب نائمہ بیگم اپنے جھولے کی طرف متوجہ ہو گئیں اور کھل کھل کر ہنستے ہوئے پینگوں کا لطف اٹھانے لگیں تو ان کی دیکھا دیکھی دوسریوں کی بھی جھجک دور ہوئی ایک آدھ ہچکی بڑھ کر جھولے پر بیٹھ گئی۔ کسی نے پینگیں دینی شروع کر دیں اور یوں ذرا سی دیر میں ایک خوشگوار سا ہنگامہ بچ گیا۔ ایک دوسری سے اونچا جھولنے کی حرص میں پینگیں اونچی سے اونچی جانے لگیں۔ ہر ہر جھولنے کی طرف سے "اونچا۔ اور اونچا...... اور زور سے......" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے نرم نرم قہقہے۔ شوخ ہنسی بانغ کی فضا میں آپ سے آپ گھلنے لگیں۔ ساون کی رم جھم میں یہ رنگین اور سنگین لمحات یادگار اور حسین ترین گھڑیاں بن گئیں۔ پھوار مسلسل برس رہی تھی۔ برساتی خوشگوار اور ٹھنڈک جھونکے جسم و جان سے ٹکرا ٹکرا کر نئی نویلی توانائی کا احساس دلانے لگے۔ درختوں پر کوئل نے الگ "کو کو" کا شور مچا رکھا تھا۔ آج ابا میاں کے گاؤں میں اس دھوم اور اہتمام سے ساون منایا جا رہا تھا کہ آج تک یہ نہ منایا گیا ہوگا۔ روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر اس جدت اور ہنگامے پر سبھی عورتوں کا دل باغ باغ ہو رہا تھا اور حسین رت کا لطف اٹھانے کے لئے سبھی نائمہ بیگم کی ممنون تھیں۔

پکوانوں کی میٹھی میٹھی خوشبو، آموں کی مہک، موٹی موٹی کالی سیاہ جامنوں کی بوچھاڑ اور ٹپاٹپ برستی برسات کی ٹھنڈی ٹھار بوندوں کا جلترنگ -- ابا میاں کے بڑے دادا کے ہاتھوں کا سینچا ہوا یہ برسوں پرانا طویل و عریض باغ۔ ایک مدت کے بعد ان

بالی فندؤں کی قسمت جاگی تھی کہ آج یہاں کی ہواؤں میں نسوانی قہقہے، شوخ مسکراہٹیں اور الہڑ معصوم جوانیاں اٹھکھیل رہی تھیں۔ اس باغ میں صرف قلمی و تخمی آموں اور بلند و بالا جامن کے پیڑوں کے سوا کہیں کہیں بس چند ایک چیکو کے درخت دکھائی دیتے تھے۔ گھاس کے شبنم آلود تختوں پر جگہ جگہ ٹپکے ہوئے پیلے پیلے آم اور جامن چھپے ہوئے تھے۔ چھوٹے بچوں کی آج عید ہو گئی تھی۔ بچوں کے تعاقب میں، بارش کے شفاف قطروں سے بے نیاز ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے پھر رہے تھے۔

کچھ دیر تک مسلسل جھولتے رہنے کے بعد نائمہ بیگم نے اپنے بے ساختہ قسم کے قہقہوں میں بریک اور گھاس پر اپنے نازک نازک پاؤں ٹکا کر سب کو مخاطب کیا۔

"چلو اب ساون بھی تو گاؤ۔ یا خالی خولی جھولے ہی جاؤ گی۔"

ساری عورتیں ایک دوسرے کی صورت تکنے لگیں۔

ایسا نہ تھا کہ ان میں سے کسی سے گانا نہ آتا ہو۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس حسین اجتماع میں بہت سی تو ایسی تھیں کہ جن کے دم قدم سے شادی بیاہ کی محفلیں جمتی تھیں اور ایسی میٹھی و رسیلی آوازیں کہ بس سنا کیجئے۔

مگر آج تو گاتے ہوئے سب کو شرم آنے لگی۔

لیکن پھر نائمہ بیگم کے اصرار پر چند زیادہ عمر کی خواتین نے اپنی طرز کے ساون گانے۔ ایک ان کی سن رسیدہ آوازیں۔ دوسرے درمیان میں بار بار بھول کی وجہ سے تسلسل برقرار نہ رہنے سے شوخ و شریر لڑکیوں کی مخصوص بازی اور بلند بانگ قہقہے --

جلد ہی یہ سلسلہ رک گیا۔

نائمہ بیگم کو ہنسی آ رہی تھی۔ تبھی بھابی سکینہ نے انہیں ٹہوکا دیا۔

"آپ کچھ گا دیجئے نا بڑا مزہ آئے گا۔"

جی تو ان کا بھی مچل رہا تھا مگر اصرار کروا کے گانے اور محفل لوٹنے کی ہمیشہ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عادی تھیں۔ مگر اس وقت اس فکر میں بھی مبتلا تھیں کہ اس وقت کی محفل اور ماحول کے مطابق ہی کوئی ساون اٹھائیں تاکہ ہر کسی کی سمجھ میں بھی آسکے۔

یوں تو ان کو بیسیوں ساون یاد تھے۔ مگر بلا کی ذہین تھیں۔ موقع محل کے لحاظ سے کوئی موزوں اور جی کو لگنے والی چیز گانا چاہ رہی تھیں۔

چند منٹ سوچنے اور یاد کرنے کے بعد انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر ان کی مہین اور سریلی آواز کوئل کے ساتھ سر ملانے لگی۔

"پکی نیم کی نمکولی--- ساون جب بھی آئے گا،

جئے میری ماں کا جایا--- ڈولی بھیج بلائے گا۔"

چہکتی پکارتی فضائیں یکلخت دم بخود ہو گئیں۔

شوخ و شریر لڑکیوں کے قہقہے آن واحد میں دم توڑ گئے۔

ایک ان کی سریلی آواز کا قدرتی سوز، گداز جی کو چھو لینے والا لہجہ، موسم اور رم جھم برستی بوچھاروں کا تقاضہ اور اوپر سے سادہ دیہاتی عورتوں کی محفل---

کسی کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

یکے بعد دیگرے بہت سی عورتوں نے اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

اور جب تک نائکہ بیگم نے اپنی پرسوز آواز میں اس دلسوز ساون کا آخری بند مکمل کیا چند عورتوں نے چپکوں چپکوں آنسو بہا ڈالے۔

ہر کوئی ان کی آواز اور آواز کے ساتھ شاعری کے الفاظ سے متاثر تھا۔

انہی--- جذباتی لمحات میں---

ان سب سے دور--- جامن کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے ہری ہری گھاس پر بیٹھی مشکبار کی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں آپ سے آپ بھر آئی تھیں۔

ننھا دلشاد اس کی گود میں بیٹھا ایک آم کی گٹھلی چوس رہا تھا۔

اس سے بڑا بھائی شمشاد بہت دیر تک کھیلنے کودنے کے بعد اس کے نزدیک ہی گھاس پر لیٹ کر سو گیا تھا۔

"جئے میری ماں کا جایا--- ڈولی بھیج بلائے گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کا دکھا ہوا دل بھر آیا تھا۔

شمشاد اور دلشاد بھی اس کے ماں جائے تھے--- مگر کس قطار شمار میں!

گو کہ ابھی وہ چھوٹی تھی۔ میکے اور سسرال کے فرق سے نابلد--- نا آشنا!!

مگر ماں کے گائے ہوئے ساون کے بولوں نے اس کے دل میں جیسے انگارے بھر دیئے۔ نمناک برساتی جھونکوں سے آگ کی لپٹیں سی اٹھنے لگیں۔ دل و دماغ کی ننھی سی کائنات ایسے جھٹکے سے روشناس ہوئی کہ اس نے بے اختیار اپنے رخسار ننھے اور نا سمجھ بھائی کے گیلے گیلے رخساروں پر ٹکا دیئے اور بے اختیار رونے لگی۔

ابھی وہ دنیا اور دنیا کے نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوئی تھی۔ ساون کی رم جھم میں میکے کی یاد، بچھڑنے، ملنے اور جدائیوں کے تضاد اور انقلابات سے نا آشنا تھی--- مگر باپ کے اچانک بچھڑ جانے اور شفقت پدری کے ساتھ ماں کے حقیقی پیار اور ممتا کے دلگداز لمس کے کھو جانے نے اسے بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا اور اس ذرا سی عمر میں ہی اسے سوچتے رہنے اور تاریکیوں میں جھانکنے کا عادی بنا دیا تھا۔ دھیرے دھیرے تنہائی اور دکھ کا شدید احساس اس کے رگ و پے میں زہر کی طرح سرایت کرتا جا رہا تھا اور وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ خود کو دنیا میں اکیلی سمجھنے لگی تھی۔

آج ان لمحات میں، جبکہ اس کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا، اس کے سامنے بچھڑے ہوئے ماہ و سال آن کھڑے ہوئے۔

وہ معصوم اور یادگار لمحے--- جب قدم قدم پر محبت کرنے اور چاہتیں لٹانے والے باپ کا ساتھ میسر تھا۔ جس کے لئے انہی بچوں کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی، جلد کا ناسور بن جایا کرتا تھا۔ جس نے دنیا کی ہر نعمت مہیا کر رکھی تھی۔

"کاش!! اے کاش! وہ سہانے دن واپس لوٹ آئیں!!"

اس کے خشک ہونٹوں سے یہ آرزو ایک سسکی بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو گئی اور مشکبار بھائی کو گود میں سمیٹے سمیٹے، بچپن کی خوشگوار اور رائیگاں یادوں میں کھوئی کھوئی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

کچھ دیر کے لئے دنیا اور دنیا کے انقلابات سے بے خبر ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو کوئی اسے مسلسل پیر کی ٹھوکر سے جگائے جا رہا تھا۔

اس نے نیند کے خمار سے بوجھل اور بند بند آنکھیں کھول کر بمشکل سمجھنے کی کوشش کی۔

نائمہ بیگم غیظ و غضب میں پھنکاریں مارتی ہوئی اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ اور جانے کیا کیا کہے جا رہی تھیں۔

مشکبار نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے چاروں طرف عورتیں لڑکیاں حلقہ باندھے کھڑی تھیں۔ اور نائمہ بیگم پوچھ رہی تھیں۔

"بول کتنی --- خرافہ --- شمشاد کو کہاں بھیج دیا۔ کدھر گیا وہ؟ اگر تو نے اسے کھو دیا تو آج تیری ہڈیاں پچل دوں گی۔"

اتنا کہتے کہتے انہوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور چبوترے سے نکل کر صحن میں لا پٹخا۔

مشکبار کے سوئے سوئے ذہن میں اب تک معاملے کی نوعیت نہیں آئی تھی۔ اس نوچا کھسوٹی میں دلشاد اس کی گود سے پھسل کر فرش پر جا گرا تھا اور اب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کوئی عورت اسے اٹھا کر خاموش کروانے اور چمکارنے لگی۔

نائمہ بیگم کمر پر دونوں ہاتھ رکھے تھانیداروں کی طرح کھڑی اور بلند آواز میں کہہ

رہی تھیں۔ "خود تو مہارانی جی یہاں اینڈتی رہیں آرام فرماتی رہیں اور میرے بچے کا کچھ دھیان ہی نہیں --- کیا اس لئے میں تجھے ساتھ لائی تھی۔ کہ تو بچوں کا ڈھنگ سے خیال بھی نہ رکھ سکے! تف ہے تیری زندگی پر بے حیا لڑکی! جسے اپنے بھائیوں کے کھو جانے اور گم جانے کا بھی قلق نہیں۔ جا دور ہو جا میری نظروں سے۔" انہوں نے یکایک کھڑی مشکبار کو زور سے دھکا دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دھڑام سے گھاس میں جا گری۔

اتنی ہی دیر میں ماں نے اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔ مگر غصہ اب تک نہیں اترا تھا۔ آگے بڑھ کر پھر اسے جھنجھوڑ کر کھڑا کر لیا اور بجلی کی طرح کڑکیں۔

"یاد رکھ منحوس! میرے بچے کو نصیب دشمناں کچھ ہو گیا یا وہ نہ ملا تو تیری بوٹیاں ضرور چیل کوؤں کو کھلا ڈالوں گی --- بول! کمین لڑکی! تو نے میرا بچہ چھپایا کہاں ہے؟ اسے بھی نگل گئی ناگن!!"

اس کے رخساروں پر تڑاتڑ تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے وہ جنون کے عالم میں بولے چلی جا رہی تھیں۔

سب عورتیں سکتے کے عالم میں یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ کسی کو اتنا خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی کو ان کے چنگل سے رہائی دلا تیں۔

دفعتاً باغ کے ایک گوشے سے گل بھاگتے ہوئے نمودار ہوئے اور ماں بیٹی کے درمیان حائل ہو کر پھولی ہوئی سانسوں سے پوچھنے لگے۔

"کیا ہو گیا --- کیا بات ہے امی جان! مشکبار سے کیا خطا ہو گئی --- ؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیے! آخر قصہ کیا ہے؟"

نائمہ بیگم نے غصے سے جلتی ہوئی نگاہیں گل پر گاڑ دیں اور سرد آواز میں بولیں۔

"ہوتا کیا؟ پڑ کر دوپہر بھر اینڈتی رہیں صاحبزادی اور شمشاد کو جانے کہاں کھو دیا۔ باغ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گوشہ گوشہ چھان مارا ہے، ہر کونے میں ڈھونڈ لیا مگر میرا بچہ خبر نہیں کہاں پہنچوا دیا اس ڈائن نے ---الگ ہٹو گل! آج میں اس ناگن کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گی، مفت کا کھا کھا کر بہت اترا گئی ہے حرافہ۔"

انہوں نے ایک دفعہ پھر مشکبار کے لانبے لانبے بالوں کی چوٹی پر ہاتھ مارا۔

"ارے ... ارے ... کمال کرتی ہیں ای جان آپ بھی۔" گل نے دونوں ہاتھوں سے اسے بچاتے ہوئے بوکھلا کر کہا۔

"شمشاد تو ابھی ابھی میرے ساتھ تھا۔ میں گھر گیا تو وہ بھی چلا گیا۔ کھانا کھا کر سو گیا ہے وہیں فاطمہ پھوپھو کے پاس۔"

نائمہ بیگم کے ہاتھ پیر اچانک ڈھیلے پڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ہانپنے لگیں۔ لیکن مجال ہے کہ رویے میں اک ذرا سی بھی لچک اگر آئی ہو---نہ ان کے انداز میں پشیمانی تھی۔

جبکہ مشکبار کا شرمندگی اور خجالت سے برا حال تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ آج اتنے افراد کے درمیان اس کا جو حشر اپنی ہی ماں کے ہاتھوں ہوا تھا، اس کی کہیں دوسری جگہ مثال ملنی ممکن نہ تھی، وہ اب تک دونوں ہاتھوں سے اوڑھنی میں چہرہ چھپائے سہمی سہمی سی گھاس پر آلتی پالتی مارے نہیں، گھٹنوں پر آنسوؤں بیٹھی تھی۔

دیکھنے اور محسوس کرنے والے ہمدرد کلیجے اس کی بے بسی اور مظلومیت پر کٹے جا رہے تھے۔ جن میں گل کا تو برا حال تھا۔ ان کا رحم اور مروت سے لبریز سینہ مشکبار کی مظلومیت اور یتیمی پر شق ہوا جا رہا تھا۔ مگر ظاہر ہے کسی دوسرے کی اولاد کے لئے اس وقت تسلی و تشفی کے دو بول بھی جانے کتنے شکوک و شبہات کو جنم دے سکتے تھے۔ اس لئے وہ بھی صبر و تحمل کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

خاصی گہری شام اتر آئی تھی۔

سبزے، درختوں کی بہتات، ساون کی جھڑی اور بادلوں کی وجہ سے شام کے گہرے پن کا احساس زیادہ ہی گہرا تھا۔ سب لوگ واپس چلنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

گل نے آنکھوں آنکھوں میں بڑی بھاوج کو اشارہ کیا، وہ ایک گہرا سانس کھینچ کر سکڑی سمٹی مشکبار کی طرف بڑھ گئیں۔

خود بھابی سکینہ کا دل بھی اس کی طرف سے بری طرح کٹ رہا تھا مگر سوائے اسے خاموش ہو جانے کا کہنے کے اور کیا کر سکتی تھیں۔ وہ گھاس پر بیٹھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں تاکہ اس کے بہتے اشک خشک کر سکیں، مگر--- رو ہی کب رہی تھی--- مارے دہشت اور خجالت کے آنکھوں کے تو جیسے سوتے ہی خشک ہو گئے تھے---ساون کی جھڑی میں نظر نہ آنے والی آگ لگی ہوئی تھی---

وہ بہرحال عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی۔ جہاں تک پہنچ کر عزت، توہین، اچھے برے، تمسخر، حق اور ناحق کا احساس جاگ پڑتا ہے۔ اور مشکبار--- وہ تو بھلا فطری طور پر انتہائی غیور طبیعت کی مالک تھی۔

کچھ دیر بعد یہ قافلہ اس پرانے آم کے باغ میں ساون کے یادگار لمحات گزار کر دوبارہ گاؤں کے رہائشی حصے کی طرف عازم سفر ہوا۔

واپسی کے سفر میں سکینہ بھابی نے مشکبار کو اپنے قریب چمکار کر بٹھا لیا تھا وہ چپ چاپ دلشاد کو گود میں سمیٹے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

چہرے کے نقوش میں غم آلود سی افسردگی نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ اس نے اب تک کسی کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

غیرت اور شرمندگی کے شدید احساس کے تحت رنگت ابھی تک تپی تپی سی ہو رہی تھی۔ سب کی موجودگی میں بالکل غیر متوقع طور پر پیٹ جانے سے جیسے ہوش و حواس ہی قابو میں نہیں رہے تھے اور اس پر نائمہ بیگم کی قینچی کی مانند کترکتر چلتی زبان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے زہریلے تیر و نشتر---

جیسے روح کی گہرائیوں تک میں زخم ابھر آئے تھے۔ رستے ہوئے گہرے زخم۔

مگر---اس نے احتجاج میں ایک الفاظ بھی زبان سے نہیں نکالا تھا۔

اگلی صبح۔

اچانک ہی نعیمہ بیگم نے کوچ کا نقارہ بجا دیا۔

سب ہی اس اچانک فیصلے پر حیران رہ گئے۔ رکی ہوئے سبھی نے مزید رکنے کا اصرار کیا، مگر ان کی "نا"، "ہاں" میں نہیں تبدیل ہو سکی۔

ان کا کہنا تھا کہ جی اٹھ گیا---سو اٹھ گیا۔

لیکن ایک حرکت انہوں نے نہایت ہی عجیب و غریب کی اور وہ یہ کہ تینوں بچوں کو وہ یہیں گاؤں میں چھوڑ کر جا رہی تھیں اور کہا یہ تھا کہ شہر میں تو آج کل بہت زیادہ ہی گرمی ہو گی۔ یہاں کی کھلی کھلی فضاؤں میں بچے بہلے رہیں گے۔ گرمی کی شدت ٹوٹتے ہی وہ بچوں کو واپس بلوا لیں گی۔

ابا میاں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا! انہوں نے بخوشی رضامندی دے دی۔ مگر مشکبو نے سنا تو حواس باختہ ہو گئی۔ وہ وحشی ہرنی کی طرح گھبرا گھبرا کر سب کی صورتیں تکنے لگی۔

کل والی ساری رنجش اور پشیمانی اور شکایت پس پشت ڈال کر اس نے اپنے تمام تر حوصلوں کو آواز دی اور ماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اماں... ہم بھی جائیں گے آپ کے ساتھ۔ یہاں کس کے سہارے چھوڑے جاتی ہیں ہمیں! ہم بھی گھر جائیں گے۔"

"نہیں! تم یہیں رہو اپنے بھائیوں کے ساتھ۔"

وہ ساری کا فال درست کرتی ہوئی فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ "وہاں سہارن پور میں کالرے (ہیضے) کی وبا عام ہو رہی ہے۔ گھر گھر بچے بیمار پڑے ہیں۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔"

معلوم نہیں وہ کہاں تک درست کہہ رہی تھیں، مگر بچوں کو ساتھ لے جانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

مشکبار نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "لیکن آپ کو اوپر کے کام کی بھی تکلیف ہو جائے گی۔ ہمیں ساتھ لے چلیے۔ ہم آپ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ آپ اکیلی کہاں تک سب کام نپٹایا کریں گی۔"

اب نائمہ بیگم اس کی معصوم سی چالاکی پر زیر لب مسکرا دیں مگر بولیں اسی بے لچک اور ٹھوس لہجے میں۔

"وہاں دو نوکرانیوں کا انتظام ہو چکا ہے۔ تم اس فکر میں دبلی مت ہو۔"

کوئی ترکیب کارگر نہ ہوتے دیکھ کر مشکبار رو دی۔ "اللہ اماں! ہمیں ساتھ لے چلیے-- ہمارا یہاں ہرگز جی نہ لگے گا اور پھر دلشاد بھی تو آپ کو نہ پا کر روئے گا۔ ہم اسے بہلائیں گے۔"

"یہ سب فضول اور من گھڑت باتیں ہیں۔ بے سر و پا اور بیکار قسم کے بہانے۔" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"دلشاد جتنا تمہارے پاس خوش اور مطمئن رہتا ہے۔ ہمارے پاس بھی نہیں رہتا۔ وہ پوری طرح تمہارا عادی ہو چکا ہے۔ بھلا رات کو سوتا تک تو تم سے چمٹ کر ہے۔"

پھر دفعتاً تیور بدل کر بولیں۔ "یہ تم ٹسوے کاہے کو بہا رہی ہو، تمہیں تمہاری سسرال میں نہیں چھوڑے جا رہی جو تم رو رو کر دکھا رہی ہو۔ خبردار جو اس بے ہودگی سے روئیں! یہاں تمہیں کونسے خطرے اور اندیشے ہیں! گرمی نکلتے ہی واپس بلوا لی جاؤ گی۔"

اماں کے بگڑنے اور پھنکار سے زیادہ ان کی زبان سے جھڑنے والے زہریلے الفاظ کی تندی سے گھبرا کر مشکبار نے اپنی ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ لفظ "سسرال" سن کر آنسو پلکوں کی منڈیروں پر ہی ٹھٹھک کر منجمد ہو گئے تھے۔

پھر ان کے چلے جانے تک مشکبار نے ایک آنسو تک نہ بہنے دیا حالانکہ اس بے پروائی اور بے اعتنائی پر اس کے سہمے ہوئے دل میں سینکڑوں نشتر ٹوٹ گئے تھے۔

نائمہ بیگم کی سواری جب گاؤں سے روانہ ہوئی تو بادلوں نے پہلے سے ہی برسنا چھوڑ دیا۔ جگہ جگہ سے گہرا نیلا شفاف آسمان جھانکنے لگا تھا۔ کھلی کھلی فضائیں، دھلا دھلا موسم، خوشگوار رت سب نے مل کر انہیں الوداع کہا تھا۔ موسم پر جانا پہچانا سا نکھار آ گیا تھا۔ درخت پھول، پودے۔ پیڑ، پتے پتے پر ساون نثار ہو چکا تھا۔

نائمہ بیگم نے اپنے جانے سے پہلے آٹھ ٹوکرے قلمی آموں اور جامنوں کے سہارن پور بھجوا دیے تھے۔ اپنے اڑوس پڑوس میں بانٹنے کے لئے۔ اور اس سوغات کو پہنچانے کے لئے گل گئے تھے۔ جو کافی پہلے روانہ ہو چکے تھے۔

نائمہ بیگم اور ابا میاں ان کے جانے کے بعد گھر کے یکے میں اسٹیشن روانہ ہوئے۔

❁

نائمہ بیگم کے چلے جانے کے بعد ایک دم ہی گھر کے اندرونی حصے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ مشکبار کا دل بار بار بھرا چلا آ رہا تھا۔ گاؤں میں تنہا رہ جانے سے زیادہ اسے ماں کے کھورپن اور سنگدلی پر رنج تھا۔ دل ہی دل میں سو خیال آ رہے تھے، سو جا رہے تھے۔ اسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھولا باندھی میں شام ہو گئی---- شام ڈھل کر رات میں بدل گئی مگر اس کی بے قرار
کو قرار نصیب نہ ہوا۔ بلکہ جوں جوں وقت گزر رہا تھا بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ایسا نہ تھا کہ خدانخواستہ اس گھر کی چہار دیواری میں اس کو کسی طرح کا خوف و خ
تھا۔ بلکہ یہاں تو سب کا رویہ بھی اس کے اور دلشاد و شمشاد کے ساتھ بہت مناسب ا
بہتر تھا۔ حالانکہ سوتیلا رشتہ تھا اور یہاں کے لوگوں سے اس کا کوئی خونی تعلق قائم نہ
تاہم سکینہ بھابی، رئیسہ ان کے بچوں اور فاطمہ پھوپھو سمیت اس گزرنے والے ڈیڑ
ماہ کے دوران کسی نے ان تینوں بہن بھائیوں کو ماتھے پر بل ڈال کر بھی نہیں دیکھا تھ
دراصل اس گھرانے کے ماحول میں شروع ہی سے خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت ا
عبادت اور نماز و روزے کی آمیزش رچی اور بسی ہوئی تھی۔ ہر دل میں خوف خ
جاگزیں تھا۔ چنانچہ ان چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں سے وہ کیوں پرخاش رکھتے!

بلکہ ماں کا ان کے ساتھ خود غرضی و بے اعتنائی کا عجیب و غریب رویہ دیکھ کر
چھوٹے بڑے کو ان بچوں سے غایت درجے کی ہمدردی اور انس ہو چکا تھا۔

مگر مشکبار تو اپنے ہی دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اسے بھی یہاں کسی سے گلہ شکو
تھا۔ اس کا دل تو اپنی ماں سے بھی زیادہ اپنے بگڑے وقت اور مخالف حالات کے خلا
شکایت سے لبریز تھا۔ جن سب نے مل کر اسے بھائیوں سمیت ٹھکانے سے
ٹھکانے اور دربدر کر دیا تھا، سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے

جن کے لاڈ بکھیرے---- ان کے دکھ گھنیرے

رات گہری ہوتے ہی ہوا ایک دم بند ہو گئی۔

کہاں تو ساون برس رہا تھا اور برساتی ہوا کے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ پتے
میں جان پڑی ہوئی تھی اور کہاں گرمی کی شدت سے دم گھٹنے لگا۔

فضائیں ایک دم ہی حبس آلود ہو گئیں۔ ایڑی سے چوٹی تک پسینے کی دھاریں

نکلیں۔ کھانا سب نے بمشکل کھایا اور "گرمی، گرمی" کرتے ہوئے اٹھ گئے۔

عشاء کی نماز پڑھ کر فاطمہ پھوپھو، چوکی سے فوراً ہی اٹھ گئیں اور پنکھا جھلتے ہوئے
بڑی بہو کو مخاطب کیا۔

"سکینہ! گرمی تو آج جان لئے لے رہی ہے۔ میرا خیال ہے سب کے لئے بڑے
دالان میں پلنگ بچھوالو۔ برآمدے میں تو بچے پوری رات چین لیں گے نہ لینے دیں گے۔"

"ہاں پھوپھو یہ رائے ٹھیک ہے۔" رئیسہ نے برتن دھوتے ہوئے کہا۔ "باہر
تھوڑی سی ترّی تو ہو گی۔"

چنانچہ مویشی خانے اور برآمدے کے درمیان جو بڑا سا کشادہ دالان تھا، اس میں
یہاں سے وہاں تک پلنگ بچھا کر بستر کر دیئے گئے۔

یہاں برآمدے کی نسبت قدرے ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا، گو کسی درخت کا
ایک پتہ تک ہلتا نظر نہ آ رہا تھا مگر گھٹن میں کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے بہت کمی تھی۔

فاطمہ پھوپھو نے مشکبار کے برابر میں اپنا پلنگ ڈلوا لیا تھا۔ مشکبار، دلشاد کو لئے چپ
چاپ لیٹی ہوئی تھی، دوسری چارپائی پر شمشاد، رئیسہ کے بڑے لڑکے کے ساتھ بیٹھا
کھیل رہا تھا۔ یہ دونوں بچے ساتھ ہی سوتے تھے۔

بہت دیر تک یہ تینوں بڑی عورتیں اپنے اپنے پلنگ پر لیٹی باتیں کرتیں اور پنکھے
جھلتی رہیں پھر جلد ہی ان پر نیند طاری ہو گئی کھیلتے شور مچاتے بچے ایک ایک کر کے سو
گئے۔ مگر مشکبار کی آنکھوں سے نیند کی پری کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس
کے دونوں پہلو جل اٹھے، مگر نندیا رانی کو اس پر مہربان ہونا تھا نہ ہوئی۔

بیزار ہو کر وہ کھلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

آسمان اب تک بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ چاند ستاروں کا وجود تاریکی کی چادر
اوڑھے اونگھ رہا تھا اور ہوا ابھی ناپید تھی۔ گرمی کی وجہ سے طبیعت اور بھی الجھ رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے پلنگ سے اتر کر چپل پیروں میں ڈالی اور دبے قدموں سے چلتی ہوئی ہینڈ پمپ کے قریب بیٹھ گئی اور پانی سے خوب اچھی طرح منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ ہینڈ پمپ سے نکلنے والا پانی بھی نیم گرم ہی تھا مگر ان چھینٹوں سے جلتی ہوئی آنکھوں کو قدرے سکون کا احساس ہوا۔

کچی منڈیر پر بیٹھی وہ خاصی دیر خالی الذہنی کے عالم میں کچھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی۔ مویشی خانے کی طرف سے کسی کسی وقت بھیڑوں کے ممیانے کی آواز رات کے سکوت میں ابھرتی اور مدغم ہو جاتی۔

آنگن میں کھڑی بلند و بالا نیم افسردگی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ یوں جیسے فضا میں بڑھ جانے والی گھٹن سے وہ بھی خفا ہو۔

لیموں کے پتوں سے کوئی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی نہ مہندی کی باڑھ سے پروا کے انگز جھونکے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ گھٹن اور حبس نے سب کو چپ کی چادر اوڑھا ڈالی تھی۔

مشکبار جانے کتنی دیر بے خبری کے عالم میں وہیں بیٹھی رہتی کہ دفعتہ نیم کی اکھوار میں چھپے بسیرا لیتے والے کسی پرندے نے گرمی سے گھبرا کر زور زور سے اپنے پنکھ ہلائے---رات کے بوجھل سناٹے میں یہ آواز دور دور تک پھیل گئی۔

مشکبار چونک کر جیسے بیدار ہو گئی۔

اپنے ارد گرد کا تاریک اور خاموش منظر دیکھ کر وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔ دور کہیں کھیتوں کی طرف سے کسی آوارہ کتے یا گیدڑ کی آواز جیسے پکار بن کر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ تیز تیز قدموں سے چپل گھسیٹتی پلنگ پر آلیٹی اور معصوم بھائی کو کلیجے سے چمٹا لیا۔

سب لوگ گرمی اور حبس سے بے خبر پڑے سو رہے تھے۔

مشکبار ایک دفعہ پھر لیٹتے ہی لیٹے بچپن کی سہانی، دلفریب، نقرئی گلند ندیوں کا دکھ درد دیکھنے اور سننے کے واسطے واپس دنیا میں نہیں آتے۔ خواہ کوئی کسی کے لئے کتنا تڑپ کتنا ہی ترسے کیوں نا، جانے والوں کو، پیچھے رہ جانے والوں پر رحم آتا ہے نہ ترس!

جب ضبط کے بند ھن ٹوٹ گئے---

صبر و برداشت کی ڈور ہاتھ سے چھوٹ گئی---

تو وہ یتیم بچی سر تکیئے پر پٹخ کر بلک بلک کر رو پڑی۔ تڑپ تڑپ کر آہ و زاری کرنے لگی۔ ایسی رقت اور بے تابی و بے قراری کے ساتھ کہ دیکھنے سننے والے کے کلیجے کٹ کٹ جائیں۔

"ابا... ابا... آپ کہاں چلے گئے... ہمیں اس ظالم دنیا میں بھٹکنے کو چھوڑ گئے... ابا! آپ تو کبھی ایسے بے رحم نہیں تھے---آپ کو کیا ہو گیا... ذرا آکر ہمارا حال تو دیکھئے! آپ نے کیا منہ موڑا، دنیا کے ہر سکون نے کنارہ کر لیا ہے۔ اماں بھی ہم سے بدل گئیں... وہ سخت گیر تو سدا کی ہیں مگر آپ کے سامنے تو ایسی نہ تھیں۔ اب تو وہ ہمیں بہت ہی حقیر اور ادنیٰ سمجھنے لگی ہیں... ہائے اللہ! یہ اماں کو کیا ہو گیا ہے! وقت کبھی ایسے ستم ڈھائے گا، ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا... یہ سب آپ کے بچھڑنے سے ستم ٹوٹے ہیں ابا! ورنہ ہم سے کون سے قصور سرزد ہوئے ہیں... ایک آپ نے کیا ساتھ چھوڑا، ہر ہمدرد نے آنکھ پھیر لی ہے... ہم کہاں جائیں ابا! آپ کو کہاں ڈھونڈیں... آپ کا سراغ کہاں سے ملے ابا... ہائے ابا... میرے پیارے ابا!!!"

وہ رات کے ان بوجھل اور بے چین لمحات میں جی کھول کر رو رہی تھی اور باپ کے سایہ عاطفت کو یاد کر رہی تھی، پکار رہی تھی۔

دل تو کل سے ہی بھر آرہا تھا۔ آج مرے پر سو درے تائی بیگم کے چلے جانے نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لگاڈالے تھے۔ اس کا ننھا سا دل جیسے ہر طرف سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا، رہ رہ کر نگاہوں میں باپ کی صورت گھوم جاتی۔

یکلخت اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہو---اور اپنی نرم نرم انگلیوں سے اس کے الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنے لگا ہو---گردن اٹھا کر دیکھا۔

اس کے ابا سرہانے کی طرف کھڑے ہوئے اسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہے تھے۔ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے۔

آنکھوں میں بے بسی و لاچاری کے عجیب سے تاثرات گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"ابا... میرے ابا... !"

وہ بے قرار ہو کر ان کی جانب لپکی اور چاہا کہ بڑھ کر باپ کو چھو لے ان کے پرشفقت سینے سے لپٹ جائے---اور بے شمار شکوے کر ڈالے---مگر اس سے پہلے وہ انہیں محسوس کر لینے میں کامیاب ہو پاتی وہ مشکبار کی پہنچ سے کہیں دور کھو چکے تھے۔

بس ایک لمحے کے لئے آئے تھے، اور اپنی صورت دکھلا کر روپوش ہو گئے---وہ دیوانوں کی طرح گھور گھور کر ہر طرف دیکھتی رہ گئی---اور وہ جا چکے تھے۔

چند لمحوں بعد جانے کیوں بے تاب دل و دماغ کو ٹھہراؤ سا محسوس ہونے لگا اور وہ دوبارہ تھک ہار کر لیٹ گئی۔ رخسار اب تک آنسوؤں سے گیلے تھے---اور صبح دم جب وہ کوئل کی کوکوں سے بیدار ہوئی تو اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

❁

مشکبار نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اور اب تک کی عمر گزاری تھی، وہ ایک پڑھا لکھا اور معزز گھرانہ تھا۔ اس کے والد اسرار احمد اس وقت کے ایک سرکاری محکمے میں

ملازم تھے۔

گھر میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ بے فکری اور آسودگی تھی۔

دراصل دنیا میں اسرار احمد کے ایک چھوٹے بھائی کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نثار احمد کو فطری طور پر کھیتی اور باغبانی وغیرہ سے انسیت تھی۔ اور اسی لگاؤ کی بنا پر انہوں نے لکھنؤ سے نزدیک ہی اچھا اور مناسب موقع محل دیکھ کر بہت سی زمینیں خرید ڈالی تھیں۔ جہاں انہوں نے کھیت اور باغ اپنی محنت اور مرضی سے اگائے تھے۔ چند برسوں کے اندر ان کی بے پناہ محنت اور ریاضت کا پھل زمین کی کوکھ پھاڑ کر بہہ نکلا۔ ہر طرف سے ان پر دھن برس پڑا۔ غلہ، کئی اقسام کی اجناس، پھل پھلاری سبزی ترکاری ان کی زمین سے اٹی پڑی اور اللہ کی رحمت کی ریل پیل ہو گئی۔ خدائے بزرگ و برتر نے محنت و مشقت کے ثمر سے ان کی جھولی بھر ڈالی تھی۔

قدرت نے بیوی بھی ان کو سادہ لوح اور تعلم کی بندی بخشی تھی۔ جسے "ہاں جی" کے سوا دوسرا لفظ نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب نثار احمد نے شہر چھوڑ کر ایک غیر آباد اور دیہاتی علاقے کی رہائش اختیار کی تو بیوی نے مخالفت تو کجا، اف تک منہ سے نہ نکالا۔ وہ اپنا سب کچھ مجازی خدا پر چھوڑ چکی تھیں۔

کرم پر کرم---نوازش پر نوازش یہ ہوئی کہ اللہ نے تلے اوپر چار بیٹے بھی نواز ڈالے۔ بیٹی کوئی سرے سے ہوئی نہیں---

ادھر اسرار احمد بے چاروں کے ساتھ سب کچھ برعکس ہوا۔ گو وہ نثار احمد سے دو برس بڑے تھے مگر تقدیر میں ان سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

فطری طور سے بہت نرم خو، کم سخن اور قدرے دبو قسم کے واقع ہوئے تھے جنہیں نعمہ بیگم کی ایک للکار نے ہی ہمیشہ کے لئے دبا ڈالا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے سکون پسند اور صلح جو مزاج کی وجہ سے کوئی جھگڑا مول لینے سے ساری زندگی کتراتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے۔۔۔ بس جو بیوی نے کہا، ہو گیا۔ جو انہوں نے کیا کر دیا۔ وہ عورت کو قابلِ احترام سمجھتے تھے۔ عورت ان کے نزدیک نرمی اور اچھے سلوک کی مستحق تھی۔۔۔ لیکن اس نرمی نرمی اور مروت ہی مروت میں ہوا یہ کہ نائمہ بیگم ان کو ہر طرف سے دباتی چلی گئیں اور یہ دبتے چلے گئے۔ ہر چند کہ تاعمر نائمہ بیگم ہی رہیں۔۔۔ اسرار احمد کی شخصیت پس منظر میں چلی گئی۔

درحقیقت۔۔۔ نائمہ بیگم اپنے امیر کبیر والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ یوں ایک بھائی بھی تھے۔ مگر ان کی ناز برداری اور ناز زیادہ ہوئے تھے۔ اس زمانے کے رسم و رواج کے خلاف، ان کے والد نے ان کی شادی بھی بہت تاخیر سے کی تھی اور یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ نائمہ بیگم عمر میں بھی اسرار احمد سے بڑی تھیں۔

وجہ یہ تھی کہ ان کے والد بے حد سمجھدار اور دور اندیش قسم کے انسان تھے۔ صاحبزادی کے بیجا لاڈ اٹھا کر اور ناز برداریاں کر کر کے اسے لڑکوں کا سا مزاج، حاکمانہ انداز اور من مانی کرنا تو سکھا دیا تھا۔ مگر پھر جوں جوں وہ بڑھتی گئی یہ فکر میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یوں اس کی عمر بڑھتی گئی اور انہیں حسب پسند کوئی لڑکا نظر نہ آ سکا۔

خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی بیٹی اب بھرے پرے خاندان میں نبھا کرنے کے لائق تو رہی نہ تھی۔ ساس سسر، نندوں، دیور جیٹھ، ہر کسی کا منہ رکھنا اور اب لحاظ کرنا اس کے لئے کہاں ممکن رہا تھا۔ ضد اور ہٹ دھرمی تو اس کے مزاج میں لہو کی مانند رچ بس گئی تھی۔ جبکہ ان کے والد چاہتے تھے کہ کوئی ایسا بر ملے کہ ان کی بیٹی کی ناز برداریاں اسی طرح ہوں اور وہ میکے کی طرح سسرال میں بھی من مانی کر سکے۔ تاکہ اس کا دل میلا نہ ہو۔ اور ویسے بھی ناخوشگوار قسم کی ازدواجی زندگی اور اس کے بکھیڑے دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ شادی ہوتی بھی جوا ہی ہے۔ راس آ جائے تو جنت ورنہ جہنم۔۔۔

چنانچہ اسی تلاش تلاش میں، جبکہ نائمہ کی عمر اس وقت کے لحاظ سے نکلی جا رہی تھی، ان کے والد سے کہیں اسرار احمد ٹکرا گئے۔

اندھا کیا چاہے۔۔۔ دو آنکھیں۔۔۔ والد بزرگوار کی باچھیں کھل گئیں۔ اسرار احمد انہیں دل و جان سے پسند آ گئے۔ یہ بر ان کی توقع سے بھی کہیں زیادہ موزوں اور مناسب تھا۔

اسرار احمد بے چارے انہیں پسند کیوں نہ آتے۔ بھری پری دنیا میں ایک چھوٹے بھائی کے سوا کوئی تھا ہی نہیں۔ اور وہ بھی اپنی دنیا علیحدہ ہی بسائے ہوئے اور خود اسرار احمد میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جن کی تلاش ان کے ہونے والے سسر کو تھی۔ وہ ایک ہی کائیاں۔۔۔ انہوں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی پیسے والے آدمی تھے۔ جہیز کی تیاریاں ہاتھوں ہاتھ کروا ڈالیں۔ پیسے کے زور پر مہینوں کا کام دنوں میں کرایا۔ ادھر اسرار احمد بھی کھاتے پیتے انسان تھے۔ چنانچہ ایک ماہ کے اندر اندر ان کی اور نائمہ بیگم کی خوب دھوم دھام سے شادی ہو گئی اور نائمہ کے والد نے سکھ کا سانس لیا۔

اور پھر بہت جلد ان کے سارے منصوبے پورے ہو گئے۔

نائمہ کی شادی کے بعد ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کی بیٹی شادی کے بعد بھی ان کے پاس ہی رہے۔

لیکن اسرار احمد بے حد غیور اور ناک والے مرد تھے۔ وہ گھر داماد رہنے پر تو تا زندگی بھی تیار نہ ہوتے۔ اس لئے ان کے سسر نے کھل کر تو انہیں گھر داماد بنانے کا اظہار نہیں کیا مگر چکری کچھ ایسی چلائی کہ شادی کے تین ماہ کے اندر ہی اسرار احمد بیوی سمیت سسرال کے قریب آن بسے۔ سسر کو اتنا ہی کافی تھا۔ جانتے تھے کہ داماد ایک خوددار شخص ہے۔ اس لئے چپکے خاص سسرال کے گھر میں رہائش اختیار نہ کی تو کم از کم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی محلے میں تو گھر لے لیا تھا۔

شادی کے کئی برس تک تو ان کے ہاں اولاد ہی نہ ہوئی۔ اسی دوران نائمہ بیگم کے والد کا انتقال ہو گیا مگر اسرار احمد نے اپنی رہائش تبدیل نہ کی۔ گھر بدل کر انہیں کیا لینا تھا۔ وہ سلجھی ہوئی طبیعت کے امن پسند انسان تھے۔ سسرالی عزیزوں سے کبھی ان کی ان بن ہوئی نہیں تھی۔ وہ تو نائمہ بیگم جیسے جھاڑ کے کانٹے کے ساتھ بھی نہایت خوبی کے ساتھ نباہ کر رہے تھے۔ یہاں سے ان کا دفتر بھی قریب پڑتا تھا۔ اس لئے انہوں نے کبھی رہائش بدلنے کی بابت سوچا تک نہیں۔

سسرالی عزیزوں سے ان کا تو کیا جھگڑا ہوتا، نائمہ بیگم ہی ہر کسی سے لڑ آتیں اور جلد ہی دوبارہ شیر و شکر بھی ہو جاتیں۔

یہاں سب ان کے اپنے ہی خونی رشتے تھے۔ ماں باپ کا آبائی گھر، اسی میں ان کے بھائی بھی اپنے کنبے سمیت رہتے تھے۔ کئی ایک خالہ زاد بہنیں بھی اسی محلے میں بیاہی تھیں۔ اس لئے ہر وقت ہی شور و غل، رونق، آنا جانا اور چہل پہل رہتی تھی۔ نائمہ بیگم سسرال اور سسرالی رشتوں سے نا آشنا ہی رہیں۔ وہی اپنی خالہ زاد بہنوں کے ساتھ مل کر ہر جگہ کا آنا جانا۔ من مانی کرنا --- جو جی میں آیا کیا --- جیسا چاہا پکایا --- وہ ہر بندش اور رکاوٹ سے آزاد رہتی تھیں۔ اسرار احمد ہر طرح ان کے کنٹرول میں تھے۔

لیکن اک اولاد کے نہ ہونے نے دونوں کے غم کو غم مشترک بنا رکھا تھا۔ جلد ہی علاج اور دوا دارو کا آغاز ہو گیا۔ جس نے جو بتایا انہوں نے کر ڈالا۔ مگر گود ہری ہونے کے آثار پیدا نہ ہوئے۔

یہ کمی نائمہ بیگم کے لئے بہت بڑا تازیانہ تھی۔ اس محرومی نے ان کو معلوم نہیں کہاں کہاں کی خاک چھنوا دی۔ دعا تعویذ سے دوا علاج تک مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

بالآخر کسی کے کہنے پر اسرار احمد نہ جانے کیسے بیوی کو لے کر اجمیر شریف جا پہنچے۔

دونوں نے گڑگڑا کر منت مانی اور قدرت نے ان کی یوں سن لی کہ اسی برس ان کے ہاں مشکبار نے جنم لیا۔ جسے سوا مہینے نہاتے ہی یہ دونوں انتہائی احترام اور عقیدت کے ساتھ نہلا دھلا کر اجمیر شریف لے کر گئے۔ زیارت کرائی اور جتنا ہو سکا وہاں لنگر پکوا کر تقسیم کیا فقراء میں حیثیت کے مطابق خیرات دی۔

اس طرح بیشمار منت مرادوں کے ساتھ اور دعاؤں کے بعد مشکبار نے اس گھرانے میں قدم رکھا۔ اس کے بعد قدرت ایسی مہربان ہوئی کہ یکے بعد دیگرے دو بیٹوں سے بھی نوازا --- گو مشکبار اور شمشاد کے درمیان خاصا لمبا عرصہ حائل تھا مگر قدرت نے اسرار احمد کی انکساری کو انعام دے ڈالے تھے۔

مشکبار کی اس کے اپنے گھر میں جو آؤ بھگت تھی وہ تو تھی ہی، لیکن چچا نثار احمد کے ہاں تو ہر طرف اسی کا راج تھا چچا کے چار بیٹے ہی بیٹے تھے۔ ان کا بھرا بھرا آنگن بیٹی کا وجود نہ ہونے سے تنہا تنہا لگتا تھا اور اس کمی کو مشکبار کے چہکتے مہکتے وجود نے پر کر دیا تھا۔

چاروں لڑکوں سمیت، چچا چچی کو اس شریر سی لڑکی سے والہانہ محبت تھی اگر چچا کا بس چلتا تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے ہاں سے نہ جانے دیتے۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ مشکبار بھائی کے ہاں بھی اکلوتی بچی تھی۔ تاہم وہ ہفتے عشرے میں ایک دو مرتبہ محض بھتیجی کی وجہ سے ہی بھائی کے ہاں ضرور چکر لگا آتے۔ گو نائمہ بیگم نے شروع سے ہی دیور کو رد کر ڈالا تھا۔ اور جاتے اپنے کن تعصب پسند خیالات کے تحت پسند نہیں کرتی تھیں۔ دیورانی اور بھتیجوں کو تو انہوں نے کبھی منہ لگانا پسند ہی نہیں کیا تھا۔ مشکبار کا بار بار چچا کے ہاں جانا بھی انہیں ناگوار خاطر گزرتا تھا مگر ان دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ چھٹی کے دن اسرار احمد ان کی پروا کئے بغیر ننھی مشکبار کی انگلی تھامے صبح صبح بھائی کے گھر جا پہنچتے۔ یہ ان کا برسوں کا معمول تھا۔

مشکبار کا بچپن اتنا سہانا اور یادگار گزرا تھا کہ خوش نصیب بچوں کا ہی گزرتا ہو گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دلشاد اور شمشاد کی پیدائش کے بعد نائمہ بیگم اس کی طرف سے خاصی غافل ہو چکی تھیں مگر اور سب کی بیشمار محبتیں اور چاہتیں صرف اور صرف -- اس کے لئے مخصوص تھیں۔ اس لئے بچپن میں اس نے کبھی نائمہ بیگم کے رویے کو محسوس تک کرنے کی کوشش نہ کی۔

نائمہ بیگم کا میکہ خوب نت نئے رنگ کے بچوں سے آباد تھا۔ ان کے بھائی کے تین چار بچے، پھر خالہ زاد بہنوں کے درجنوں بچے۔ چنانچہ اس طرف سے تو مشکبار کو کچھ ایسی بھرپور توجہ نہیں مل پائی تھی۔ مگر اپنے باپ، چچا اور ان کے گھرانے کی تمام تر محبتیں اور عنایات اسی کے لئے مخصوص تھیں۔ وہ چچا کے چاروں بیٹوں سے چھوٹی تھی۔ جب وہ ان کے ہاں آتی تو یہ چاروں ہی اس کے دم پر فدا رہتے۔ جو فرمائش اس کے منہ سے نکلتی، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر پوری کرنے کی فکر میں رہتے۔ وہاں جا کر وہ بھی ہر ہر بات میں سینکڑوں کیڑے نکالتی۔ خوب نخرے کرتی اور اپنے ناز اٹھواتی تھی۔ جس جس طرف وہ جاتی، چچا چچی کی محبت بھری نگاہیں اس پر نثار رہتیں۔

بچپن میں وہ بھی حد سے زیادہ ہی شوخ و چنچل تھی۔

چچا کے سارے گھر میں اودھم مچائے رکھتی۔ ایک منٹ بھی نچلی بیٹھنا اس کے مذہب میں ناممکن تھا۔

مارے محبت اور چاہت کے اسرار احمد نے بچپن ہی میں اسے بہت سا زیور بنوا کر دیا ہوا تھا۔ جسے یہ ننھی لڑکی اکثر بے حد شوق سے لادے بھی رکھتی۔ سب نے اسرار احمد کو منع کیا تھا کہ ذرا سی بچی ہے۔ خدانخواستہ زیور کے ہاتھوں کسی کی نیت نہ بگڑ جائے۔ لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے۔

"ارے بھئی! میری مشکبار کو نہ کبھی غیروں میں آتی جاتی ہے۔ سب اپنے ہی ہیں۔ کس کی نیت بگڑے گی اتنے سے زیور پر ---"

اور وہ تھی کہ ہر وقت کڑے، چھڑے اور جھانجنیں بجاتی کودتی پھاندتی پھرتی۔ نائمہ بیگم اس کی شرارتوں اور شوخیوں پر چلا چلا پڑتیں۔ ایک سانس میں ہزار صلوٰتیں اور سینکڑوں کوسنے دے ڈالتیں مگر مشکبار کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ اس کان سنتی اس کان اڑا دیتی اور اپنے آپ میں مگن رہتی۔

دوسرے بچوں کی نسبت نانی بھی اسے بہت چاہتی تھیں۔ وہ روزے نماز کی پابند ایک بے حد پرہیزگار اور نیک بی بی تھیں جو کسی طرف سے بھی نائمہ بیگم کی ماں تو لگتی ہی نہ تھیں۔ بچپن میں نماز وغیرہ مشکبار کو سکھائی بھی انہوں نے تھی۔ ہر وقت اسے قریب بٹھا کر اچھے اچھے قصے اور نصیحت آموز باتیں کرتی تھیں مگر جہاں کسی شرارت پر نائمہ بیگم اس پر چلاتیں یا مارنے کو دوڑتیں، نانی جان تن کر اس کی حمایت میں کھڑی ہو جاتی تھیں۔

اسی بچپن کے یادگار دنوں میں مشکبار کی سب میں بہترین یاد اس کی نانی اماں، ابا، چچا چچی اور ان کے بچے تھے۔

مشکبار کی بوٹی بوٹی میں شرارت بھری تھی۔ چچا کے ہاں جب بھی جاتی، گرمی کی گرم اور انگارے برساتی دوپہریا میں بھی چچی کی لاکھ احتیاطوں کے باوجود چڑیلوں کی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتی، اور باغ میں پہنچ کر پیڑ پیڑ کو تاکنا جھانکنا ضروری سمجھتی۔ بچپن میں امرود اس کی پسندیدہ ترین چیز تھے۔ مگر کھانے میں ایک جدت -- باغ میں امرودوں کے جتنے بھی نیچے نیچے درخت ہوتے، یہ شاخوں کو ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر جھکاتی اور آدھا امرود کھاتی، آدھا ڈالی ہی میں لگا رہنے دیتی۔ یہ اس کی مخصوص چوری تھی اور اس کی یہ چوری سب تاڑ چکے تھے۔ ادھر چچا کا باغ سے گزر ہوتا اور آدھے کھائے امرودوں کو دیکھ دیکھ کر وہ چلا اٹھتے۔

"ارے چوہیا اپنا داؤں چلا گئی --- پورا امرود بھی تو نہیں کھاتی یہ چوہیا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ پیار میں "چوہیا" ہی کہا کرتے تھے۔ شام کو آکر چچا کان اینٹھتے تو وہ ہنس ہنس کر چچی کے پیچھے چھپنے لگتی۔

گوکہ دونوں بھائیوں نے کبھی اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال نہیں کیا تھا مگر نثار احمد کے دل میں ہمیشہ یہی خواہش جاگزیں رہتی تھی کہ بڑے ہونے پر وہ اپنے کسی بھی بیٹے کے لئے بھائی سے مشکبار کو مانگ لیں گے۔

یوں تو اسرار احمد کو شمشاد اور دلشاد بھی جان سے زیادہ عزیز تھے مگر بیٹی ان کی سانس بنی ہوئی تھی۔ حد یہ تھی کہ ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہونے کے باوجود بھی کہیں نمائش یا میلہ لگتا تو مشکبار کی فرمائش پر وہ سب سے پہلے اسے لے کر جاتے اور اس خیال سے کہ بچی تھک نہ جائے، سارا میلہ اسے اپنے کندھے پر سوار کئے کئے دکھلاتے۔ دیکھنے والے چھیڑتے بھی اور رشک بھی کرتے۔

مگر---نائمہ بیگم ان چاؤ چونچلوں پر جل جل کر کوئلہ ہو جاتیں اور سو سو باتیں سناتیں لیکن اس سلسلے میں اسرار احمد نے ان کی کبھی نہیں سنی تھی۔

باپ کی شہ پر مشکبار بھی ماں کو خاطر میں نہ لاتی، کاش! اسے معلوم ہوتا کہ یہ وقت مختصر ہے؟ تو شاید وہ باپ سے کبھی اتنے لاڈ ہی نہ اٹھواتی۔

ماں کی اسے سب میں بری عادت یہ لگتی تھی کہ اس کے اچھے اچھے کپڑے اور چنریاں بھی اٹھا کر بڑی فراخ دلی سے اپنے بھائی کی لڑکیوں اور خالہ زاد بہنوں کے بچوں میں بانٹ دیتی تھیں۔ ان کے رشتے دار بہنوں کے مالی حالات اچھے نہ تھے اور ادھر نائمہ کی سی شاہ دل اور کنبہ پرور بہن---اسرار احمد کے لائے ہوئے فروٹ، مٹھائیاں، بچوں کے کھلونے، چیزیں، کپڑے ہر چیز اٹھائی اور ان کے بچوں میں تقسیم کر دی۔

مشکبار کو ان کے لینے دینے پر اعتراض نہیں ہوتا تھا مگر جہاں نائمہ بیگم نے اس کا کوئی دوپٹہ یا کپڑا اٹھایا اور اس نے ہنگامہ بپا کیا۔ مشکبار اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کے بہنوں

کے بچے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور ہر وقت اسے پہنے اوڑھے دیکھ کر سب لڑکیاں جلتیں اور حسد کرتی ہیں مگر نائمہ بیگم کو ان باتوں کی کہاں پروا تھی--

بہر حال---مشکبار کا بچپنا بھی لیل و نہار میں گزرا---اس کی آنکھ کا ایک آنسو باپ کے دل کا ناسور بن جاتا تھا---چچا چچی کے آنکھوں کا قرار تھی---اتنے سارے محبت کرنے والے تھے اور پھر وہ کیوں نہ اتراتی۔

مگر وہ یادگار دن بہت جلدی بیت گئے۔ ایک ایسی آفت اس پر ٹوٹی کہ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور پھر دھیرے دھیرے ہر سہارا چھوٹ گیا۔

مشکبار کو وہ پر آزمائش دن اچھی طرح یاد تھے۔ جب اچانک ہی اسرار احمد بیمار ہو گئے تھے۔ دور و نزدیک ہر حکیم وید نے جواب دے دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسرار احمد کے سرکاری محکمے کے انگریز ڈاکٹر نے بھی گھر میں آرام کرنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا تھا۔

تب ہار کر نثار احمد کے گاؤں کا ایک پرانا حکیم علاج کے لئے لایا گیا۔ صبح صبح کا وقت تھا حکیم جی نے تالاب پر جمی ہوئی کائی لانے کو کہا۔ قریب کھڑی مشکبار تیر کی طرح بھاگی۔ حالانکہ اسے کائی گھن آتی تھی تاہم وہ ہری ہری کائی کاغذ میں سمیٹے دروازے میں بھاگتی ہوئی داخل ہوئی ہی تھی کہ---دفعتاً نائمہ بیگم ہری اور سرخ کانچ کی چوڑیاں اس کے قدموں میں آگریں اور بہت سارے ننھے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کانچ کی جھل مل جھل مل کرتی ہوئی چوڑیاں۔۔۔۔

جو سہاگ کی اول نشانی ہوتی ہیں۔۔۔ وہ مشرقی عورت کے احساسات میں سرخوشی اور سرمستی کے پھول اگاتی ہیں۔۔۔ نئے نویلے اور روپہلے خوابوں کو جگاتی ہیں۔

کانچ کی وہی کھنکھناتی ہوئی چوڑیاں مشکبار کے قدموں میں ریزہ ریزہ پڑی ہوئی تھیں۔ ہر ریزہ بلک بلک کر اسے آنے والی منحوس اور تاریک گھڑی کا سندیسہ دے رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔۔۔ یوں جیسے پسلیاں پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

رسم و رواج کے پابند گھرانے کی ایک مشرقی لڑکی ہونے کے ناتے اس کا حساس دل کسی اندوہناک سانحہ کے خیال سے بیٹھنے لگا۔

وہ اچھی طرح پہچان گئی تھی کہ یہ سنہری کام والی چمکتی ہوئی نئی چوڑیاں امی کے سوا کسی کی بھی نہیں تھیں۔۔۔ ابھی چند دن پہلے تو سنہری ان کی کلائیوں میں سج کر گئی تھی!

اس کے پیروں میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ وحشی ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتی کمرے کی طرف بھاگی۔

سب سے پہلے اس کی نگاہ نثار چچا کے بڑے لڑکے شفیق پر پڑی جو دونوں آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہوا اسرار احمد کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

"بھائی جان...... بھائی جان کیا ہو گیا؟ کیا ہو گیا بھائی جان!" وہ بری طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

اسے قریب دیکھ کر شفیق کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ مگر وہ اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا اور اس کی کمزور سی گرفت سے آزاد ہو کر آگے بڑھ گیا۔

مشکبار کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کمرے کے اندر جائے۔ اماں کے بین کرنے کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

"ابا۔ میرے پیارے ابا......!"

اس نے انتہائی بیکسی و بے بسی کے عالم میں وحشت برساتے در و دیوار کی طرف دیکھا۔

گھر کا ہر گوشہ، ہر کونہ، ہر ذرہ اور ہر شے نوحہ کناں تھی۔

"آہ! کیسا وقت آن پڑا تھا ذرا سی عمر میں! باپ جیسی مشفق و مہربان ہستی . . .

"نہیں۔ ایسا کیسے ممکن ہے......!!"

اس کے پاؤں میں یک دم چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور وہ کمرے کے اندر گرتے گرتے بچی۔

یہاں کا منظر ہی بدل چکا تھا۔

اماں زمین پر پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔

حکیم جی سر جھکائے پلنگ کے قریب کھڑے تھے۔

اسرار احمد کی دونوں آنکھیں بند اور گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ ہر دم شگفتہ اور مسکراتا رہنے والا چہرہ موت کے زرد ہاتھوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

پائنتی کی طرف کھڑے نثار احمد زار و قطار روئے جا رہے تھے۔

فضائیں دم بخود تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماحول سوگوار تھا۔

مشکبار بالکل ہی حواس باختہ ہو کر پاگلوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکنے لگی۔

یہ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا تھا؟

وہ تو چند ثانیے قبل جو بڑے کاکی لینے گئی تھی۔

اسے صرف اتنا علم تھا کہ اس کے جان سے پیارے ابا بہت دنوں سے بیمار تھے۔ ہر طرف کا علاج کروا کروا کر سب مایوس ہو چکے تھے۔ مگر افاقہ نہ ہوتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ پچھلے کئی روز سے اسرار احمد کا پیشاب بھی بند ہو گیا تھا۔ آخری علاج کے طور پر گاؤں کے حکیم جی نے جو بڑ پر جمی رہنے والی کائی منگوائی تھی جو بطور دوا ان کی ناف پر رکھی جاتی۔

مگر ظالم اور سفاک موت کے جبڑوں نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔

آخری وقت میں انہوں نے مشکبار کو بار بار پکارا تھا۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہ تھی۔ وقت بہت کم تھا۔۔۔انتظار کے لمحے بے حد طویل لمحے۔۔۔انہوں نے چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھامے تھامے اور دلشاد و شمشاد کی طرف ٹکٹکی لگائے لگائے دو دفعہ زیر لب کلمہ طیبہ کا ورد کیا، ہر طرف حسرت زدہ نگاہیں دوڑائیں اور پھر ہمیشہ کے لئے ہر احساس سے غافل ہو گئے۔

آخری ہچکی نے آگے بڑھ کر انہیں ہر کسی سے چھین لیا۔

مشکبار کے ہاتھوں سے وہ کاغذ کی پڑیا، جس میں کائی لپٹی ہوئی تھی، چھوٹ کر کمرے کے کچے فرش پر بکھر گئی اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لمحات ایسے جابر اور سخت تھے کہ کسی نے اس کے رونے پر دھیان بھی نہیں دیا۔ نہ اس کے آنسو پونچھے۔ سب کو اپنا اپنا رشتہ عزیز تھا۔

وہ اکیلی ہی روتی رہی۔ اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ کسی صورت باپ کے نزدیک پہنچ جاتی اور ان کو موت کی آغوش میں سوئے ہوئے قریب سے دیکھ لیتی۔

سب سے پہلے چچا نثار احمد کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

انہوں نے دوڑ کر اسے کلیجے سے چمٹا لیا اور اسے خاموش کروانے کے بجائے خود بھی زار و قطار روتے رہے۔ چچا بھتیجی کا دکھ مشترک تھا۔ دونوں کا درد ایک جیسا تھا۔ مرنے والی ہستی اگر مشکبار کی باپ تھی، تو نثار احمد بھی ان گھڑیوں میں اپنے آپ کو بن باپ کا ایک یتیم بچہ تصور کر رہے تھے۔

اسرار احمد نے ہمیشہ ان کے ساتھ ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ روا رکھا تھا کہ ان کو بڑے بھائی کی موجودگی میں کبھی ماں باپ سے محرومی کا خیال نہ آیا تھا۔ گو کہ اسرار احمد شادی کے بعد سے اپنی سسرال میں رہے تھے اور نائمہ بیگم کے کنٹرول اور میکے ہی میں رہنے کے زعم میں دب کر یہ خاصا ممکن تھا کہ وہ چھوٹے بھائی سے بالکل ہی غافل ہو جاتے مگر در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ دونوں بھائیوں کے دل ہمیشہ آپس میں شیر و شکر رہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسرار احمد کے انتقال کے بعد ان کا گھر پہلے کی نسبت زیادہ ویران اور سنسان نظر آتا۔ کیونکہ اس گھر میں ان کے تین بچوں کے علاوہ صرف نائمہ بیگم ہی کے دم قدم سے رونق تھی لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ ان کے انتقال کے بعد سے ایک تہذہ بھی اور شور و غل کا سماں سا بندھ گیا۔

ایک آ رہا ہے تو دوسرا جا رہا ہے۔ ایک طرف درجنوں بچوں نے شور مچا رکھا ہے۔ دوسری جانب عورتوں کی کھچر پھچر جاری ہے۔ پان پہ پان چلے آ رہے ہیں۔ مردانے میں چوسے کے خوان چن رہے ہیں۔ پانوں کے بیڑے پہ بیڑے بن بن کر جا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں "گڑ دی روٹی" کے بعد سے گھر میں برابر چولہا جلنے لگا تھا۔ ملازمہ کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساتھ چند ایک ہاتھ پیر ہلانے والی خواتین لگ جاتیں اور صاحب! ابھی ناشتے کی طشتریاں بجی ہیں تو ایک بجے تک دوپہر کا زرتراتا ہوا کھانا بھی تیار ہے جس کے فوراً بعد ہی رات کے کھانے کی تیاری بھی شروع ہو جاتی۔

اور یہ سب نائمہ بیگم کی چھوٹ اور تجاہلِ عارفانہ کا نتیجہ تھا۔

وہ سب کچھ کھلی آنکھوں دیکھ رہی تھیں۔ مگر دونوں ہاتھوں سے لٹا بھی رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے ارد گرد جمع ہونے والے سب انہی کے میکے والے تھے۔ بھائی بھاوج، ان کے بچے --- خالہ زاد بہنیں اور ان کے ڈھیروں بچے۔

اسرار احمد کا سوئم ہو گیا اور پھر دسواں --- بیسواں --- اور بالآخر چالیسواں بھی ہو گیا۔ دن خوشی کے ہوں یا غم کے --- بہر حال بیت ہی جاتے ہیں۔ کون سی گھڑی، ساعت تھمی رہ جاتی ہے۔ نائمہ بیگم نے چالیسواں بھی دل کھول کر کیا تھا۔ خاصی دور دور سے عزیز و اقارب اور ان کے دوست احباب مدعو کئے گئے تھے۔ ایک نہ تھے تو اسرار احمد نہ تھے!

نائمہ بیگم کا دکھ کاٹے نہ کٹتا تھا۔ اپنی سونی کلائیوں کی طرف دیکھتے دیکھتے ان پر رقت طاری ہو جاتی اور وہ بین کر کر کے دھاڑیں مارنے لگتیں۔ ان کو اس بات کا شدید احساس اور رنج تھا کہ ان کے دلپسند رنگوں کے خوشنما اور دیدہ زیب کپڑوں اور ریشم جھلملاتی ساریوں سے بکس بھرے کے بھرے رکھے تھے اور وہ کسی کپڑے کو ہاتھ لگانے کی مجاز نہ رہی تھیں۔ وہ جو ہر آٹھویں دسویں دن نئی چوڑیاں پہننا اور ہاتھوں پیروں میں مہندی رچانا فرض سمجھتی تھیں۔ بیوگی کا ... بے رنگ دوپٹہ اوڑھنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ وہ اس اچانک آپڑنے والی افتاد پر بلبلا اٹھیں اور ایسی حواس باختہ ہوئی تھیں کہ اپنے تینوں بچوں تک کو بھول چکی تھیں۔

سارا سارا دن انہیں مشکبار، دلشاد اور شمشاد کا خیال نہ آتا۔ انہوں نے کیا کھایا ہے

کیا کر رہے ہیں اور کہاں ہیں، وہ بے خبر و لاعلم رہتیں جبکہ کیفیت یہ تھی کہ ہمہ وقت مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے دلشاد اور شمشاد سہمے سہمے اور خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ اکثر مہمانوں کے لاڈلے اور منہ چڑھے بچے انہیں پکڑ کر پیٹ ڈالتے اور کوئی چھڑانے والا بھی نہ ہوتا --- عجیب حال سے بے خبر ہو رہے تھے۔ کبھی کسی رشتے کی خالہ نانی کو ترس آ گیا تو پکڑ کر منہ دھلا دیا یا نہلا کر کپڑے بدلوا دیئے ورنہ سارا سارا دن اسی گندی مندی حالت میں گھومتے رہتے۔

باقی بچی مشکبار --- تو اسے صحیح معنوں میں اپنے آپ کا ہوش نہ تھا۔ اس کے ہونٹ تو جیسے ہمیشہ کے لئے مسکرانا بھول گئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں کے کٹوروں میں مستقل طور پر ایک ایسی دل کو چیر ڈالنے والی کیفیت کے پڑاؤ نظر آتے تھے کہ اس کی محرومی اور مایوسی پر جی کٹنے لگتا۔ نائمہ بیگم وقفے وقفے سے بین کرتیں، سینہ کوبی کرتیں، اپنی ماں بہنوں سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مارتی رہتیں، مگر مشکبار کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ بہتا۔ یوں لگتا جیسے اس پر ایک جمود طاری ہو گیا ہے۔

ہاں --- بس جس روز بھی اس کی چچی گاؤں سے آ جاتیں تو وہ گھنٹوں ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہتی یا پھر ان کی ممتا بھری گود میں منہ چھپا کر پڑی رہتی اور سب کی آنکھوں سے چھپ کر جانے کتنے بیشمار آنسو بہا ڈالتی۔

اسرار احمد کا چالیسواں ہو گیا تھا لیکن آنے جانے والوں کا تانتا معمولی سی کمی کے ساتھ اسی طرح لگا رہتا۔

اس صورتحال پر سب سے زیادہ تشویش نثار احمد کو تھی۔

وہ کھلی آنکھوں یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ مگر وقت اس درجہ نازک اور حالات ایسے دردناک تھے کہ ان کا دخل دینا مناسب نہ تھا۔ خود وہ بھی بڑے بھائی کے یوں بچھڑ جانے سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ اس اچانک جدائی نے ان کے جگر میں ناسور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر ڈالے تھے۔ روح کو گھائل کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ان کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اس المیئے سے مہینوں بلکہ تمام عمر دل و دماغ خالی نہ کر پائیں گے کہ یہ صدمہ۔۔۔ ایسا ہی کڑا صدمہ تھا۔

ننھے ننھے یتیم بھتیجے بھتیجی کے منہ دیکھتے تو طبیعت پر اور بھی زیادہ وحشت اور گھبراہٹ غالب آنے لگتی اور وہ گھبرا کر بھائی کے گھر سے نکلتے تو جانے کہاں کہاں کی خاک چھان آتے۔ یا پھر اگر اپنے گاؤں چلے جاتے تو کئی کئی دن کے لئے اپنی بیٹھک میں محصور ہو جاتے اور گھنٹوں اپنے اور بڑے بھائی کے بچپن سے اب تک کے سارے زمانے کو دہراتے رہتے۔

سوئم، دسویں، بیسویں اور چالیسویں میں وہ باقاعدہ اپنے تمام بچوں سمیت شریک ہوئے تھے۔ ہر روز قبرستان جا کر خوانی اور کلام پاک کی تلاوت بھی ان کے معمولات میں شامل ہو گئی تھی۔

مرحوم بھائی کے گھر کے حالات ان کی آنکھوں سے مخفی نہیں تھے۔ وہ دل ہی دل میں بھاوج کے احمقانہ رویے اور کم عقلی پر کڑھتے رہتے۔ مگر پاس ادب سے ٹوکتے نہیں تھے۔ ان کی تجربہ کار نگاہوں نے ایک زمانہ دیکھ رکھا تھا وہ نائمہ بیگم کے گرد جمع رہنے والے خوشامدیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانتے تھے کہ یہ سب اس وقت تک ان کی خوشامد در آمد میں لگے رہیں گے جب تک کہ ان کے پاس چار پیسے ہیں۔ وقت پڑنے پر سگا خون بھی نظر پھیر جائے گا۔

اس کے علاوہ اسرار احمد اس وقت کے ایک سرکاری محکمے کے ملازم تھے۔ سب جانتے تھے کہ ان کی بیوہ کو ایک اچھی خاصی رقم ان کے محکمے سے ملتی۔ چنانچہ نائمہ بیگم حریص اور لالچی رشتے داروں کے لئے تر و تازہ نوالہ تھیں۔ ہر کوئی ہر وقت ان کی دلجوئی اور ہمدردی بٹورنے کی فکر میں رہتا۔

جب چالیسویں کی نیاز بھی ہو چکی، لیکن نائمہ بیگم کے ارد گرد سے بھیڑ کم نہ ہوئی

تو بحالت مجبوری نثار احمد نے بھاوج سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے سامنے اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

فطرتاً نثار احمد غصے کے تیز تھے۔ بے قاعدگی اور بے اصولا پن ان کے مزاج میں برہمی اور چڑ پیدا کر دیتا تھا۔ اب تک انہیں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید چالیسویں تک جب بھائی صاحب کا غم قدرے کم ہو جائے گا تو وہ سنبھل جائیں گی اور اپنے نہیں تو کم از کم اپنے یتیم بچوں کے غیر محفوظ مستقبل کے پیش نظر ان روز روز کی میہمانداریوں سے محتاط ہو جائیں گی۔

لیکن چالیسواں ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ گزر گیا مگر نائمہ بیگم کی آنکھوں پر پڑا غفلت کا پردہ نہ اٹھا۔

نثار احمد چڑ گئے۔

چنانچہ ایک دن ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ اپنی زمینوں کا چکر لگانے نکلے تو وہیں سے بھائی کے گھر کی طرف ہو لئے۔

نائمہ بیگم نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ کسلمندی سے بستر میں لیٹی کروٹیں بدل رہی تھیں۔ جب ملازمہ آ کر آگاہ کیا۔

''بیگم صاحب! چھوٹے میاں صاحب آئے ہیں۔ بیٹھک میں بٹھا کر آئی ہوں۔ جانے کیا کام ہے آپ کو بلوا رہے ہیں۔''

نائمہ بیگم کو سخت تعجب ہوا نثار احمد! اور ان کی بلائیں!! انہوں نے تو کبھی اشد ضرورت کے علاوہ ان سے کبھی کلام ہی نہیں کیا تھا۔۔۔!!

الٰہی خیر۔۔۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ورنہ نثار احمد کو ان سے کیا کام آ پڑا تھا۔ اب تو فاتحہ درود بھی سب ہو چکا تھا۔''

دفعتاً انہیں خیال گزرا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہیں پنشن کے سلسلے میں تو کوئی بات کرنے نہیں آئے؟

انہوں نے خود بخود بدگمان ہو کر گہری سانس کھینچی۔ چہرے پر نفرت و حقارت کے سائے لہرا گئے۔ دیور کی طرف سے دل میں جمی ہوئی کدورت آنکھوں میں غصہ بن کر سمٹ آئی اور وہ خود سے مخاطب ہو کر فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

"ٹھیک ہے میاں! تم بھی اپنی سی کر لو۔ دانتوں چنے نہ چبوا دیے تو میں بھی شمشیر علی خاں کی بیٹی نہیں۔۔۔ تم اس لئے اترا رہے ہو گے کہ مرنے والے کے حقیقی بھائی ہونے کے ناطے سرکار سے پنشن وصول کرنے میں مجھے فوراً تمہارا ہی سہارا لینا پڑے گا۔ مگر یاد رکھنا۔۔۔ ہنڈی بھی اس وقت تک ہی نرم رہے گی جب تک کہ پیسہ نہیں مل جاتا۔۔۔" وہ جی ہی جی میں خوب پکی ہو کر پلنگ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

نثار احمد بیٹھک میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

نائمہ بیگم غرارے کے پائنچے سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو انہوں نے ادب سے سلام کیا اور حقے کی نے ایک طرف کھسکا کر خاموش بیٹھ گئے۔

چند منٹ سکوت طاری رہا۔

نائمہ بیگم دیور کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں اور وہ کسی سوچ میں ڈوبے رہے۔ جیسے آغاز گفتگو کے لئے موزوں الفاظ کا انتخاب کر رہے ہوں۔

نائمہ بیگم نے ملازمہ کو بلا کر ناشتہ لانے کو کہا تو وہ چونکے اور سنبھل کر بولے۔

"نہیں۔۔۔ نہیں بھابی صاحب۔ ناشتے وغیرہ کا تکلف مت کیجئے۔ میں گھر سے ناشتہ کر کے چلا تھا۔ لیکن اگر آپ بضد ہیں تو صرف ایک پیالہ چائے منگوا لیجئے۔"

"آپ کی مرضی!" انہوں نے قدرے بے نیازی سے کہہ کر ملازمہ کو چائے لانے کا اشارہ کیا۔

پھر پہلو بدل کر بے چینی سے دریافت کر ہی بیٹھیں۔

"کیسے آنا ہوا؟ کیا کوئی خاص کام تھا!"

"کام کیا۔۔۔ بس یونہی ذرا چند معاملات پر آپ سے اظہار خیال کی نیت سے آ گیا۔"

"اچھا۔۔۔ وہ کیا معاملات ہیں ذرا میں بھی سنوں۔"

نائمہ بیگم سخت الجھن میں مبتلا تھیں کہ قصہ کیا ہے!

اب نثار احمد نے بھی تاخیر مناسب نہ سمجھی۔ بلا تمہید کہنے لگے۔

"قصہ یہ ہے بھابی صاحبہ کہ بھیا کے انتقال کو دو ماہ سے زیادہ ہونے کو ہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ہاں سے مہمانوں کا جم غفیر چھٹنے کا نام نہیں لے رہا۔ دو جاتے ہیں تو چار آ جاتے ہیں۔ خدانخواستہ ایسی بات نہیں ہے کہ میں مہمان نوازی کے خلاف ہوں۔ یا کسی کا آنا جانا پسند نہ کرتا ہوں۔ نہیں بخدا ایسی کوئی بات نہیں۔ دنیا میں ہر انسان اپنے مقدر کا رزق کھاتا ہے اور قدرت نے دانے دانے پر مہر رکھی ہوئی ہے۔ لیکن۔۔۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حد سے تجاوز کر جانے والا ہر امر بھی غلط ہوتا ہے۔۔۔ دنیا میں شادی بیاہ ہوتے ہیں۔ خوشیوں کے شادیانے بجتے ہیں، مگر وقت کے ساتھ ساتھ چاہے کیسی ہی عظیم خوشی ہو، ضرور ماند پڑ جاتی ہے۔ اثر کم ہو جاتا ہے اور بالآخر ہر کوئی اپنے معمول پر آ جاتا ہے۔۔۔ جبکہ۔۔۔ بھیا کی بے وقت موت تو ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اپنے اپنے رشتے ناتے کے لحاظ سے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اس سانحہ عظیم پر دنگ رہ گیا ہے صدمہ سبھی کو ہوا ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا بھابی صاحبہ! غم منانے کا یہ کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے۔ بھیا کے انتقال سے صحیح معنوں میں سب سے زیادہ نقصان تو آپ کا ہوا ہے۔ ہمارا ہوا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے ننھے منے تین بچوں کا ہوا ہے۔ جو اتنی ذرا سی عمر میں یتیمی کا داغ کھائے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اب ان کے بہتر مستقبل کے لئے سوچنا بھی تو ہمی کو ہے۔ مگر۔۔۔ صد افسوس کہ کسی کو اس انداز میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوچتا نہیں آتا۔ ہر ایک اپنے رنگ میں مست ہے۔ جبکہ ہر شعور والا شخص یہ دیکھ کر حیران ضرور ہے کہ موت والے گھر میں یہ مہمان داریاں کس نوعیت کی ہیں! ہاں غریب غرباء، یتیم مساکین کو کھلانا ثواب بھی ہے مگر یہ بنے کئے عزیز و اقارب کا ہر روز مدعو رہنا کہاں کی دانشمندی ہے ٹھیک ہے ہفتہ عشرہ ایسا ہو تو بھی ہے۔ مگر یہاں تو بھیا کا چالیسواں بھی ہو چکا۔ اب چار کا آنا، چار کا جانا غیر واجب ہے بہتر یہی ہے کہ آپ آنے جانے والوں پر پابندی لگائیں۔۔۔"

نائمہ بیگم جو اتنی دیر سے تیوری پر بل ڈالے دیور کا حقیقت پسندانہ لیکن خود اپنے تئیں کڑوا کسیلا اور طویل و عریض لیکچر سن رہی تھیں، بیچ کے بیچ بے صبری سے انہیں ٹوک بیٹھیں اور تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر بولیں۔

"میں۔۔۔۔۔۔ بندش لگا دوں! یہ کیا کہہ رہے ہو نثار احمد! کچھ ہوش کے ناخن لو۔ لو بھلا کہیں دنیا کا یہ بھی دستور ہے کہ گھر آئے مہمانوں کو آنے سے منع کر دیا جائے۔۔۔!! نہ بھیا نہ۔۔۔ میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی اور پھر میں سب کا آنا جانا غنیمت سمجھتی ہوں۔ بلا سے رونق تو رہتی ہے چار انسانوں کے دم سے ورنہ میں تو خاموش کھڑے کھڑے در و دیوار کو دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاؤں۔ خدا جنت نصیب کرے مرنے والے کے دم سے سب رونق تھی۔ اب اس گھر میں کیا رہا ہے۔"

"یہ کہتے کہتے ان کی نگاہیں اپنی سونی سونی بانہوں پر جم گئیں اور وہ آبدیدہ ہو کر دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کرنے لگیں۔

نثار احمد کے دل پر بھی چوٹ لگی۔ رنجیدہ ہو کر بولے۔" معافی چاہتا ہوں بھابی صاحبہ! میرا مقصد آپ کا دل دکھانا ہرگز نہ تھا۔ میں تو ہر صورت میں آپ کی بھلائی کا خواہاں ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کہیں خدانخواستہ مروت ہی مروت میں آپ ان بے جا قسم کی مہمان داریوں میں گھر کر کہیں مقروض وغیرہ ہی نہ ہو جائیں۔ آخر بھیا بے چارے

کی کونسی کوئی ایسی بڑی حیثیت تھی اور اب تو بھیا کے ساتھ ہی ماہانہ آمدنی کا ذریعہ بھی بند ہو گیا۔ جو کچھ آپ کو کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔"

نائمہ بیگم نے یکلخت تیور بدل گئے۔ بے چین ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا کہا تم نے۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی آمدنی کا ہر ذریعہ کیسے بند ہو گیا! میں تو ان کی بیوہ ہوں کیا ان کی پنشن کا روپیہ نہ وصول ہو گا مجھ کو!"

نثار احمد نے انتہائی صبر و تحمل سے جواب دیا۔ "وصول کیوں نہ ہو گا۔ اس رقم پر آپ کے اور تینوں بچوں کے سوا کسی دوسرے کا حق بھی نہیں ہے۔ آپ غلط مت سمجھئے۔ میرے کہنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ کو جو کچھ کرنا ہے بہت غور و فکر کے ساتھ کرنا ہے، کیونکہ فنڈ کا وہ روپیہ آپ کی آخری پونجی ہو گا۔ بچے ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں دلشاد شمشاد بھلا اس قابل کہاں کہ اس رقم سے کوئی کاروبار کر کے بیٹھ جائیں اور دال روٹی کا آسرا چلتا رہے۔ اس لئے اس رقم کا ایسا مصرف ہونا چاہئے کہ جس سے کم از کم آپ اپنے اخراجات کے لئے بھی پریشان نہ ہوں اور دوسری طرف بچوں کے تعلیمی اخراجات بھی پورے ہوتے رہیں۔ چنانچہ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ جب حسن اتفاق سے بھیا گورنمنٹ ملازم بھی تھے اور ان کی فنڈ کی رقم بھی ملنے کو ہے تو براہ کرم آپ لوگوں کے پھندے میں پھنس کر پیسہ برباد کرنے کی کوشش ہرگز مت کیجئے گا۔ میں پیش بندی کے طور پر ہی آپ سے یہ معاملہ عرض کرنے حاضر ہوا تھا کہ آپ ابھی سے لوگوں کی مہمان داریاں بند کر دیجئے۔"

نائمہ بیگم ایک جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ اس وقت انہیں دیور کا عندیہ بھی معلوم ہو گیا تھا اور یہ اطمینان بھی کہ فنڈ کی رقم وہی وصول کریں گی۔ گو کہ انہیں نثار احمد کی یہ حقیقت پسندانہ گفتگو پسند نہیں آئی جو وہ صاف صاف ان کے میکے والوں کے لئے کر رہے تھے مگر اس وقت، وقت اور حالات کی نزاکت کے تحت نرمی اور حلیمی برتنے پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجبور تھیں۔ جانتی تھیں کہ فنڈ کی رقم کے لئے دوڑ دھوپ بھی نثار احمد ہی کریں گے اور مرحوم کے حقیقی بھائی ہونے کے رشتے سے ان ہی کی کوشش اور ہمدردی..... بار آور ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے جھٹ سے اپنے انداز بدل لئے۔ پیشانی سے تیوریوں کے بل سیدھے کئے۔ چہرے پر بھولا پن اور خلوص طاری کیا اور بڑی بے چارگی کے عالم میں گویا ہوئیں۔

"---اس سلسلے میں میں خود بڑی پریشان ہوں بھیا! مگر کیا کر سکتی ہوں۔ گھر آئے ہوؤں کو کیسے منہ پھوڑ کر کہہ دوں کہ چلتے بنو--- یا مت آیا کرو--- کچھ نہ چاہنے کے باوجود جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے اور پھر کوئی عین کھانے کے وقت آن وارد ہوتا ہے کوئی ناشتے پر آموجود ہوتا ہے۔ ایسے میں جھوٹوں منہ بھی کہہ دو تو جھٹ سے دسترخوان پر جم جاتے ہیں۔ میں خود کئی روز سے فکر مند ہوں کہ کس طرح جان چھڑاؤں۔ اگر عدت کا زمانہ نہ ہوتا تو کچھ عرصے کے لئے آپ کے ہاں جا پڑتی--"

نثار احمد پرانے ٹائپ کے سادہ لوح انسان تھے۔ بھاوج کے منہ سے اپنے ہاں آنے کی سن کر خوشی اور حیرت سے اچھل پڑے--- نائمہ بیگم--- اور--- نثار احمد کے ہاں آنے کی ہامی بھریں!! ان کے تو کبھی دیور دیورانی کی طرف سے پیشانی کے بل نہ کھلے تھے--- کجا کہ اس درجہ عنایت!

نثار احمد کو یہی گمان گزرا کہ بے وقت شوہر کی جدائی اور انتقال نے بھاوج کا دل بالآخران کی طرف سے بھی نرم اور صاف کر ہی دیا۔

انہوں نے اطمینان اور سکون کا سکھ بھرا سانس لیا اور بڑی سچائی سے بولے۔
"ٹھیک ہے۔ سچ کہتی ہیں۔ کسی کو آنے جانے پر منہ کھول کر کہہ دینا بھی مناسب نہیں

معلوم ہوتا۔ یہ تو مزید معیوب بات ہو گی۔ ویسے میرا گھر ہر وقت آپ کے لئے اور بچوں کے لئے حاضر ہے۔ عدت کا زمانہ ساتھ خیریت کے گزر جائے تو ادھر ہی آ جایئے گا۔ شاید کچھ جی بہل جائے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ان بچوں کو ابھی ان کی چچی کے پاس بھیج دیجئے یہاں آپ کو زیادہ پریشان کرتے ہوں گے اور آپ کی طبیعت ویسے ہی پریشان ہے۔"

نائمہ بیگم کو ان کی یہ سیدھی سادی پیشکش بھی ناگوار گزری۔ خود ان کا اپنا دل کدورت سے بھرا ہوا تھا اس لئے گمان گزرا کہ وہ ان کی بچوں کی طرف سے بے پروائی اور لاتعلقی پر طنز کر رہے ہیں۔

مگر بروقت سنبھل گئیں اور اپنے اصل تاثرات چھپا کر بناوٹ سے جواب دیا۔
"اے نہیں---اب وہاں ان تینوں آفتوں کو کہاں بھیجتی پھروں گی۔ بھابی بے چاری پریشان ہوں گی پھر بچوں کے بغیر گھوڑ مارا میرا دل بھی نہ لگے گا۔ انہی کے دم سے وقت کاٹ رہی ہوں۔ بس آج کل تو اس فکر سے دبی جا رہی ہوں کہ یہ ہر روز کے آنے جانے والے مہمانوں سے کس صورت سے جان چھڑاؤں---سچ کہتی ہوں نثار احمد کہ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ گھر آئے کو اچھا کھانے کو نہ پوچھو تب بھی رسوائی--- منع کرو--- تب جگ ہنسائی--- میں تو سخت کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہوں۔ ہر روز نوٹ پر نوٹ بھنا رہی ہوں۔"

نثار احمد کڑھ کر رہ گئے۔ اسی بات کا صدمہ تو ان کو بھی تھا۔ تاہم بھاوج کی تسلی کو کھلے دل سے بولے۔ "ایسی کوئی مالی پریشانی ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔ خدانخواستہ یہ نہ ہو کہ میری لاعلمی میں آپ لوگ کسی مالی پریشانی میں مبتلا رہیں اور مجھے معلوم ہی نہ ہو۔ ورنہ پھر حشر کے روز بھیا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میری عاقبت نہ بگاڑنا بھابی۔"
مالی امداد کا سن کر نائمہ بیگم کی باچھیں کھل گئیں۔ دیور کو وہ جو جتانا چاہ رہی تھیں،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالآخر کامیاب ہو گئی تھیں۔

سوکھا سامنہ بنا کر بولیں۔ "نہیں -- خیر --- ویسے تو خدا کا لاکھ شکر ہے۔ ویسے - بڑا بول بھی نہیں بولتی -- خدانخواستہ --- دشمنوں کے کان بہرے۔ برا وقت پڑا تو تمہارے در پر نہ جاؤں گی تو پھر کہاں جاؤں گی! آخر کو یہ معصوم بچے تمہارا ہی خون ہیں۔"

نثار احمد بے حد متاثر ہو کر بولے۔ "میں اور میری چاروں اولادیں جان و دل سے حاضر رہیں گے آپ بے فکر رہئے۔"

نائمہ بیگم ذرا بن کر بولیں۔ "اے بھیا! ذرا کوئی ترکیب ہی بتاؤ ان آفت مارے مہمانوں سے جان چھڑانے کی -- میں تو بیزار بیٹھی ہوں۔"

نثار احمد نے ایک ثانیے غور کیا پھر قدرے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ترکیب کیا ہو سکتی ہے! بس یہی کیجئے کہ ذرا حتی الامکان سب سے رکھائی سے پیش آیئے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کے آگے بچھے جایئے۔ آپ کی طبیعت یوں بھی بھیا کے بعد سے درست نہیں رہتی۔ کسی سے بھی زیادہ بولئے مت۔ جب زیادہ قابل توجہ نہیں جانیں گی تو خود بخود بھی بیزار ہو جائیں گے اور کوفت محسوس کرنے لگیں گے۔ دوسری ایک اہم بات یہ کہ از خود کسی کو کھانے یا ناشتے پر بھی روکئے ہی مت۔ اگر بہت ہی ضروری ہے تو چائے یا پان شربت سے تواضع کر دیجئے۔ اگر یہ ہوتا ہے کہ عین کھانے یا ناشتے کے وقت آموجود ہوتا ہے تو جو کچھ دسترخوان پر میسر ہے۔ اسی میں شامل کر لیجئے بطور خاص کچھ اہتمام کیجئے ہی مت۔ بس آپ کا رویہ خود بخود راستہ صاف کر بتلائے گا۔"

نثار احمد نے انہیں بھاوج سمجھ کر چند سیدھی سی باتیں انہیں ذہن نشین کروائیں۔ مگر وہ دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

"کس قدر چالاک اور فتنے ہیں یہ نثار احمد -- میرے رشتہ داروں کی طرف سے ان کے دل میں کتنی کدورت اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ خیر --- ذرا میرا کام نکل جائے پھر ان کا کانٹا بھی عمر بھر کے لئے نکالنا ہی پڑے گا۔ ان کا توڑ مجھ ہی کو کرنا پڑے گا۔"

مگر منہ میں گڑ بھر کر ملائمت سے بولیں۔

"ہاں تم نے سچ کہا۔ اب ذرا سب سے بے رخی برت کر دیکھوں گی۔ اس طرح سے تو یہ لوگ باز آنے والوں میں سے نظر آتے نہیں۔"

نثار احمد چائے کا پیالہ خالی کر چکے تھے۔ نائمہ بیگم نے اپنا بھاری بھرکم پاندان وہیں منگوا کر بطور خاص اپنے ہاتھ سے انہیں پان بنا کر پیش کیا۔

نثار احمد نے قاعدے کے مطابق سلام کر کے گلوری کلے میں دبا لی۔

اس لچھے دار گفتگو کے بعد نائمہ بیگم نے انتہائی ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ اپنا پسندیدہ اور ضروری ترین موضوع چھیڑ دیا۔

یعنی اسرار احمد کے فنڈ کی جمع شدہ رقم کی وصولیابی اور اس سلسلے میں حائل شدہ دشواری تھی، دیور سے اس پر اطمینان بخش گفتگو کی۔ اور بار بار اپنی موجودہ پریشانی اور مسائل کا حوالہ دے دے کر ان کا دل موم کرتی رہیں تاکہ وہ اس سلسلے میں جلد از جلد بھاگ دوڑ شروع کر دیں۔

نثار احمد ان کے ہاں سے رخصت ہوئے تو دل و دماغ پر ایک گونہ اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا۔

جس دن سے اسرار احمد کا انتقال ہوا تھا انہیں ایک پل قرار نہ تھا۔ بھائی سے مستقل جدائی کا صدمہ تو اپنے مقام پر اٹل تھا ہی، مگر اپنی بھاوج کے مزاج کو جانتے ہوئے انہیں ہر وقت یہ کھٹک ستاتی رہتی تھی کہ اب کیا ہوگا؟ انہیں پختہ یقین تھا کہ نائمہ بیگم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہر صورت میں مشکبار، دلشاد اور شمشاد کو ان سے چھڑوا کر دم لیں گی۔ ان کی چھٹی حس ان کو بار بار تنبیہ کرتی تھی کہ نثار! یاد رکھو! بھائی کے ساتھ بھتیجے بھی چھوٹ گئے --- اور تم جو مشکبار کو بہو بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے تو اس کی تعبیر اب اسرار احمد کے ہاتھوں سے نکل کر، فقط نائمہ بیگم کی "ہاں"، "نا" تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

مگر ہوا یہ کہ رب تعالیٰ نے نہایت آسانی سے ان کے مسائل حل کر ڈالے تھے اور نائمہ بیگم کا دل ان کی طرف سے انہیں آئینے کی طرح شفاف نظر آیا تھا۔

آج بھاوج سے رو برو بات چیت کرنے کے بعد ان کے دل و دماغ میں رینگنے والے سارے اندیشے از خود بے بنیاد ہو گئے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اپنی زمینوں کی طرف جانے والے راستے تک آ گئے اور پر سکون سوچوں میں غلطاں سست قدموں سے ایک ہری بھری پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

آج بہت سارے جلتے جھلستے دنوں کے بعد یہ قدرے آسودہ سی گھڑیاں ان کے ارد گرد آن کھڑی ہوئی تھیں اور وہ ان کے پل پل سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ بار بار خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ آج ان کی روح میں گڑا کانٹا نکل گیا تھا۔ اور بھتیجی بھتیجیوں کی طرف سے قدرے سکون نصیب ہوا تھا ورنہ وہ اب تک جانے کیا کیا سوچ کرتے تھے۔

گھر پہنچتے پہنچتے بالآخر وہ پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ اب وہ کل سے اسرار احمد کی رہائی کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے اور پوری دیانت داری کے ساتھ بیوہ بھاوج کا ساتھ دیں گے۔

پھر یہی ہوا بھی ---

نثار احمد نے اگلے روز سے ہی تندہی، قمر کے لئے کوشش شروع کر دی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت دھیمے دھیمے سست رفتاری سے گزرتا گیا۔

اچانک ایک زبردست دھماکا ہوا۔

دھماکا بھی ایسا کہ جس کسی نے بھی سنا، حیرانگی سے دانتوں تلے انگلیاں داب کر رہ گیا۔ بہت سوں کو تو یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

جس نے بھی سنا، بے ساختہ کہا "کمال کر دیا نائمہ بیگم نے ---"

"غضب ہو گیا --- ایسا تو کہیں دیکھا نہ سنا ---"

مگر خود نائمہ بیگم کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ انہوں نے انتہائی بے پروائی سے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ انہیں بھلا کس کی پروا تھی!! اگر پروا ہوتی تو عقلمند اور سمجھ دار ہوتے ہوئے ایسی اندھی اور غیر واجب حرکت ہی کیوں کر گزرتیں!!

لیکن --- درحقیقت یہ بھی نائمہ بیگم کی سیمابی فطرت کا ایک معمولی سا کرشمہ تھا۔ اور وہ ظاہر ہے کہ اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔

انہیں خرچ کی یوں بھی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ اسرار احمد اپنے وقت کے ایک آسودہ حال شخص تھے گھر میں ہر طرح خوشحالی تھی، انہیں کچھ ایسی الجھن سی رہتی تھی کہ سال سال بھر کا اناج، غلہ، دالیں اور دھان وغیرہ اپنے بھائی سے ہر فصل پر خرید کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھر میں جمع کر دیتے ان کا اسٹور ہر وقت ضرورت کی ہر شے سے بھرا رہتا۔

ماہانہ آمدنی کے علاوہ انہوں نے نثار احمد کے اصرار پر دو آموں کے باغ بھی ایک دفعہ خرید ڈالے تھے۔ ان کی سالانہ آمدنی بھی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔

خود نائمہ بیگم کے پاس تو عمدہ عمدہ کپڑے لتوں کے علاوہ کئی تولے سونے کے زیورات اور چاندی تو شاید سیر دل کے حساب سے تھی کیونکہ یہ زیورات انہیں شادی کے موقع پر میکے اور سسرال دونوں اطراف سے چڑھے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ مشکبار تک کو اسرار احمد نے کئی بھاری بھاری زیور بنوا کر دے رکھے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے مالی حالات بہت مستحکم اور مضبوط تھے اچھا وقت تھا اور سستا زمانہ --- نائمہ بیگم اگر سگھڑاپے سے چلتیں اور کچھ دور اندیشی سے کام لیتیں تو یقیناً ان کی ساکھ بھی نہ بگڑتی اور بچے بھی آرام سے پرورش پا جاتے---

لیکن اگر عورت فطری طور سے ہی ناعاقبت اندیش ہو تو کیا کیا جائے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ نائمہ بیگم انتہائی شوقین مزاج، ملنسار اور گھومنے پھرنے کی رسیا تھیں۔ اسرار احمد کی زندگی سے ہی ان کا معمول تھا کہ اپنی چند خاص قسم کی سہیلیوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومنا نمائش اور میلوں ٹھیلوں کی سیر کرنا ان کا سب سے بڑا شوق تھا، بزرگوں کے عرس میں شریک ہونا، قوالیاں سننا اور سر دھننا ان کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ لکھنؤ کا کوئی عرس ان کی شمولیت سے خالی نہ رہتا تھا۔

چونکہ شادی کے بعد سسرال وغیرہ میں رہنا اور وہاں کی بندشوں یا اصولوں کی پابندی کرنا ان کے حصے میں نہیں آئی تھی، اوپر سے اسرار احمد کا نرم اور ملائم رویہ۔ چنانچہ ان کی عادت میں شامل فطری آزادی، ضد اور من مانی کا جذبہ جوں کا توں موجود تھا۔ میکے کا ساتھ چھوٹا نہیں تھا میکے کی سہیلیاں کیسے چھوٹتیں! حسن اتفاق سے اکثریت ان ہی تھی، جو ان کے ارد گرد اسی محلے میں آباد تھیں۔ خالہ زاد پھوپھی بہنیں بھی اسی کی

ہم مذاق اور ہم نوالہ و ہم پیالہ تھیں۔ نیز یہ ٹھہریں سنگی باز اور کھلے دل کی مالک، اگر کبھی کسی سہیلی کے پاس پیسوں وغیرہ کی کمی دیکھی تو بلا تکلف پوری کر دی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

اس طرح یہ چھ سات ہم سن، ہم مذاق، ہم مزاج اور ہم شغل سہیلیاں ہر میلے ٹھیلے اور عرس میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتیں۔ کاجل، مسی، کپڑے لتے اور زیور پہنے خوب بن ٹھن کر جاتیں۔

نائمہ بیگم قوالی سننے کی بہت زیادہ شوقین تھیں۔ قوالی سنتے سنتے ان پر "حال" طاری ہو جاتا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتیں ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی سخاوت قوالوں پر سکوں اور نوٹوں کی بارش کرواتی رہتی۔ جب کبھی کسی ایسی محفل میں جانا ہوتا تو ان کی والدہ کے اشارے پر ان کا بٹوہ کچھ خالی رکھا جاتا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ ان کے خاندان میں بہت مشہور ہوا تھا اور دیکھنے سننے والے دنگ رہ گئے تھے۔

ہوا یہ کہ ایک دفعہ خاص ان کی خالہ کے ہاں محفل قوالی کا اہتمام ہوا۔ نائمہ بیگم کا ذاتی شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حالانکہ یہ محفل رات کی تھی۔ مگر انہیں سر شام ہی سے بے چینی اور بے تابی نے آن گھیرا تھا۔ اس شام انہوں نے بہت پہلے کھانا وغیرہ تیار کر لیا، بچوں کو نہلا دھلا کر صاف ستھرا کیا اور میاں کا انتظار کئے بغیر ہی کہ وہ کب لوٹتے ہیں خود سولہ سنگھار کر کے بڑے اہتمام سے اپنی اماں کے ہاں پہنچ گئیں۔

یہاں بھی سب خالہ بی کے ہاں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں جن کا بڑا سا گھر ان کے محلے کے نکڑ پر تھا۔

رات گئے اس محفل کا آغاز ہوا۔

قوال بہت مشہور و معروف تھے۔ یہ ان کی شہرت ہی کا نتیجہ تھا کہ خالہ کا کشادہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنگن قوالی سننے والے شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جن کے بیچوں بیچ قوالوں کے لئے سفید براق چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں۔

اتنے رش کو دیکھتے ہوئے گھر کے مردوں نے خواتین اور بچیوں کے لئے عین سامنے والے کمروں کی چھت پر انتظامات کر دیئے تھے ... اس لئے کہ خواتین کا پردہ بھی قائم رہے اور وہ باقاعدہ قوالی دیکھ اور سن بھی سکیں، انہوں نے چھت پر قدرے پیچھے کو سرکا سرکا کر چارپائیں کھڑی کر دی تھیں جن کی آڑ سے نیچے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

نیچے تو خیر روشنیوں کا انتظام تھا ہی، مگر چھت کا منظر اور بھی زیادہ اجلا اور دلفریب لگ رہا تھا۔ درمیانی تاریخوں کا چاند بیچ آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا جس کے اردگرد لاکھوں ستاروں کے روپہلے ٹکڑے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ رات کو چلنے والے ہوا کے جھونکے سرشاری اور سرمستی کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اجلی اجلی شفاف چاندنی کی لہروں میں نت نئے کپڑے پہنے رنگ برنگے دوپٹے ڈالے لڑکیاں اور بڑی عمر کی خواتین خوب بج رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں، لڑکیوں کو زور سے بولنے اور ٹھٹھے لگانے پر بار بار تنبیہ کر رہی تھیں۔

انہی سب میں نائمہ بیگم بھی خوب عمدہ ساری باندھے، خوب بنی ٹھنی، بالوں اور کلائیوں میں موتیا کے گجرے سجائے ایک طرف کو بیٹھی نیچے جھانک رہی تھیں۔

وہ پہلی قوالی پر ہی جھوم اٹھیں ویسے بھی وہ واقعی پائے کے قوال تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کے ہارمونیم وغیرہ کی مدھم مدھم لئے ... اور پروقار لئے تنتنا، وہ ونیگی اور الفاظ کی موسیقیت سے بچی سنوری پرسوز آواز -- سننے والے حقیقتاً سانسیں لینا بھول گئے تھے۔

پھر دوسری ہی قوالی پر نائمہ بیگم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ --- یہ قوالی ابھی درمیانے بند تک پہنچی تھی کہ انہوں نے بے ساختہ "--- واہ

واہ سبحان اللہ" کے نعرے کے ساتھ گریبان میں ہاتھ ڈالا اور پورے کا پورا بٹوہ نکال کر بغیر سوچے سمجھے نیچے پھینک دیا۔

جب تک کہ ان کے برابر بیٹھنے والی چونک کر انہیں منع کرتیں، اچھا خاصا وزنی بٹوہ "دھپ" کی آواز کے ساتھ سب سے آگے بیٹھے ہوئے قوال کے سامنے گرا۔

وہ چونک کر سامنے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے دیکھنے اور چونکنے پر بہت سی نگاہیں اس کی نظروں کا تعاقب کرنے لگیں۔ کچھ لوگ حیرت اور تعجب سے سفید چاندنی پر پڑے بٹوے کو گھورنے لگے۔ لیکن قوالی برابر جاری رہی۔

اوپر نائمہ بیگم ہوش و حواس سے بیگانی ہوئی جا رہی تھیں۔ قوالی ختم ہونے تک انہوں نے اردگرد کی کئی جاننے والیوں سے ادھار روپے لے لے کر نیچے پھینک ڈالے۔ نیچے مردوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور اوپر خواتین میں بھی دھیمی دھیمی سرگوشیاں اور کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی۔ بڑی بوڑھیوں نے اندر ہی اندر نائمہ بیگم کو سرزنش کرنا چاہتی۔ مگر وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھیں۔

بالآخر ان کی ایک جہاندیدہ چچی نے سب خواتین کو چپکے چپکے منع کر دیا کہ اس سر پھری کو کوئی بطور قرض ایک پیسہ بھی نہ دے۔ تاکہ نہ ہوں اور نہ یہ نیچے پھینک سکیں۔

چند منٹ سکون رہا۔

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ آسمانوں سے شبنم گرنے لگی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جوں جوں رات بھیگ رہی تھی قوالوں کا جوش و خروش بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک سے ایک ناپ کی اور عمدہ سے عمدہ قوالیاں نکال رہے تھے۔ سب دم بخود بیٹھے تھے۔ نائمہ بیگم کے پاس اب پیسے تھے نہ کوئی دے رہا تھا۔ اس لئے وہ بھی ہاتھ روکے خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی چچی بھی اپنی ترکیب سے مطمئن ہو کر نیچے متوجہ ہو گئیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اچانک قوالوں نے ایک مشہور و معروف قوالی شروع کی۔

اس قوالی پر خود نائمہ بیگم بھی نثار تھیں۔ جس کسی محفل میں بھی انہیں موقع ملتا ..... وہ سب سے پہلے یہی قوالی اٹھاتی تھیں۔ خود بھی بہت خوش گلو تھیں۔ یہ قوالی شروع ہوئی تو وہ بیچ اپنے آپ میں نہ رہیں۔ مگر قوالوں کو نذرانہ پیش کرنے کے لئے اب کچھ نہ تھا۔

انہوں نے بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ ننھی شگفتہ ان کے قریب ہی لیٹی بچپن کی میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ گلے سے اس کا سرخ بھاری گوٹے والا دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔

انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ --- اس کی گردن سے دوپٹہ نوچ، گول مول کر کے پھینک دیا۔

قوالی اس وقت بہترین موڑ مڑ چکی تھی۔ ساز اور آواز کے ساتھ ساتھ شعر کا اصل مفہوم عروج کو چھو چکا تھا۔ نائمہ بیگم پر طاری جنون کی سی کیفیت بھی عروج کو پہنچ گئی۔ وہ کہاں ہیں، اور کیا کر رہی ہیں؟ سب سوال مٹ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے --- اک وجد کے سے عالم میں بیچ چھت پر بکھر گئیں --- بپھر اٹھیں --- بال بکھر گئے چوڑیاں ٹوٹ گئیں --- ان کی چچی سب کو سمجھا رہی تھیں۔

"ارے حال آ گیا نی کو --- حال کھیل رہی ہے ---"

اور وہ بے چارے قوالی چھوڑ کر "اماں جی" اماں ہائیں اماں ہائے کہہ چلاتے ہوئے نشست چھوڑ کر اٹھ بھاگے۔

تھوڑی دیر کے لئے ایک پر شور ہنگامہ سا مچ گیا۔

اس اچانک افتاد اور افراتفری میں ساری محفل ہی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ نائمہ بیگم کو تو کسی نہ کسی صورت گھر پہنچا دیا گیا مگر قوال میاں کو بمشکل تمام خالہ کے

بڑے لڑکوں نے رام کیا ..... وہ بار بار پیشانی کا پسینہ پونچھتے اور یہی کہتے --- اماں ہم سمجھے کسی چڑیل یا بھتنی نے ہم پر چھلانگ لگا دی ہے۔"

وہی نائمہ بیگم جو ہمیشہ سے اپنی من مانی کرنے کی عادی تھیں، اب جبکہ شوہر کا سایہ بھی سر سے اٹھ چکا تھا، جو کچھ نہ کر گزرتیں کم تھا۔

لکھنؤ کا مشہور و معروف عرس بھرا۔

وہ ہر سال بے حد پابندی اور ذوق و شوق سے ان بزرگ کے عرس میں ضرور شریک ہوتی تھیں۔ بھلا اس برس کیوں نہ ہوتیں۔

عرس کے دنوں میں تو ان کی بوٹی بوٹی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ انہوں نے چپ چاپ اپنی عدت توڑ دی۔

جس جس نے سنا، تعجب کی شدت سے دانتوں میں انگلی داب کر رہ گیا۔ ان کی اماں نے پچاسوں صلواتیں سنا کر رکھ دیں، چچی، تائیوں، خالہ نے خوب خوب لعن طعن کی۔ برا بھلا کہا، وہ سب کی سنا کیں۔ مگر کیا وہی جو من میں سما چکی تھی۔ لیکن جب وہ عرس میں پہنچنے کی تیاریوں میں مصروف تھیں تو برقعہ اوڑھے ان کی ضعیف والدہ گھر آ پہنچیں اور برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ انہیں کوسنے دینے لگیں۔

"اماں! آپ بیکار ہمیں برا بھلا کہہ رہی ہیں اور اپنا خون الگ جلا رہی ہیں۔ سوچئے بھلا ہم کسی برے کام میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ اک ذرا بابا صاحب کے عرس ہی میں تو جا رہے ہیں۔ یہ تو اور بھی ثواب کا کام ہے۔"

منجھلے صاحب انہوں نے قصہ ہی ختم کر دیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساون کے ہریالے دن تھے -- سارا سارا دن بادل چھائے رہتے۔ کوئی کالی سیاہ
بدلی آتی اور دھواں دھار برستی ہوئی گزر جاتی۔

ہر طرف ہریالی ہی ہریالی، سبزہ ہی سبزہ دکھائی پڑتا تھا۔

نثار احمد اس روز بھی اسرار احمد کے دفتر گئے ہوئے تھے۔ آج ہی بالکل خلاف توقع
اور اچانک کام بن گیا۔

اسرار احمد کے فنڈ کی رقم جس کے لئے چکر پر چکر لگا کر وہ تھک چکے تھے اور
تقریباً مایوس ہی ہو گئے تھے، غیر متوقع طور پر مسئلہ حل ہو گیا۔ اس محکمے کا بڑا چیف
اچانک دورے پر آ نکلا --- نثار احمد جو ہر روز کی بھاگ دوڑ سے عاجز آ چکے تھے اور آج
چڑ کر دل ہی دل میں طے کر چکے تھے کہ آج کام ہو گیا تو ٹھیک، ورنہ بھائی کو اب صاف
جواب دے دیں گے۔ سیدھے اس آنے والے افسر کے سامنے حاضر ہوئے اور تمام
کاغذات سمیت سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر ڈالا۔

اتفاق سے یہ بڑا افسر اسرار احمد کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور ان کے اچھے اخلاق، بہتر
کام اور دیانتداری کا بہت معترف تھا اور ان کی ذاتی صلاحیتوں کو بہت سراہتا رہتا تھا۔

اسرار احمد کے انتقال کی خبر سے اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے اپنی بڑائی

باوجود باقاعدہ اپنے رنج و افسوس کا اظہار کیا۔ نثار احمد کے ساتھ ہمدردی اور خلوص سے
پیش آیا۔ سارے کاغذات خود بیٹھ کر چیک کیے۔ مکمل کروائے اور ایک کاغذ پر دستخط کر
کے نثار احمد کے حوالے کیا اور کہا،

"آج کے بعد پرسوں کی تاریخ میں آئیے۔ دن کے دس بجے آپ کو اسرار احمد
کے فنڈ کی رقم یکمشت ادا کر دی جائے گی، مگر --- یہ رقم اسرار احمد کی بیوہ وصول
کر سکے گی۔ اسے ساتھ لے کر آئیے۔"

نثار احمد کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔

غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

آج مرحوم بھائی کی محنت و مشقت کا صلہ ایک کاغذ کی صورت میں ان کی مٹھی میں
دبا تھا۔

ایک طرف بڑی بھاوج سے کیے ہوئے وعدے کو ایفا کرنے کی خوشی تھی تو
دوسری جانب محبوب بھائی سے جدائی کا غم ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ اجاگر
ہو گیا تھا۔ وہ اسی عالم میں سر جھکائے ہوئے مرحوم بھائی کے گھر کی طرف ہو لئے۔
تاکہ بھاوج کو سب بتا کر پرسوں صبح تیار رہنے کا کہہ آئیں۔

گھر سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ یہاں پہ بہت سے پھلدار درخت اور
خوبصورت پھولوں کے پودے لگے تھے۔ کئی درختوں پر اونچے اونچے جھولے پڑے
تھے۔ اس باغیچے میں شام کے وقت آس پاس کے بچوں کا اژدہام ہوتا تھا کوئی جھولا
جھول رہا ہے۔ کوئی کھیل رہا ہے کوئی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کوئی پھل
کھا رہا ہے۔ بہت سے بچوں کی پسندیدہ چیزیں فروخت کرنے والے بھی آ جمع ہوتے۔
مگر اس وقت دوپہر کا سناٹا ہونے کی وجہ سے یہ باغیچہ سنسان نظر آ رہا تھا۔ ہر جھولا
خالی پڑا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گو کہ یہ برسات کی دوپہر تھی۔ دھوپ اور گرمی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لیکن بچے شاید اپنی ماؤں کے ڈر و خوف سے گھر میں قید یا سو رہے تھے یا پھر شام ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ بچوں سے خالی خالی باغیچہ اس وقت اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بس آم کے پیڑ میں چھپی کوئی پوری قوت سے "کوکے" جا رہی تھی۔

نثار احمد سر جھکائے، اپنی سوچوں میں 'مستغرق' دھیرے دھیرے چلے آ رہے تھے۔ دفعتاً ایک ہلکی سی سسکی سن کر ان کے قدم آپ ہی آپ تھم گئے اور وہ چونکتے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

ابھی وہ ہر طرف غور غور سے دیکھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ وہی دلگداز سی آواز پھر سنائی دی۔ کوئی لڑکی دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

''نہیں--- ضد نہیں کرتے بھیا! دیکھو میں اتنی دوپہر میں تمہیں لے کر باہر آئی ہوں۔ اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میری بات مان لو۔ ابا نہیں آئیں گے، نہیں آئیں گے۔ وہ ہم سب کو چھوڑ کر بہت دور چلے گئے ہیں۔ اماں کہتی ہیں وہاں سے کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ دیکھو شمشاد بھی تو چپ ہے!''

نثار احمد کے بدن میں جیسے برق کوند گئی۔

حساس دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔

گھائل روح میں جیسے ایک ساتھ سینکڑوں چھید ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے لئے تو جیسے کسی نے ان کی بینائی ہی چھین لی۔ ٹانگیں مفلوج ہو گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اندھوں دھندوں کی طرح سامنے کی طرف لپکے۔

اپنی معصوم اور یتیم بھتیجی کی آواز تو وہ ہزاروں کے میلے میں پہچان لیتے۔

یہاں برگد کے ایک بلند و بالا درخت کے نیچے ہری ہری گھاس پر مشکبار ننھے دلشاد کو کاندھے سے لگائے تھپک تھپک کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو راستے

کی طرف انگلی کر کر کے روئے جا رہا تھا اور سسک سسک کر پکار رہا تھا-- "ابا--ابا-- میلے ابا میاں---"

دلشاد سے بڑا شمشاد گھاس پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

"مشکبار--- میری مظلوم بچی---!!"

چچا کے منہ سے بھتیجی کا نام چیخ بن کر نکلا---

وہ لڑکھڑاتے ہوئے لپکے اور جلدی سے تینوں یتیم بچوں کو اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔ مشکبار جو چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی، چچا کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور دلشاد ایک دم ضد چھوڑ کر سہم سا گیا اور ان کے ساتھ لپٹ گیا۔

نثار احمد کا دل اس وقت قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ رنج و تاسف کی شدت سے قویٰ لرز لرز جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر قبل انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان تینوں کو سر راہ روتے بلکتے ہوئے پائیں گے وہ بھی اتنی دوپہر کو--- سنسان مقام پر---! نہیں، دورہ کر نائمہ بیگم کی غفلت اور بے پروائی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آئے جا رہا تھا کہ انہوں نے بچوں کو اس وقت آخر گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا!

مشکبار نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ "چچا میاں! یہ دلشاد ہم کو چین نہیں لینے دیتا۔ ہر وقت کہتا ہے ہمیں ابا میاں کے پاس لے کر چلو۔ آج تو اس نے بہت ضد کی۔"

نثار احمد کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ضبط کر کے بولے "تو اپنی اماں کو دے دیتیں۔ وہ خود ہی بہلا لیتیں۔ بچے ضد کرتے ہیں۔"

مشکبار دھیرے سے بولی "نہیں چچا! یہ تو ہر روز ضد کرتا ہے۔ تنگ آ کر اماں کہہ دیتی ہیں کہ جاؤ۔ باہر لے جا کر بہلا لاؤ۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چچا کو دیکھ کر شمشاد بھی ہشیار ہو گیا تھا جلدی سے تتلا کر بولا "چچی میاں! ہم لوزانہ (روزانہ) یہیں پر آ کے اپنے ابا میاں کا راستہ دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لئے اچھی اچھی چیزیں لایا کرتے تھے۔ مجھے اور بھیا کو گود میں اٹھا لیتے تھے اور کھلونے دیتے تھے۔ آپا کیلئے بھی بہت ساری چیزیں لاتے تھے مگر اب پتہ نہیں کیوں نہیں آتے؟ ہم اب بھی آپا کے ساتھ آ کر روز راستہ دیکھتے ہیں۔ چچا میاں...... چچا میاں۔ اماں ہیں نا اماں! وہ کہتی ہیں کہ تمہارے ابا میاں تم سے خفا ہو کر...... مر گئے ہیں۔"

مشکبار نے ایک ہلکی سی چیخ مار کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

نثار احمد غم و غصے کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

ایک طرف بھتیجے کی معصوم معصوم باتوں سے جگر پھٹا جاتا تھا، دوسری طرف بھاوج کی بے حسی پر غصہ آئے جا رہا تھا۔

انہوں نے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے شمشاد کی انگلی پکڑی اور گھر کی طرف مڑتے ہوئے بھرائی بھرائی سی آواز میں بولے۔ "اچھا چلو۔ اب گھر چلتے ہیں میں یہ قصہ ہی ختم کر دوں گا۔ ابھی بھابی سے چل کر بات کرتا ہوں--- میں تم کو اپنے ساتھ گاؤں ہی لے جاؤں گا۔"

ان کے کڑے کڑے تیوروں اور سخت لہجے سے مشکبار سہم سی گئی تھی۔ وہ ان کو کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن بتاتے ہوئے ڈر بھی رہی تھی۔

مگر جب چلتے چلتے وہ گلی کی نکڑ تک آ گئے تو جھجکتی ہوئی کہہ ہی گزری۔ "وہ--- چچا میاں اماں گھر میں نہیں ہیں۔"

نثار احمد پلٹ کر رک گئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔ "گھر پر نہیں ہیں! کیوں!! کہاں گئیں؟"

مشکبار جواب دینے کے بجائے غمگین سی سر جھکائے کھڑی رہی۔

نثار احمد نے اس کا جھکا ہوا سر ہلا کر بے چینی کے عالم میں دریافت کیا۔ "کیوں بیٹا بولتی کیوں نہیں۔ کہاں گئیں تمہاری اماں! نانی کے گھر گئی ہیں کیا؟"

اس نے بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا۔ "نہیں--- نانی کے گھر تو نہیں۔ وہ تو لکھنؤ والے بابا کے عرس میں گئی ہیں۔"

"عرس میں!" نثار احمد کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے۔ ہکا بکا بھتیجی کی صورت تکنے لگے۔

مشکبار مجرموں کی طرح گردن ڈالے کھڑی تھی۔

اچانک کسی خیال سے چونک کر نثار احمد نے جھرجھری لی اور مشکبار و شمشاد کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے نائمہ بیگم کے میکے کی طرف چل دیئے۔

دونوں بچے بھی ان کے پیچھے لپکے۔

یہاں نائمہ بیگم کے میکے میں بھی یہی موضوع چھڑا ہوا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل نائمہ بیگم اپنی مخصوص ہجولیوں کے ساتھ عرس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئی تھیں۔ ان کا یک رخصت ہوتے ہی چٹخارے لینے والی محلے پڑوس کی بیبیاں ان کی اماں کے ہاں جمع ہو کر اپنے اپنے انداز میں اظہار کر رہی تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی کی بیوی سب کے درمیان بیٹھی ایک ایک کی صورت دیکھ رہی تھی۔

اماں سب سے الگ تھلگ برآمدے کے تخت پر منہ لپیٹے لیٹی تھیں۔ وہ پرانے زمانے اور خالص پرانے خیالات کی انسان تھیں۔ انتہائی بردبار، دور اندیش اور سمجھدار--- اپنی بیٹی سے قطعی مختلف اور سنجیدہ خیالات کی مالک۔ ان کی اکثر رشتے دار خواتین تو بر ملا کہا کرتی تھیں کہ نائمہ تو کسی طرف سے بھی بانو بیگم کے پیٹ کی پیدا نظر نہیں آتیں۔ ویسے اس حقیقت سے سبھی آگاہ تھے کہ نائمہ بیگم کو بگاڑنے میں ان کے والد کا ہاتھ تھا، جو بیٹی کو حد سے زیادہ چاہتے تھے اور اپنی زندگی میں کبھی بیوی کو تیز نظر سے بھی بیٹی کو دیکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ بانو بیگم ان کی بے جا حمایت پر دل ہی دل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کڑھ کڑھ کر رہ جاتیں مگر میاں کے سامنے بول بھی نہ سکتی تھیں۔ چپ چاپ لڑکی کو بگڑتے ہوئے دیکھتی رہیں اور بالآخر۔ ۔ ۔ایک وقت ایسا آیا کہ نائمہ بیگم ناک پر مکھی کا بیٹھنا بھی گوارانہ کرپاتی تھیں یہی وہ وقت تھا جب بار ہا پریشان ہو ہو کر بانو بیگم نے اکیلے میں سوچا کہ اے کاش! اب اس حرافہ کے باوا زندہ ہوتے تو صاحبزادی کے کرتوت دیکھ دیکھ کر سر پہ ہاتھ رکھ کے روتے۔ شادی کرتے ہی گور میں جا سوئے۔

نثار احمد تیزی سے چلتے ہوئے سیدھے برآمدے میں رکے اور دلشاد کو جو ان کے شانے سے لگے لگے سو گیا تھا۔ تخت پر لٹاتے ہوئے زور سے بولے۔

”چچی بی! یہ میں کیا سن رہا ہوں! کیا واقعی نائمہ بھابی عرس دیکھنے گئی ہیں؟“

بانو بیگم ان کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور آنکھیں ملنے لگیں۔

نثار احمد کو دیکھ کر آنگن میں بیٹھی پڑوسنیں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئی تھیں۔ بہو بیگم اٹھ کر برآمد میں آگئیں۔

بانو بیگم نے ابھی تک نثار احمد کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ پاندان کھول کر پان بنانے لگی تھیں۔ چہرے کی رنگت پھیکی پڑی ہوئی تھی۔

پان بنا کر انہوں نے خود کھایا دوسرا نثار احمد کو دیا۔ پھر سوئے ہوئے دلشاد کو تھپکتے ہوئے بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

”تم نے جو کچھ سنا ٹھیک ہی سنا ہے۔ حقیقت میں نائمہ نے عدت توڑ دی ہے اور عرس میں گئی ہے۔ بھئی وہ ہمیشہ کی باغی ہے۔“

نثار احمد سناٹے میں آگئے۔

وہ سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے بچی کے سننے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ مگر اب با بیگم کی زبانی، عدت توڑ ڈالنے کا سن کر دنگ رہ گئے۔ حیرت اور پشیمانی سے ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ گردن آپ ہی آپ جھک گئی۔

آگے کچھ دریافت کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی! بھائی کی پھوٹی قسمت اور بھاوج کی سنگدلی و بے حسی پر ان کے احساسات جیسے یکلخت مردہ ہو کر رہ گئے۔ جس عورت نے ایک ہر دلعزیز شوہر کے انتقال پر عدت کاٹنا بھی گوارا نہ کی ہو، اس سے آئندہ کے لئے کونسی توقعات وابستہ رکھی جا سکتی تھیں۔

ان کا دل ایک دم ہی نائمہ بیگم کی طرف سے پھٹ گیا تھا اور اب وہ ان کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ رہے تھے۔ ان کی طرف سے سارے خیالات اور احساسات پراگندہ ہو چکے تھے۔ جتنا وہ انہیں قابل احترام اور ہمدردی و غمگساری کے لائق سمجھتے تھے، اتنے ہی وہ ان سے چڑ اٹھے۔ طبیعت میں ایک دم ایسا ابال آیا کہ ان سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ بھلا تین بچوں کی اماں ہو کر بھی اپنی طبیعت اور شوق پر پہرہ نہ بٹھا سکیں۔ یہ تک نہ سوچا کہ دنیا اس کھلے بندوں آزادی پر کیا کہے گی! عزیز و اقارب کتنی باتیں بنائیں گے، کون کس کا منہ بند کر سکتا ہے!

بہت دیر تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور کسی سے نظر ملائے بغیر دھیمے اور رکھے لہجے میں بولے۔

”اچھا چچی بی! اب میں چلتا ہوں۔ بھابی صاحبہ کو یہ بتانے آیا تھا کہ پرسوں ان کے فنڈ کی رقم ملنے کو ہے میں نے سب کاغذات وغیرہ مکمل کروالئے ہیں۔ چچی بی! آیا تو میں آپ کی طرف اس مقصد کے لئے تھا کہ عدت کے دن تو ابھی پورے ہوئے نہیں ہیں، بھابی کو دفتر تک کس طرح لے جا کر حاضر کرایا جائے۔ سوچا تھا آپ لوگوں سے اس سلسلے میں مشورہ لوں گا۔ مگر اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا اور انہوں نے از خود عدت توڑ دی ہے۔ لہٰذا آپ انہیں بتا دیجئے گا کہ پرسوں تیار رہیں۔ میں دس بجے سے پہلے انہیں لینے آؤں گا تاکہ اپنا وعدہ پورا کر سکوں۔“

وہ بولتے بولتے رک گئے پھر ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگے۔۔۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"دوسری بات جو مجھے آپ کے گوش گزار کرنی ہے وہ یہ کہ میں ان بچوں کو یوں لاوارثوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ تینوں میرے مرحوم بھائی کی نشانیاں ہیں۔ اس وقت بھی یہ لوگ مجھے باغیچے میں روتے بلکتے ملے ہیں کیا بھیا کی زندگی میں کبھی ایسا ہوا ہے۔ ذرا ان کی صورتیں اور حلیے دیکھئے! بھکاریوں سے بھی بدتر ہو رہے ہیں۔ یہ سب کم از میری قوت برداشت سے باہر ہیں۔ میں یہ سمجھوں کہ باپ کی موت کے بعد بچے اماں کو بھاری ہو گئے ہیں اور وہ ان کو سنبھالنے اور پرورش کرنے سے قاصر ہیں! بھابی صاحبہ کا جو کچھ بھی جواب ہے وہ آپ مجھے ان سے معلوم کر کے بتا دیجئے پھر میں چار آدمیوں کو اکٹھا کر کے فیصلہ کراؤں گا اور اپنے بھتیجے بھتیجی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ کیونکہ میں ابھی زندہ ہوں میرے تن کے زندہ ہیں۔ میرا اپنا خون، اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کو یوں تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ بہت دنوں سے بھابی صاحبہ کی بے حسی اور بے پروائی دیکھ رہا ہوں۔ بچوں سے اس قدر غفلت کہاں کا انصاف ہے؟ اور تو اور ایک شریف النفس اور خاندانی شخص کی بیوہ ہوتے ہوئے عدت کا عرصہ نہ گزار سکیں! ان کی اس حرکت سے ہم تو سر اٹھانے کے لائق نہیں رہے۔ ہمارے بھائی نے اپنی زندگی میں ان کے ساتھ کونسی زیادتی یا بے انصافی کی تھی کہ بعد مرنے کے ان کی لاج بھی نہ رکھ سکیں! یہ ایک فوت شدہ شخص کی حرمتی نہیں تو اور کیا ہے؟ کہیں دنیا میں ایسا اندھیر دیکھا سنا ہے؟

نثار احمد کو غصہ آیا تو آئے چلا گیا---

وہ بولے تو بولے چلے گئے---

شدید قسم کے غم و غصے میں انہیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ وہ اپنے سے بڑی بھابی بی کو باتیں سنا رہے ہیں--

چچی بی بے چاری تو کیا بولیں۔ سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہیں--- زبان سے

اف تک نہ نکالی۔ وہ خود بہت شرمسار اور قائل ہو رہی تھیں۔

مگر نائمہ بیگم کی بھاوج، نثار احمد کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ذہن نشین کرتی جا رہی تھیں۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد نثار احمد کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر کے کھلے دروازے سے باہر نکل گئے۔ نہ کسی نے انہیں روکا نہ انہوں نے مزید رکنا گوارا کیا--

❁

شام خوب گہری ہو چکی تھی۔

ساون کے مجھونکے صبح کے مقابلے میں زیادہ بوجھل اور نمناک ہو رہے تھے۔ کالی کالی گھنگھور گھٹاؤں سے آسمان یہاں سے وہاں تک اٹ چکا تھا، تب نائمہ بیگم اپنی ہمجولیوں کے ساتھ عرس سے واپس لوٹیں۔

یکہ انہوں نے اپنی والدہ کے بجائے۔ اپنے گھر کے دروازے پر رکوایا اور چھم چھم پازیب بجاتی ہوئی اندر داخل ہو گئیں۔

ملازمہ نے روشنیاں جلا دی تھیں اور کھانا تیار کر کے انہی کا انتظار کر رہی تھی۔ پر آج سارے گھر پر اداسی اور سناٹا طاری تھا۔ کسی بچے کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

معاً اس سناٹے میں سارے دن کے بعد نائمہ بیگم کو بچوں کی یاد نے آ ستایا۔

'ارے یہ سب کدھر کو نکل گئے۔ شام تو خاصی گہری ہو چکی۔'

انہوں نے قدرے بلبلا کر دل ہی دل میں سوچا۔

پس یکلخت ہی ان کی سوچ الفاظ بن کر سوال میں ڈھل گئی، انہوں نے ملازمہ سے پوچھا۔

"کیوں ری جھیا! یہ تینوں آفت کے پرکالے کدھر کو نکل گئے؟ تو نے خیال بھی نہیں کیا۔ اکیلی بیٹھی کیا گلو گھر رہی ہے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھمیا نے ادب سے جواب دیا۔

"جی وہ تو اپنی نانی اماں کے گھر ہیں ساوا ون ہو گیا۔ دوپہر کو میں کھانے کے لیے بلانے بھی گئی تھی مگر بڑی بیوی جی نے کہہ دیا کہ تم جاؤ۔ ان تینوں کو یہیں رہنے دو۔"

نائمہ بیگم نے اس کی بات کچھ سنی کچھ ان سنی کر دی۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بولیں۔

"اچھا زیادہ بک بک نہ کرو۔ جلدی سے جا کر بچوں کو لے آ۔ پھر کھانا گرم کر کے۔ بھوک بڑے زوروں کی لگ آئی ہے۔"

وہ اس وقت بڑے موڈ میں تھیں۔ اور کچھ گنگناتے ہوئے کپڑے تبدیل کیے جا رہی تھیں۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر ایک ہاتھ سے بال سنوارتی ہوئی تخت پر آ بیٹھیں۔

اس وقت وہ خود بخود ترنگ میں آ رہی تھیں۔

دراصل کافی عرصے کے بعد گھر سے باہر نکل کر اپنے موڈ میں آئی تھیں۔ جب سے اسرار احمد کا انتقال ہوا تھا، گھر کے اندر سوائے رونے دھونے اور ہر لمحہ آہ بھرنے کے دوسرا کام نہ تھا۔ اگر وہ کسی وقت اپنے ذہن سے اس مہلک حادثے سانحے کو نکالنا چاہتیں بھی تو دوسرے لوگ مرنے والے کی باتیں کر کر کے ان کا سکون غارت کرتے رہتے تھے۔ لیکن آج بہت سارے دنوں کے بعد انہیں آزادی نصیب ہوئی تھی اور انہوں نے بھی کسی کے کہنے سننے کی پروا کیے بغیر پورا پورا لطف اٹھایا تھا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ عرس میں خوب خوب سیر سپاٹے کیے تھے۔

ذرا دیر کے بعد باہر کا دروازہ کھلا۔ آگے آگے ان کی بھاوج، مشکبار اور شمشاد کی انگلیاں پکڑے اور پیچھے چھمیا دلشاد کو گود میں سنبھالے داخل ہوئیں۔

غیر متوقع طور پر بھاوج کو دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا مگر بظاہر مسکرا کر بولیں۔

"اوہو..... آج تو شہزادی شاہ بانو تشریف لائی ہیں۔ آئیے -- آئیے -- زہے نصیب

بھئی۔ کہو کیسے آنا ہو گیا۔"

جواباً شاہ بانو بھی مسکرائی اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اٹھلا کر بولی۔ "اے لو۔ نند بھی خوب سمجھتا ہے آپ کو۔ اور کچھ نہیں تو مجھ بے چاری کو پکڑ کے شہزادی ہی بنا ڈالا --- واہ --- چہ پدی --- چہ پدی کا شوربہ۔"

"اور کہاوت ... کہنا کوئی تم سے سیکھے۔" نائمہ بیگم اب بھی مذاق کے موڈ میں تھیں۔

شاہ بانو شاید کچھ اور بھی بولتی مگر اسی اثناء میں چھمیا نے دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا اور نائمہ بیگم نے ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے برابر بٹھا لیا۔ سمجھ گئی تھیں کہ ساون کی اس چڑھتی رات میں وہ کچھ کہنے ہی آئی تھی۔ ورنہ بچوں کو تو اکیلی چھمیا بھی لے آتی۔

ذہر کی کھچڑی پر نائمہ بیگم دل و جان سے فدا تھیں اور اس وقت اڑہر کی دال کی کھچڑی، چٹنی، اچار اور خوشبو دیتے اصلی گھی کی لذت نے کھانے کا لطف دوبالا کر ڈالا اور ادھر ادھر کی باتوں میں کھانا جاری رہا۔

چھمیا کو اڑہر کی کھچڑی کے سوا کچھ پکانا بھی نہ آتا تھا۔ ویسے سارے کام خوش اسلوبی سے کر لیتی۔ کھانا نائمہ بیگم خود ہی پکایا کرتی تھیں۔

کھانے کے بعد شمشاد اور مشکبار چپ چاپ اپنے اپنے بستر پر چلے گئے اور یہ دونوں نند بھاوج تخت پر آمنے سامنے سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ نائمہ بیگم نے پاندان سنبھال لیا۔

دو ایک پان چبانے کے بعد شاہ بانو نے دوپہر کو نثار احمد کے آنے، ان کے خفا ہونے اور بانو بیگم سے دو ٹوک بات کرنے کی تفصیل اصل سے بھی زیادہ خوب نمک مرچ لگا لگا کر بڑی نند کے کانوں میں اتار دی۔

حسب توقع نائمہ بیگم ایک دم بھڑک اٹھیں۔ پل بھر میں آپے سے باہر ہو گئیں۔ انہوں نے زور سے پاندان کا ڈھکنا بند کیا اور زہر خند ہو کر بولیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نثار احمد کو کیا حق پہنچتا ہے مجھ پر نکتہ چینی کرنے کا وہ کون ہوتے ہیں میرے روپیے پر چہ میگوئیاں اور بحث کرنے والے۔ تم نے ان سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا کہ ان سے میرا جو رشتہ ناتہ تھا وہ سب مرنے والے کے ساتھ ہی پیوند زمین ہو چکا۔ اب کوئی ناتہ اور تعلق باقی نہیں رہا۔ میں ان کی کچھ نہیں لگتی۔ ان کے بھائی مر گئے اور میں آزاد ہو گئی۔ اب بیکار کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کریں میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔ چاہے عدت کروں یا نہ کروں اپنے اعمال مجھی کو دیکھنے ہیں۔ وہ دھونس جمائیں جا کر ان پہ جو ان کی اپنی ہوں۔ میرے قول و فعل سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ ہو لینے دو ذرا صبح--- ساری نوابی ناک کے راستے نکال ڈالوں گی۔ اور وہ میرے بچوں کو لے جانے والے کون ہوتے ہیں! کیا سرکار دربار کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ایسا کچہری میں گھسیٹوں گی اور اپیل کروں گی کہ دن دھاڑے سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں گے۔ مجھے سمجھ کیا رکھا ہے انہوں نے۔ اماں کچھ بھولی نہ پائی ہوں گی اور بھی شریر ہو گئے ہوں گے۔ ہوئی نا میں ایسے وقت--- کہ جھاڑ کر رکھ دیتی۔ چلے ہیں میرے بچوں کو چھیننے--- ہاں جانتے ہیں ان کی ساری محبت اور الفت--- مفت کے تین تین نوکر بننا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کی پرورش کے بہانے ہمارے آموں کے باغ اور پنشن کا روپیہ ہضم کرنے کے چکر میں ہیں۔ میں ان کی چالاکیوں اور مکاریوں کو اچھی طرح جانتی ہوں--- مگر میرا نام بھی آئمہ ہے--- دماغ درست کر ڈالوں گی---"

وہ بہت دیر تک غیظ و غضب میں بھری ہوئی پھنکارتی رہیں اور جانے کیا کیا بکار رہیں۔ انہیں منع کرنے والا کون تھا!

شاہ بانو بے حد مطمئن انداز میں بیٹھی پان چباتی رہی۔

آسمان پر سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے جمع ہو گئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں بارش کا

پیغام دینے لگی تھیں ایسے میں نائمہ بیگم کا گری کھایا ہوا دماغ آسمان پر چڑھا ہوا تھا اور جو منہ میں آ رہا تھا ایک فراٹے کے ساتھ بکے جا رہی تھیں۔

کوئی دم جاتا تھا کہ بارش شروع ہونے والی تھی۔

شاہ بانو نے باہر جھانکتے ہوئے ایک دم ہول کر کہا۔ "ارے آپا چھوڑ دیئے--- باقی باتیں کل سویرے ہو جائیں گی۔ اب میں تو گھر جاؤں گی۔ چل چھیا مجھے چھوڑ کر آ--- بارش شروع ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی--- اور آپ کے بھیا بھی گھر آ چکے ہوں گے پھر مجھ پر خفا ہوں گے۔"

نائمہ بیگم کوئی جواب دینا چاہتی تھیں کہ ایک دم بڑی بڑی بوندیں ٹپاٹپ برس پڑیں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے مینہ نے زور پکڑ لیا اور دھواں دھار برسنے لگا، آسمان سے زمین کی طرف ایک تار سا بندھ گیا۔

شاہ بانو مجبوراً دوبارہ بیٹھ گئی اور بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگی۔

عین اسی وقت کسی نے باہر کے دروازے پر ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی کسی نے پکار کر کہا۔ "ارے آپا جان جلدی سے دروازہ کھولئے۔ بھیگ گیا میں تو سارے کا سارا۔"

شاہ بانو نند کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

نائمہ بیگم، بھائی کی آواز پہچان کر جلدی سے تخت پر کھڑی ہو گئیں اور چلا کر بولیں۔ "اے چھیا مردار آگ لگے تیری جوانی کو--- سر شام سے ہی نیند بھوت پڑی کیا کھایا مس بھر اور اینڈ گئیں۔ اے میں کہتی ہوں جلدی سے اٹھ بھاگ کر جا--- دروازہ کھول بھیگ گیا میرا بیرن---"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کی صلواتیں سنتے سنتے چھپا سردار آنکھیں ملتی ہوئی دوڑ کر کواڑ کھول چکی تھی۔ بارش کے پانی میں چھپاک چھپاک کرتے ہوئے ان کے بھائی ذاکر حسین برآمدے تک آئے اور بیوی کو مخاطب کر کے بولے۔ "جہاں بیٹھتی ہو جم کر رہ جاتی ہو۔ باتوں میں موقع محل بھی یاد نہیں رہتا۔ وہاں منے نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ بمشکل اماں کے پاس سلا کر محترمہ کی سواری لینے خود حاضر ہوا ہوں۔ کچھ ہوش بھی ہے!"

❁

شاہ بانو تو ہنس کر چپ رہی۔ لیکن نائمہ بیگم تڑاخ سے بول پڑیں۔ "وئے بیٹے۔ نہ سلام نہ دعا۔ آتے ہی بیوی پر برس پڑے-- صد رحمت ہو تم پر بھی ذاکر میاں-- اپنے میرے پاس ہی تو بیٹھی ہیں شاہ بانو۔ کہیں خدانخواستہ گلی کوچے میں تو کھڑی نہیں--"

ذاکر حسین وہیں چارپائی پر بیٹھ گئے اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں پر اٹکے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے قدرے مسکرا کر بولے۔ "آپ ذرا سنیے آپا جان! آج کہاں کہاں کی سیر کر آئیں۔ سنا ہے عرس میں گئی تھیں۔ اور یہ کیا غضب کیا آپ نے عدت توڑ ڈالی؟"

نائمہ بیگم برا سا منہ بنا کر بولیں۔ "میں نہیں مانتی یہ سب دنیا کی ڈھکوسلے بازی ہے۔ اب کیا چار دن کی زندگی میں دوسروں کی خاطر خود بھی مردہ بن جاؤ-- ایک تو ویسے ہی برسوں کا ساتھ چھوٹ جانے کا غم-- جان لینے کو تو یہ ایک ہی صدمہ بہت ہے۔ اوپر سے گھر کے اندر قید ہو کر اور بھی جیتے جی گور کے اندر لیٹ جاؤ یہ کہاں کا دستور ہے بھلا۔"

ذاکر حسین نے ہنس کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مزید جلتی پر تیل چھڑکا۔ "لو سنا ہے وہ آپ کے دیور صاحب بھی آج ہی تشریف لائے تھے چار آدمیوں کو جمع

کے فیصلے کی دھمکی دے کر گئے ہیں۔"

"اونہہ..... ایک دفعہ چھوڑ ہزار دفعہ آیا کریں۔" انہوں نے بے پروائی اور بے نیازی سے جواب دیا۔ "ان کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرتا کون ہے۔ ذرا میرے سامنے تو آئیں-- سارے کس بل نہ نکال ڈالے تو نام بدل دینا۔"

ذاکر کو پھر ہنسی آ گئی۔

وہ اپنی ہمشیرہ سے کئی حصے چھوٹے ہونے کے باوجود بہت بے تکلف تھے۔ ان سے ہر طرح کی گفتگو کر لیتے تھے۔ نائمہ بھی بھائی سے بے اندازہ محبت کرتی تھیں۔ چپکے چپکے ہمیشہ پیسہ کوڑی سے ان کی مٹھی گرم رکھتی تھیں۔

اس وقت بھی ذاکر ان کو مسکہ لگانے آئے تھے۔ بیوی کی زبانی انہیں بھی دن والے واقعہ کا علم ہو چکا تھا۔ اور جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ پرسوں نائمہ بیگم کو میاں کا چھوڑا ہوا فنڈ ملنے کو ہے وہ مزید چوکنے ہو گئے تھے اور بہن کو مکمل طور پر اپنے اختیار میں لینے کے چکر میں تھے۔ وہ دلی طور پر یہی چاہ رہے تھے کہ کسی صورت نثار احمد کا کانٹا ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹ جائے تو وہ بھی اچھی طرح بہتے دریا میں ہاتھ دھو سکیں۔

یہی سب سوچ کر دونوں میاں بیوی آپس میں سازش کر کے آگے پیچھے ان کے کان بھرنے کے لئے ان کے ہاں آ جمے تھے۔

شاہ بانو جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی بہن بھائی کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی بڑی بشاشت کے ساتھ ذرا چونکتے ہوئے اچانک بولی۔ "ارے سنا آپ نے آپا-- میں سب رونق تو آپ کو بتانا بھول گئی حالانکہ یہ اہم اطلاع تو آتے ہی بتا دینی چاہیے تھی۔ پرسوں آپ کو بھائی صاحب کے فنڈ کی رقم مل جائے گی۔"

نائمہ بیگم بھونچکی سی رہ گئیں۔ سروتہ ان کے ہاتھ سے گر گیا۔ تیزی سے پوچھا۔ "اے جھوٹ یا سچ؟ تم سے کس نے کہی یہ بات؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شادبانو نے قدرے اتراہٹ سے جواب دیا۔ "پوچھ لیجئے اپنے بھائی سے۔"

ذاکر حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہاں یہ اطلاع غلط نہیں ہے آپا۔ نثار احمد خود اپنی زبان سے اقرار کر کے گئے ہیں۔ آپ کو پرسوں ساتھ لے کر جائیں گے۔"

کہاں تو نائمہ بیگم مارے غصے کے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں اور کہاں یکلخت ان کی باچھیں کھل اٹھیں۔ نثار احمد کو وہ اب تک برداشت ہی قند کی رقم کی وجہ سے کر رہی تھیں۔ ان کے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ انہیں رقم وصول ہو جانے کے بعد دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جاتا۔

اس لئے انہیں اس حسین اطلاع پر دلی مسرت ہوئی۔

وہ بے حد خوش ہوتی ہوئی ذرا فکر مندی سے بولیں۔۔۔

"اے خدا کرے خدا کا رسول ﷺ کرے یہ خبر درست ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو نثار احمد کسی وجہ سے جھوٹ بول گئے ہوں۔"

"نہیں ...... میرا خیال ہے وہ غلط نہیں کہہ کر گئے۔" ذاکر حسین کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔۔۔

"لیکن۔۔۔ ایک بات ہے آپا! جب تک رقم مکمل طور پر آپ کے ہاتھ میں آ جاتی، ذرا اپنے دیور صاحب کی طرف سے چوکنی رہئے گا۔ مجھے تو ان کی نیت درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان کی اس درجہ بھاگ دوڑ اور رقم کی وصول یابی کی خبر کے ساتھ ہی بچوں کو لے جانے کی دھمکی دے جانا معمولی بات نہیں ہے۔"

شادبانو جلدی سے اپنی موٹی موٹی آنکھیں پھیلا کر بولیں۔ "ہائے اللہ۔۔۔ مجھے تو سب چار سو بیسی معلوم ہوتی ہے۔ اے خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پرسوں آپا جان دو رقم وصول کرنے کے لئے بھائی صاحب کے دفتر لے جائیں اور پھر دھوکے سے چھین لیں!!"

ذاکر حسین ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "ارے یہ تو فضول باتیں ہیں سب۔۔۔ نہ آپ شور مچا سکیں گی اور تب ہی صحیح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت ان کی نیت میں ہے کیا؟ اور رقم کی وصول یابی کے وقت ان کا طریقہ کار کیا ہوگا! ایک تو مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت نثار احمد کی موجودگی ضروری ہوگی۔ اس لئے اگر ہم کچھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔۔۔"

پھر ایک لمحہ رک کر کچھ سوچتے رہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بہن کو دیور کی طرف سے بدظن اور بدگمان کر دینا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی کم نفرت نہ کرتی تھیں ان سے۔ اب کڑوا کریلا مزید نیم چڑھا جا رہا تھا۔

کچھ دیر غور کرنے کے بعد ذاکر حسین نے قدرے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"ویسے تو خیر ہم خود چوکنے رہیں گے۔ ایسی کچھ فکر مندی کی بات نہیں ہے۔ جب آپ ان کے ساتھ جائیں گی تو میں سائیکل پر آپ دونوں کے تعاقب میں رہوں گا۔ وہاں آفس میں بھی قریب ہی رہنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو آپ فوراً اشارہ کر دیجئے گا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ میری وہاں کچھ واقفیت بھی ہے۔ یہ شناسائی کسی وقت بھی کام آ سکتی ہے۔۔۔ یہ تو رہی میرے ذمے داری۔۔۔ مگر در حقیقت اصل کام آپ ہی کو کرنا ہے۔ یہ بہترین موقع ہے نثار احمد سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑانے کا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے۔۔۔ اور ذرا ادھر آیئے قریب۔۔۔ غور سے میری بات سنئے۔۔۔!"

پھر۔۔۔ بہت دیر تک دونوں بہن بھائی میں چپکے چپکے کوئی سازش طے پاتی رہی۔ نائمہ بیگم خوب جوش و خروش کے ساتھ سر ہلاتی جا رہی تھیں۔ شادبانو شوہر اور نند کی ذرا سی میں ہاں ملا رہی تھی۔

باہر بارش اب پھپ پھپ کر برسنے لگی تھی۔ گلی کوچوں اور بڑی بڑی سڑکوں پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیزی کے ساتھ پانی بھرنے لگا تھا۔ تیز بارش کی وجہ سے بازاروں کی چہل پہل اور کاروبارِ زندگی ایک دم ہی معطل ہو گیا تھا۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگی تھیں۔ ادھر ادھر آوارہ گھومنے والے کتے اور بلیاں دکانوں کے شیڈ اور چھجوں کے نیچے پناہ لینے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔

فٹ پاتھ، بے گھر و بے در انسانوں سے خالی ہونے لگے۔

پبلک لائبریری
0301-7283298
0334-9830011

موسم برسات کی یہ پہلی بارش ہی بڑے زور دار انداز میں شروع ہوئی تھی۔

مگر نائمہ بیگم اور ان کے بھائی بھاوج ہر سرد و گرم سے بے نیاز ایک ایسی پلاننگ میں مصروف تھے، جس کے متعلق نثار احمد بے چاروں کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کس جرم کی پاداش میں گھڑی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے از خود ہی ایک داستان امیر حمزہ تیار کی تھی اور خود ہی اپنی خود ساختہ کہانی کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے ایک جامع سازش مکمل کر رہے تھے۔

دلشاد اور شمشاد دونوں بھائی گہری اور میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ گھر کی ملازمہ چھمیا پر بھی غفلت طاری ہو چکی تھی۔

صرف قسمت کی ماری حساس اور حرماں نصیب مشکبار تھی، جو ان لوگوں سے کافی دور، برآمدے کے آخری گوشے میں اپنے بستر پر بے قراری کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔

ساون کی وہ کالی سیاہ رات بیتی -- صبح ہوئی۔

سارا دن وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی۔ بادل اسی طرح تنے کھڑے تھے۔ برساتی ہوا فراٹے بھرتی رہی، پیڑ پودوں، پھل پھول کے بکھڑے نکھرتے رہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈھلتے رہے، اور نائمہ بیگم سارا دن اپنے دل ہی دل میں کھولا باندھنے میں مصروف رہیں۔ اپنی عادت کے خلاف آج انہوں نے ساون کی جھڑی کو بھی نظر انداز کر ڈالا تھا۔ ورنہ وہ ---- اور ساون کڑھائی نہ چڑھائیں۔

اگلا دن طلوع ہوا تو حسبِ وعدہ نثار احمد دس بجے سے پہلے ٹیکسی لے کر بھائی کے دروازے آن پہنچے۔ ہر سازش اور مکاری سے بے خبر۔

نائمہ بیگم پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں۔ فوراً ٹیکسی میں جا بیٹھیں۔

راستے بھر دونوں دیور بھاوج میں کوئی زبانی بات چیت نہ ہوئی۔ ہر دو اپنی جگہ اپنی اپنی سوچ کے گرداب میں غوطہ زن رہے۔

آفس کی انتظار گاہ میں انہیں بٹھا کر نثار احمد کاغذات لے کر مختلف کمروں کے چکر لگانے کے بعد دوبارہ ان کے پاس آئے اور انہیں لے کر اس کمرے میں پہنچے، جہاں اسرار احمد کی پنشن ملنے کی توقع تھی۔

چپراسی نے ان دونوں کو اندر جانے دیا۔

نثار احمد دروازے کے قریب رک گئے اور نائمہ بیگم بڑھ کر میز کے اس طرف کھڑی ہو گئیں۔

سامنے کرسی پر ایک بارعب شخصیت کا آفیسر بیٹھا تھا کسی فائل سے الجھ رہا تھا۔ کچھ دیر کی ورق گردانی کے بعد اس نے نائمہ بیگم سے تصدیق کرائی کہ وہ حقیقتاً اسرار احمد مرحوم کی بیوہ ہیں اور بذاتِ خود ان کی تنخواہ میں سے کٹی ہوئی رقم وصول کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے دو دوسرے آفیسروں کی موجودگی میں ان سے کئی سوالات کیے ---نائمہ بیگم بڑی معقولیت سے ٹھیک ٹھیک جواب دیتی رہیں۔

پھر اس نے ایک ضخیم سے رجسٹر پر کئی جگہ ان سے دستخط کرنے کو کہا۔ نائمہ بیگم پڑھی لکھی تو تھی نہیں۔ چنانچہ ان سے انگوٹھے کے نشانات لگوا لئے گئے۔

اس رسمی سی کارروائی کے بعد اس نے آہنی الماری کا تالا کھول کر ایک چرمی بیگ برآمد کیا۔ اور انہیں دو آفیسروں کے سامنے نائمہ بیگم کو کرسی پر بٹھا کر ایک خاصی خطیر رقم گنوائی۔

آخر میں اس رقم کو کسی اچھے اور مناسب مقصد میں خرچ کرنے کی رائے دی اور مرحوم اسرار احمد کے لئے بھی چند ایک تعریفی اور الوداعی الفاظ ادا کیے۔

❁

اس تمام کارروائی کے دوران نثار احمد چپ چاپ دروازے کے قریب سینے پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ کسی نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

نائمہ بیگم جب اچھی طرح رقم سنبھال چکیں اور ٹیک دانی آفیسر نے کرسی سے کھڑے ہو کر احتراماً انہیں رخصت کرنا چاہا عین اس وقت نائمہ بیگم نے کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ نثار احمد پر ایک کڑی نظر ڈالی اور اپنے لہجے میں دنیا بھر کا ڈر اور خوف شامل کر کے کہنے لگیں۔

"صاحب! مجھے اس شخص کے پھندے سے بچائیے ---"

آفیسر کی پیشانی پر سینکڑوں بل پڑ گئے۔ وہ تیز نظروں سے نثار احمد کو گھورنے لگا۔

نثار احمد کا دل دھک سے رہ گیا۔

پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔

انہیں اپنی سماعت پر یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ "یہ بھابی صاحبہ نے کیا کہا!"

کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی غش کھا کر گر پڑیں گے۔

"کون ہے یہ تمہارا؟" آفیسر نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ "اور --- کیا خطرہ ہے تمہیں اس شخص سے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نائمہ بیگم نے فوراً رقت بھری آواز میں فریاد کی۔ "جی یہ میرے مرحوم شوہر کا چھوٹا بھائی ہے۔ مگر میرا سب سے بڑا دشمن ہے یہ بہت لالچی اور حریص سا ہے۔ میرے بیوہ ہونے کے بعد اس کی نگاہ میرے جان و مال پر ہے۔ یہ مجھ سے یہ رقم بھی ہتھیانے کے چکر میں ہے اور صاحب---اس سے مجھ سب سے بڑا خطرہ---اپنے مال کے علاوہ اپنی---عزت کا ہے۔ صاحب! یہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے---اور جھوٹ موٹ کا نکاح کر کے میرے یتیم بچوں کے حق پر ڈاکا ڈالنا چاہتا ہے---یہ میرے بچوں کو بے آسرا کرنا چاہتا ہے۔

مگر میں نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ میں عزت و آبرو کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش خود کرنا چاہتی ہوں، مجھے اس شخص کے شر سے بچایا جائے---میری عزت اور جان و مال کا تحفظ دلایا جائے--صاحب! میں آپ سے فریاد کرتی ہوں کہ مجھے میرے دیور کے لالچ سے بچایا جائے۔ تاکہ میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ آرام سکون کی زندگی گزار سکوں---مجھے اس شخص سے بہت بڑا خطرہ اور اندیشہ ہے۔ اس سے نکاح نہیں کرنا چاہتی مگر یہ میرے بیوہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر بے جا دباؤ ڈال کر نکاح کرنا چاہتا ہے۔ میں کس سے فریاد کروں اور اپنا دکھ بیان کروں۔ مجھ بے آسرا بیوہ کا تحفظ کیا جائے!"

نائمہ بیگم نے یہ مکاری سے پر باتیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر اتنا موثر، فریادی اور دلگیر و دلگداز انداز میں کہیں کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی تھوڑی دیر کے واسطے بھونچکا ہو کر ان کے چکر میں پڑ جاتا۔

اس آفیسر پر براہ راست اثر ہوا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ فوراً ہی نثار احمد کی طرف پلٹ پڑا اور انتہائی سرد و تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "کیوں جناب! آپ کا دماغ تو درست ہے؟ جانتے ہیں کسی لاوارث اور بیوہ خاتون کو چھیڑنا اور پریشان کرنا کس قدر بڑا جرم ہے۔

بہت افسوس کی بات ہے۔ یہ تو آپ کے بھائی کی ہی بیوہ ہیں۔ بجائے ان کا دکھ بٹانے کے الٹا ان کی پریشانی کا موجب بن رہے ہیں؟ مانا کہ نکاح ایک جائز فعل ہے مگر--اس میں یک طرفہ خواہش کوئی اہمیت نہیں رکھتی--صورت سے تو آپ اچھے خاصے بردبار اور شریف انسان دکھائی دیتے ہیں مگر باطن آپ کا انتہائی غلیظ ہے--خبردار جو آئندہ ان شریف خاتون کا پیچھا کرنے یا انہیں تنگ کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے بھائی کے فوت ہونے کے بعد اب یہ ان کا سراسر ذاتی فعل ہے کہ یہ آپ لوگوں سے آئندہ ربط ضبط رکھیں یا نہ رکھیں---"

پھر وہ کمرے کے بیچ مظلوم شکل بنائے کھڑی نائمہ بیگم سے مخاطب ہوا"

"بیگم اسرار احمد! چونکہ اس وقت آپ کے پاس کی معقول رقم موجود ہے اور آپ کو اس شخص سے بھی خطرہ ہے۔ اس لئے اس وقت احتیاطاً فون کر کے میں ایک سپاہی بلوائے دیتا ہوں۔ وہ آپ کو بحفاظت آپ کے گھر تک پہنچا کر آئے گا۔ مگر اس سے آگے ہمارے محکمے کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔ اخلاقی طور سے ہم نے اس شخص کو سمجھا دیا ہے۔ لیکن---اگر یہ آئندہ بھی آپ کے لئے کوئی مشکل پیدا کرنا چاہے تو آپ فوراً اپنے حلقے کے پولیس اسٹیشن پر اس کا نام و پتہ اور اپنی پتا درج کروا دیجئے پولیس فوراً اسے حراست میں لے کر اس کے مزاج درست کر دے گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور انگریزی میں کسی سے بات کرنے لگا۔

نثار احمد اب تک گم صم کھڑے کے کھڑے تھے۔

وہ نائمہ بیگم اور اس آفیسر کی گفتگو ضرور سن رہے تھے مگر خود ان کی اپنی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

کاٹو جیسے بدن میں لہو نہیں---

دل خزاں کے دوش پر آئے ہوئے زرد پتے کی طرح کانپے جا رہا تھا۔ ایک دم ہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان پر جیسے منوں بڑھاپا اور ضعیفی طاری ہونے لگی۔ عقل میں نہیں سما رہا تھا کہ یہ نائمہ بیگم نے کیا کہہ دیا---اور انہوں نے کیا سن لیا---!

اتنا بھیانک الزام---

ایسا گھناؤنا بہتان---

ایسی ان سنی اور ان کہی باتیں---جو کبھی نثار احمد کے تصور سے بھی نہیں گزری تھیں---

❀

ان کے تو خواب و خیال سے بھی یہ گری ہوئی سوچ نہ کبھی ٹکرائی تھی۔ وہ تو بھاوج کو انتہائی قابل احترام جانتے تھے--- بھائی کے انتقال کے بعد سے تو اس احترام اور عزت و ہمدردی اور غمگساری میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہاں---جس دن نائمہ بیگم نے عدت توڑی اور نثار احمد نے تینوں بچوں کو لاوارثوں کی طرح ادھر ادھر کی خاک چھانتے پھرتے پایا تھا، وہ ضرور بھاوج کی طرف سے بدظن ہو گئے تھے۔ تو اس سلسلے میں بھی انہوں نے شریفانہ قاعدہ اپنانے کا فیصلہ کیا تھا اور سوچا تھا کہ ذرا سرکار دربار کے چکر سے فارغ ہو جائیں اور فنڈ کی رقم نائمہ بیگم کو دلوا دیں پھر آرام اور سکون کے ساتھ بچوں کے متعلق بات کریں گے۔

رقم کھا لینے یا نائمہ بیگم سے نکاح کا تو ذکر ہی کیا---وہ خود بیوی بچوں والے تھے اور دنیا کی ہر نعمت قدرت نے ان کو مہیا کر رکھی تھی۔

ان کا جی چاہ رہا تھا، زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

عزت والے کے لئے ایک لفظ بھی توہین کا بہت بڑی گالی ہوتا ہے۔

کجا کہ نائمہ بیگم نے ان کو ننگا ہی کر ڈالا تھا۔

اب وہ دنیا کو کیا منہ دکھلائیں---کہاں جائیں---کیا کریں۔

بہت بڑے بڑے سوالیہ نشان آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

خدا جانے کیسے---اور کیونکر---ان کے قدم خود بخود اٹھے اور پھر اٹھتے چلے گئے۔

وہ نائمہ بیگم کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد---

نائمہ بیگم ایک یکے پر شاہانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے برابر ایک سپاہی وردی پہنے، مستعدی سے بندوق ہاتھ میں تھامے چوکنے انداز میں ادھر ادھر جیغاد دیکھ رہا تھا۔

یکہ دھیرے دھیرے لکھنؤ کے گلی کوچوں سے ہوتا ہوا لمحہ بہ لمحہ اسرار احمد مرحوم کے گھر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس گھر کی جانب جس کے دروازے نائمہ بیگم نے اپنی انتہائی عیاری اور فطری دوراندیشی سے کام لے کر نثار احمد اور ان کی ساری اولاد کے لئے ہمیشہ کے واسطے بند کروا دیے تھے---اور یہی تھی وہ سازش جو ایک دن قبل تیار کی گئی تھی۔

یکے سے خاصے فاصلے پر ذاکر حسین اپنی سائیکل پر سوار چلے آ رہے تھے۔

چہرہ کسی اندرونی خوشی کے زیر اثر دمک رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر تمام واقعات کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور بغور چھان بین کی جائے تو خاصی حد تک الزام نثار احمد پر بھی عائد ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہتے اور اپنا غم و غصہ نظر انداز کر کے صرف اور صرف اپنے یتیم اور لاوارث بھتیجوں، بھتیجی کے تحفظ اور مستقبل مد نظر رکھتے تو یقیناً کہانی چاہے کیسا ہی رخ اختیار کرتی مگر یہ بات مانی ہوئی ہے مشکبار، شہشار اور دلشاد کو زمانے کی وہ ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں جو بعد کو ان بد نصیبوں مقدر کر دی گئیں۔

مگر اس مسلمہ امر کو کیا کہا جاتا کہ وہ ذاتی طور پر بے حد غیور طبیعت اور خود فطرت کے مالک تھے۔ بہت کم سخن اور سنجیدہ تھے۔ نہ بڑا بول بولتے تھے نہ کسی پر چ کرتے۔ کسی سے لینا نہ دینا۔ ان کے دوست احباب بھی بہت کم تھے۔ اپنا سب سے سرپرست، دوست، ساتھی، غمگسار و غمخوار اپنے بڑے بھائی اسرار احمد کو سمجھتے ت اور ان کی وفات کے بعد مزید گوشہ نشین اور کم گو ہو گئے تھے۔ دونوں اس صدمے ان کی حالت نہ سنبھل سکی۔

اپنی بھاوج نائمہ بیگم سے وہ بھائی کی زندگی میں بھی بے تکلف نہ ہو سکے تھے کا بھلا ذکر ہی کیا ہے۔

اول تو خود نائمہ بیگم کا دل کبھی دیور دیورانی اور ان کے بچوں سے نہیں مل سکا۔ ساری زندگی کبھی انہیں ڈھنگ سے نہ ملیں نہ انہیں دیکھ کر پیشانی کے بل ہٹائے۔ کبھی ان کے ہاں گاؤں میں جانا پسند نہ کرتی تھیں۔ انہیں تو ہفتہ وار چھٹی پر میاں اور بچی کا ان کے گھر جانا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر اس جگہ اسرار احمد کے خاموش رویے سے مجبور تھیں۔ آندھی چڑھتی یا طوفان آتا وہ اتوار کے اتوار بھائی کے ہاں جانا نہ بھولتے۔ نائمہ بیگم خواہ کتنا ہی بڑبڑ کیوں نہ کرتیں۔ وہ ساری بڑبڑاہٹ نظر انداز کر کے اپنا یہ معمول کبھی نہ توڑ پائے تھے۔

لیکن جب اسرار احمد اس جہان فانی سے اٹھ گئے تو یہ معمولات بھی خود بخود ٹوٹ گئے۔ مہینوں گزر گئے، مشکبار چچا کے گھر میں قدم نہ رکھ سکی۔

پہلے تو چچا چچی اور ان کے بچے نائمہ بیگم کے خشک اور روکھے رویے کے باوجود آتے جاتے رہے مگر پھر ایک دن یکایک یہ سلسلہ ایسا یکلخت تھما کہ پھر بالآخر برسوں گزرتے چلے گئے، یہ دو گھرانے آپس میں نہ مل سکے۔

اسرار احمد کے دفتر میں نائمہ بیگم نے جو الزامات منہ در منہ نثار احمد پر عائد کئے تھے ان کا جگر پھاڑ دینے کے لئے کافی تھے۔ اس روز کے بعد سے انہیں اپنی اس عیار بھاوج تو بھاوج ان کے بچوں تک سے نفرت ہو گئی۔

وہ اس قاعدے کے انسان تھے۔ اگر کوئی ان سے ایک قدم پیچھے ہٹا تو وہ دس قدم بڑھ کر دکھا دینے والوں میں سے تھے۔

پھر نائمہ بیگم نے تو اخلاق و مروت کی ساری حدود ہی آن واحد میں پھلانگ ڈالی تھیں۔

اب نثار احمد ان کا ذکر تک سننے کے روادار نہ رہے تھے۔

دفتر سے واپس لوٹ کر ان کے دل و دماغ قابو میں نہ رہے تھے۔ دماغ پر ایسا اثر ہوا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ وہ اپنے گھر کا راستہ بھی فراموش کر بیٹھے۔ ذہن بیکار ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند چھا رہی تھی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور سوچوں کے تمام سرے تو ایک دم کسی گہری کھنڈ میں جا گرے تھے۔

قدم من من بھر کے ہو گئے۔ وہ جانا کس طرف چاہ رہے تھے بھٹک کر پہنچ جانے کس طرف کو گئے۔

اپنے آپ سے بے خبر چلتے چلاتے اپنے گاؤں کے بجائے جانے کون سا راستہ اختیار کیا کہ ہری بھری پگڈنڈیوں کے جال میں الجھتے چلے گئے۔ پگڈنڈیوں کی چھوڑی تو کھلیانوں، باغات اور میدانوں میں بھٹک گئے۔

گزشتہ شام کو برسنے والی بارش کا پانی جگہ جگہ گڑھوں اور نشیبی جگہوں میں بھرا تھا۔ یہ کہیں پر بیٹھتے کہیں گرتے آگے ہی آگے چلتے گئے۔ سارے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے، بال بکھر گئے، آنکھوں میں وحشت بھر گئی --- مگر اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔

دراصل نثار احمد پر یہ افسوسناک کیفیت اور وحشت چھا جانے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ بھاوج کے بے بنیاد الزامات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ بول پائے تھے۔ نہ کی بھڑاس نکل تھی۔ نہ اپنی صفائی پیش کر سکے تھے۔ مزید یہ کہ اس آفیسر کے کڑے الفاظ، دھمکی اور سخت لہجے کا اثر --- سارا غم و غصہ، رنج و الم اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا تھا۔ اور نکاسی کا کوئی راستہ نہ پا کر ان کے پریشان حال دل و دماغ پر حملہ آور ہو گئے تھے

❀

وہ تمام دن انہی ناہموار اور کچے راستوں پر بھٹکتے پھرے۔ کوئی انسانی صورت نظر نہ آئی۔ وہ تھے اور جنگل کا بولتا ہوا سناٹا --- اونچی اونچی لہراتی فصلوں میں کٹر پلاپا یا دور دور بکھرے ہوئے ہریالے باغوں کے سلسلے۔

ساون کی رت نے ہر منظر نکھار ڈالا تھا۔ پتے پتے اور بوٹے بوٹے پر غضب کی بہار تھی۔ پانی کے چھینٹے نے بنجر زمین کی کوکھ تک آباد کر ڈالی تھی۔ سبزے اور ہریالی نے مل جل کر جنگل میں منگل کر ڈالا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں والے معصوم خرگوش اور چھوٹی چھوٹی گلہریاں جھاڑیوں میں پھدکتی پھر رہی تھیں۔ ننھی منی چڑیوں نے پیڑوں میں شور مچا رکھا تھا۔

موسم برسات کی ہر نعمت اس وقت جنگل کے پر فضا ماحول میں عیاں عیاں سی لگ رہی تھی۔ مسلسل بارشوں نے نوکدار کانٹوں تک کو نرم و نازک لباس پہنا ڈالے تھے۔ ہر منظر دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ مگر --- نثار احمد کو کہاں ہوش تھا -- کہ کہ لطف اندوز ہوتا!

محض اتفاق ہی تھا کہ سورج کا آتشیں گولہ ڈوبنے سے پہلے پہلے کسی واقف کی ان پر نظر پڑ گئی۔ اگر ملگجا سا بھی اندھیرا پھیل چکا ہوتا تو ان کا حلیہ اس قدر بدتر اور گندا ہو رہا تھا کہ پہچانے ہی نہ جاتے۔ تاہم اس نے قریب آ کر بغور دیکھنے کے بعد ہی یہ حیرت انگیز حقیقت پائی کہ نثار احمد کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا ہے۔

وہ بہ مشکل گھسیٹ گھسیٹ کر انہیں اپنے ٹھکانے پر لے گیا اور گھوڑے پر لاد کر کسی نہ کسی طرح ان کے گھر تک پہنچانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

نثار احمد پر سرسامی کیفیت طاری تھی۔ ان کی بیوی تو مارے ہول کے رونے لگیں۔ اچھے خاصے صبح ناشتہ کر کے کپڑے بدل کر گھر سے گئے تھے۔ انہیں تو کبھی معمولی سا نزلہ زکام یا درد سر تک نہ ہوا تھا۔

چاروں لڑکوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ان بے چاروں نے کبھی اپنے ہوش میں بھی باپ کی یہ عجیب و غریب حالت نہیں دیکھی تھی۔ نثار احمد جانے کیا کیا بک رہے تھے۔ ہوش میں ہوتے تو صحیح بات کا علم ہوتا، بھی کہتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں چور ہوں---میں ڈاکو ہوں---میں غاصب ہوں---میں منافق ہوں۔"

لیکن تھوڑی دیر بعد کہنے لگے۔

"نہیں---نہیں---میں منافق ہرگز نہیں---میں تو بزدل ہوں بزدل ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہئے۔"

کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

یہ تو سب کو معلوم تھا کہ صبح نائمہ بیگم کو لے کر اسرار احمد کے دفتر گئے تھے فنڈ کی رقم دلوانے کے لئے۔ بس وہیں سے اس عجیب و غریب حالت میں واپس آئے تھے۔ چنانچہ ان کے بڑے لڑکے نے نائمہ بیگم کے ہاں بھی باپ کی اچانک علالت کی اطلاع بھجوا دی۔ مگر وہاں سے کسی نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ بلکہ ایک سنگین خاموشی اختیار کر لی۔

نثار احمد کی دیوانگی کو کئی دن بیت گئے مگر نائمہ بیگم کے ہاں سے کوئی آیا اور نہ کسی نے خیر خیریت دریافت کرائی۔

چنانچہ رفتہ رفتہ ان کی جامد چپ نے سب کو سمجھا دیا کہ دال میں جو کالا ہے تو وہ نائمہ بیگم کی طرف سے ہی ہے---اور نثار احمد کو جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں نائمہ بیگم کا ہی عمل دخل ہو سکتا ہے۔

اس احساس نے چاروں بیٹوں کے دلوں میں خود بخود ہی بڑی اماں کی طرف اک کھٹک سی پیدا کر دی۔ قدرتی بات تھی کہ دیورانی کا دل بھی ان کی طرف سے میلا ہو گیا۔

یوں دلوں میں نفرت و کدورت کا بیج پڑا تو دن بہ دن بڑھتا ہی چلا گیا۔

گاؤں کا دیسی علاج کرایا گیا۔ پھر شہری ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ نثار احمد کے بیٹوں نے ان کے دوا علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جس نے جو رائے دی اس پر ضرور عمل کیا گیا۔

پھر سننے میں یہ بھی آیا کہ ہوش و خرد سے بیگانے انہی دنوں میں ایک دفعہ نثار احمد نے

اپنی جان ختم کر ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر بروقت ان کے منجھلے بیٹے نے بچا لیا۔

کچھ عرصہ گزرا اور بہتے رستے زخموں پر کھرنڈ جما تو رفتہ رفتہ نثار احمد قدرے ہوش میں رہنے لگے۔ کیا معلوم قدرت کو پریشان حال بیٹوں اور روتی بلکتی بیوی کی حالت زار پر رحم آ گیا یا کسی کی دعا کام آ گئی---بہر حال---پراگندہ حالات سنورنے لگے۔ اور نثار احمد کی ذہنی حالت کچھ کچھ اعتدال پر آنے لگی اور چوبیس گھنٹے میں زیادہ تر وہ صحیح الدماغ لوگوں کی طرح نارمل نظر آنے لگے۔ سب نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ یہ بھی بہت غنیمت تھا۔ ورنہ سب ان کی صحت اور تندرستی کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ تبھی خدا کی قدرت جوش میں آئی اور جس طرح اچانک وہ ہوش و حواس سے بیگانے ہوئے تھے ویسے ہی اچانک ان کی حالت اعتدال پذیر ہونے لگی۔

لیکن حال اور ماضی کے نثار احمد میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہو چکا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور خاموش طبیعت ہو گئے تھے۔ گھنٹوں خاموش لیٹے چھت کی کڑیاں گنتے رہتے یا زمینوں کی سیر کو نکلتے تو سورج ڈوبے گھر لوٹتے۔

ایک روز انہوں نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ گھر کے سب افراد حیرت زدہ رہ گئے۔ مگر کسی کی بھی مجال نہ ہوئی کہ ان کو منع کرتا یا کم از کم اس کا سبب دریافت کرتا۔

نثار احمد اکیلے ہی اپنی کارروائی میں مصروف رہے اور اپنے کمرے میں جہاں وقتاً فوقتاً...انہوں نے اپنی بھتیجی اور بھتیجوں کی بہت ساری تصویریں فریموں میں جڑ جڑ کر بڑے شوق اور لگن سے دیواروں پر سجائی تھیں، سب اتار اتار کر ایک بڑے سے لکڑی کے صندوق میں رکھ دیں۔ ہر تہوار کے موقع پر وہ خود ان بچوں کو لکھنؤ لے جا کر تصویریں کھنچوایا کرتے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کچھ بڑی بڑی تصاویر اسرار احمد مرحوم کی بھی تھیں جو ایک عرصے سے آویزاں تھیں۔ یہ سب تصاویر صندوقچی میں بند کرنے کے بعد انہوں نے ایک بڑا سا تالا لگایا اور چابی لے جاکر اپنے ہاتھ سے بڑی نہر کے پانی میں غڑاپ سے پھینک دی۔ پھر اس کے بعد بہت دیر تک باغ میں ایک پیڑ کے نیچے گم صم لیٹے رہے۔ خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں سے کہاں تک کا سفر کر ڈالا۔ آج وہ اپنی دانست میں بھائی اور بھائی کی اولاد سے ہر تعلق توڑ چکے تھے۔

اور حقیقت بھی یہی تھی۔

اس روز کے بعد سے پلٹ کر انہوں نے بھاوج کی گلی تک نہ دیکھی۔

اپنی اولاد سے انہوں نے صاف صاف تنبیہ کر دی تھی کہ جو کوئی بھی تم میں سے آئندہ میری مرضی کے خلاف نائمہ بیگم اور ان کی اولاد سے ملا یا ان سے بات چیت کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ ان کی نظر میں مر چکا ہوگا۔

یوں وقت کا پنچھی اپنے پنجوں میں حالات کی ست رنگی ڈور تھامے کہیں سے کہیں جانکلا۔ مگر نثار احمد نے نائمہ بیگم کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کی۔ انہیں اس نام سے ایسی نفرت ہوئی کہ پھر تازندگی وہ حل نہ پائی۔

یوں چچا سے یتیم بھتیجے چھوٹ گئے۔

بے کس و بے بس، مجبور و لاچار معصوم بھتیجی چھوٹ گئی۔

اسرار احمد کا ساتھ چھوٹتے ہی محض ایک عورت کی مکار ذہنیت کے کارن یہ چھوٹا سا گھرانہ تنکوں کی طرح منتشر ہو گیا۔

نثار احمد نے دل پر وزنی پتھر رکھ کر یہ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تینوں بچوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں--- سب رشتے ناتے چھوٹ گئے۔ ٹوٹ گئے۔ نائمہ بیگم کا جو چاہے کریں اور جیسے مرضی ہو ان کی پرورش کریں۔

اور یہی نائمہ بیگم چاہتی بھی تھیں۔ ان کی دلی آرزو پوری ہو گئی۔ انہوں نے الزامات ہی ایسے تاک تاک کر لگائے تھے کہ کوئی غیرت مند اور خوددار انسان برداشت نہ کر سکتا تھا۔ پھر نثار احمد کی تو عادت و فطرت بھی ایسی تھی کہ نائمہ بیگم کا یہ ناپاک حربہ ان پر نہایت آسانی سے چل گیا اور وہ اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گئے۔

یوں ہر وقت رواں رہنے والے وقت کے سرد و گرم میں دھیرے دھیرے کئی سال بیت گئے---اور کسی نے کسی کی خبر نہ لی۔

اسی زمانہ کا ذکر ہے۔

نائمہ بیگم کی پانچوں گھی میں تھیں۔ نہ کسی طرح کا فکر و تردد نہ پریشانی پشیمانی-- بڑے مزے اور بے فکری سے اپنا وقت کاٹ رہی تھیں۔

اسرار احمد کی چھوڑی رقم کیا ملی، وارے کے نیارے ہو گئے۔ چہیتے اور دلارے بھائی ذاکر حسین نے مستقل انہی کے گھر ڈیرے ڈال لئے۔ آج یہ کاروبار کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں تو کل دوسری دکانداری کی رائے ہو رہی ہے۔ آج ایک پارٹی کھانے پر مدعو ہے تو پرسوں کسی اور طرف کی مہمان داری ہے۔

بھائی کے ایک اشارے پر مرغے پہ مرغا ذبح ہو جاتا۔ بریانی دم ہو رہی ہے۔ شب دیگ چڑھی ہے شامی کباب بن رہے ہیں۔ نہاری تیار ہو رہی ہے۔ کسی کاروباری کو پٹنے کے واسطے قوالی جمی ہے۔ تاش کی بازی جمی ہے غرضیکہ ان لوگوں کا دن عید اور رات شب برات تھی۔

ذاکر حسین کو نوٹ پر نوٹ گنواتی چلی جاتیں مگر پیشانی پر بل تک نہ پڑتا۔ خود نائمہ بیگم کی اپنی سرگرمیاں بھی کم نہ تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سہیلی باز تو ہمیشہ کی تھیں۔ اب بالکل ہی کھل کھیلیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ کپڑے سلوائے کبھی کسی کے ہاں شادی میں جا رہی ہیں۔ کہیں رتجگا ہے۔ کہیں محفل میلاد وہ کہیں گانے ہوں یا محفلِ سماع --- ختنہ ہو یا چالیسواں، ان کا پہنچنا لازمی ہوتا مجال ہے جو کسی مجلس سے غیر حاضر ہو جائیں۔

پھر اپنے ہاں بھی ایسی محفلیں سجانے سے نہیں چوکتی تھیں۔ مہینے دو مہینے میں محفل قوالی کا اہتمام تو ضروری ہوتا۔

چہل پہل اور رونق کے شوق ہی شوق میں انہوں نے ایک دن دلشاد کی ختنہ انتہائی دھوم دھام سے کروائی اور خوب خوشیاں منائیں۔

بھائی کے ہاں تیسرا بیٹا ہوا تو اپنی طرف سے میراثنیں بھیج دیں اور اپنے گھر پر بھی تین دن تک ڈھولک رکھوائی اور موتی چور کے بڑے بڑے لڈو بنوائے۔

الغرض

شور و شغب اور دھوم دھام کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ گو کہ یہ تمام حرکتیں وہ اسرار احمد کی زندگی میں بھی بڑی تندہی سے کرتی تھیں مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کے انتقال کے بعد سے زیادہ آزاد اور منہ زور ہو گئی تھیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ ایک دم روپے پیسے کی افراط ہو --- لیکن بہر حال --- بات بھی طے شدہ ہے کہ روپیہ پیسہ آنی جانی شے ہے۔ اس سے بڑھ کر دو غلی چھلاوا کوئی بھی نہیں --- آج یہاں ہے تو کل وہاں --- یہ بے فیض بھلا کس کے پاس رکی؟ جو نائلہ بیگم کو دغا نہ دیتی!

اول تو وہ خود بھی شاہ خرچ کم نہ تھیں اوپر سے ذاکر حسین کی دھوکے بازیاں۔ "کاروبار --- وہ کاروبار۔" کے چکر میں کتنی ہی رقم اینٹھ گئے۔ بہن کے روپے کے طفیل لالو لال بنے بے ملک کے نواب کی طرح گھوما کرتے۔

اسرار احمد کی چھوڑی ہوئی رقم تمام ہوئی تو ان باغوں کی باری آئی جو ایک زمانے میں اسرار احمد نے بڑے شوق سے خریدے تھے۔

بعد ازاں نوبت ایں جا رسید۔ ایک ایک زیور وقتاً فوقتاً بکنے لگا۔ ذاکر حسین کوئی ایک زیور رومال میں چھپا کر لے جاتے اور کچھ رقم لا کر ہمشیرہ کے ہاتھ میں دے دیتے۔

دنوں یہی سلسلہ چلا۔

لیکن آخر کب تک ---

عادت تو شاہ خرچی کی تھی۔ پیسے کی کمی اور بڑھتے ہوئے مسائل نے نائلہ بیگم کو دن میں تارے دکھا ڈالے۔ انہیں ہر وقت چڑچڑاہٹ اور کوفت کے دورے پڑنے لگے۔ نہ وہ اگلے تلّلے رہے نہ عیش و عشرت۔ ایک محدود قسم کی زندگی ان پر مسلط ہو کر رہ گئی۔ محفلیں اجڑ گئیں۔ ڈھولک کی تھاپ ختم ہو گئی اور میلوں ٹھیلوں اور "بائیسکوپ" کے مزے لٹ گئے۔ انہیں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا دکھائی دینے لگا۔

ان سے زیادہ فکرمند ان کے بھائی ذاکر حسین تھے۔ جو روپے کوڑی کے ختم ہوتے ہی اپنے پر پرزے سمیٹ کر دوبارہ اپنی اماں کے گھر پڑاؤ ڈال چکے تھے۔ سچ ہے مصیبت کے وقت سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

❁

ذاکر حسین اسی سوچ میں تھے کہ اب دیکھنے بھالنے والے عزیز رشتے دار کیا کہیں گے؟ آپا جان کا خرچ کہاں سے چلے گا؟ ظاہر ہے وہ خود تو یہ بار اپنے سر لینے سے رہے تھے --- اگر ایسے ہی فرض شناس ہوتے تو ان کا روپیہ بگاڑتے ہی کیوں؟

انہوں نے اس سے قبل کہ حالات مزید مخدوش ہو جاتے، ادھر ادھر دو چار مشاطہ دوڑا دیں۔ مکمل کوائف بیان کر دیے گئے کہ ایک صاحب حیثیت بیوہ کے لئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رشتہ درکار ہے۔ بشرطیکہ نکاح کے لئے آنے والا ان کے تین عدد یتیم بچوں کا بوجھ بھی بخوشی اٹھانے پر رضامند ہو۔"

اس کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔

اور جلد ہی دو ایک رشتے آ موجود ہوئے۔

چند ایسے بھی تھے جو صاحب حیثیت تو تھے لیکن صرف نکاح کے آرزومند تھے۔ بچوں کو رکھنے سے انکار کر رہے تھے۔ ذاکر حسین ایسے صاحبان کو کورا جواب اوپر ہی اوپر سے دے دیا۔ بھلا وہ خود کیسے ایک ساتھ تین بچوں کی ذمہ داری قبول کر سکتے تھے۔ اب یہ تو کوئی دوسرا ہی دل والا ہو سکتا تھا جو ان بچوں کا بوجھ بخوشی اٹھا سکتا۔

چنانچہ یہ وہی وقت تھا جب گل میاں کے ابا میاں نکاح ثانی پر رضامند ہو گئے۔ ان کا یہ رشتہ ان کے ایک قریبی دوست کی معرفت طے ہوا تھا جس میں ان کے بیٹے گل نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

رشتے کی ابتدائی بات چیت طے کرنے کے بعد ذاکر حسین نے اپنی بیوی شاہ بانو کو سمجھایا کہ وہ کسی طرح آپا جان سے اس رشتے کا تذکرہ کرے اور اندازہ کرے کہ وہ بھی نکاح ثانی کے لئے رضامند ہیں یا کہ نہیں۔

لہٰذا شاہ بانو نے انتہائی ہشیاری اور چابکدستی کے ساتھ نائمہ بیگم کو شیشے میں اتارا۔ بچوں کے محفوظ مستقبل اور خود ان کی بھلائی اور سکون کے لئے ایک سرپرست مرد کی ضرورت پر خوب بڑھ چڑھ کر تقریریں کیں اور بار بار ان کو اس امر کا احساس دلایا کہ تین تین بچوں سمیت ان کو قبول کرنا کسی معمولی ظرف اور حیثیت کے مالک مرد کا کام نہیں ہے۔ جس جگہ ہم آپ کا رشتہ طے کر رہے ہیں انتہائی پڑھے لکھے بردبار اور صاحب حیثیت شخصیت کے مالک ہیں۔ خدا کا دیا ان کے پاس سب کچھ ہے۔ پہلی بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا، سرکاری ملازمت کے علاوہ اچھے کھاتے پیتے گھرا فا

سے تعلق ہے۔

نائمہ بیگم یہ سب کچھ سن کر قدرے خاموش سی ہو گئیں۔ ہر جانب سے پیسے کی آمد بند -- خالی ہاتھ جھاڑے بیٹھی تھیں۔ بھائی کے سرد رویئے کو بھی خوب سمجھ رہی تھیں۔ اتنی جہاندیدہ تو تھیں ہی کہ اپنوں کی بدلی بدلی نگاہیں پہچان لیتیں۔ سمجھ چکی تھیں کہ خالی ہڈی تو کتا بھی سونگھ کر چھوڑ جاتا ہے۔

مگر گلہ کس سے کرتیں اب سب کچھ اپنا ہی کیا دھرا تھا۔ اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری تھی۔

اب ان کو نثار احمد کے کہے ہوئے الفاظ اور ان کی اہمیت کا پوری شدت سے احساس ہوا۔ دل ہی دل میں خاصا پچھتائیں۔ پشیمان ہوئیں۔ مگر یہ تاثر تادیر قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ انہی دنوں ذاکر حسین نے ایک دن ابا میاں کو ان کے دوست کے سمیت کھانے پر مدعو کر لیا اور اسی موقع پر شاہ بانو نے نائمہ بیگم کو بہانے سے بلوا کر کھڑکی سے اندر کا منظر دکھا ڈالا۔

نائمہ بیگم نے بالکل ہی خاموشی اختیار کر لی۔

اور ان کی یہی خاموشی، رضامندی سمجھ لی گئی۔ ابا میاں یوں بھی انتہائی رعب دار، باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی پرجلال آنکھیں اور --- اونچا لمبا قد -- وہ اپنی اصل عمر سے بہت کم دکھائی دیتے تھے --- پھر انتہائی شریف النفس اور خاندانی بندے -- چہرے بشرے کے باوقار سبھی دیکھنے والوں نے بے حد پسند کیا۔

اور تو اور نائمہ بیگم کی والدہ، بانو بیگم کو بھی یہ رشتہ پسند آیا۔ حالانکہ ذاکر حسین نے ان کی رائے تک لینی ضروری خیال نہ کی تھی۔

یوں ایک جمعے کے دن بے حد سادگی اور خاموشی کے ساتھ نائمہ بیگم، ابا میاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے عقد میں دے دی گئیں۔ سادگی کے باوجود ان کی طرف سے کئی ایک بھاری کامدار جوڑے اور وزنی زیورات چڑھائے گئے تھے۔

اسی موقع پر ذاکر حسین نے ایک کارنامہ اور کر دکھایا۔

اور۔۔۔وہ یہ کہ

کچھ پچھلا قرض چکانے کے نام پر، چلتے چلاتے نائمہ بیگم کا گھر بھی فروخت کر ڈالا۔ یوں اسرار احمد مرحوم کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں جو آخری یادگار گھر رہ گیا تھا، نائمہ بیگم اور ان کے بچوں کا حقیقت میں ساری زندگی کے لئے اس سے بھی واسطہ چھوٹ گیا۔

نکاح کے ابتدائی ہفتے تک تو تینوں بچے اپنی نانی اماں کے ہاں رہے۔ پھر ایک دن نائمہ بیگم نے کلو میاں کو بھجوا کر انہیں بلوا لیا۔ یہاں سہارن پور کے بہترین علاقے میں ابا میاں نے دو منزلہ مکان لے رکھا تھا اور یہیں اوپر کے حصے میں نائمہ بیگم نے اپنا رہائش اختیار کر رکھی تھی۔

یہاں آنے سے قبل مشکبار جب تک نانی کے ہاں رہی، دن میں کئی مرتبہ شمشاد اور دلشاد کو لے کر اپنے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے ضرور جایا کرتی تھی، جو اس کے اور اس کے بھائیوں کی جائے پیدائش تھا۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کا بہترین اور بے فکر دن گزارا تھا۔ جہاں باپ کی شفقت اور محبت پل پل ہمراہ رہی تھی اور جہاں اس نے محبت کرنے والے باپ کو زندگی کا آخری سفر کرتے ہوئے دیکھا اور اپنی تتی ہوئی کائنات دیکھی تھی۔

پھر بعد کے حالات نے اسے بے حس اور زندگی سے اتنا مایوس کر دیا تھا کہ اب اس میں زندہ رہنے کی کوئی آرزو باقی نہ رہی تھی۔ جس رات اسے باپ کی یاد آ جاتی تو اس کا تکیہ صبح تک آنسوؤں کی نمی سے بھیگا رہتا۔ مگر وہ قدرت سے لڑ سکتی تھی نہ اپنی

تقدیر سنوار سکتی تھی۔

❁

اگلی صبح بادل تو چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے مگر فضاء میں حبس اور گھٹن کا یہ عالم تھا کہ سانسیں رکتی ہوئی لگ رہی تھی۔

کچھ تو پریشان الذہنی کی وجہ سے رات گئے جاگتے رہنے سے اور رونے سے مشکبار کی آنکھیں متورم اور گلابی گلابی ہو رہی تھیں۔ چہرہ بہت زیادہ اترا سا لگ رہا تھا اور وہ ہر روز کی نسبت بہت سست تھی۔

دلشاد اور شمشاد کو ناشتہ کروانے کے ساتھ ہی اس نے خود بھی چند نوالے توڑ لئے تھے۔ بھوک ذرا سی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرے گرمی کی شدت نے جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ موسم ایک دم ہی دوبارہ..... گھٹن آمیز اور گرم ہو گیا تھا۔

کل نائمہ بیگم کی بے رخی اور یوں اکیلے چلے جانے سے اس کی حساس طبیعت بجھ کر رہ گئی تھی۔ اور اس کا دل ایک پل بھی یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ بچوں کو بلاوجہ یہاں گاؤں میں، چھوڑ جانے کا جواز تو کچھ بھی نہ تھا۔

مشکبار کو رہ رہ کر اپنا آپ چھوٹا چھوٹا اور حقیر سا لگنے لگا تھا۔

وہ بار بار سوچتی تھی۔

"اماں نے یہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ یہ لوگ اپنے دل میں کیا سوچتے ہوں گے کہ ڈھائی تین ہو گئی..... مہمان داری کے بعد بھی دل نہ بھرا اور بچوں کو ہمارے سر ڈال گئی ہیں۔ آخر کوئی تک بھی تو ہو چھوڑ جانے کے۔"

وہ یہی سب سوچ سوچ کر کڑھتی رہی۔

دوپہر کے وقت وہ نیم کے نیچے پلنگ پر دلشاد کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ فاطمہ پھوپھو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آ بیٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈنڈی والا خوبصورت سا جھالر لگا پنکھا تھا جسے وہ مسلسل جھلے جا رہی تھیں۔ ویسے نیم کی گھنی اور گہری چھاؤں میں قدرے سکون اور تراوٹ کا احساس ہو رہا تھا، گرمی بھی کچھ کم کم تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح جمے ہوئے تھے۔

دلشاد کچھ دیر کسمسانے کے بعد سو چکا تھا۔

مشکبار خاموشی سے سر جھکائے دائیں پیر کی انگلیاں مروڑے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فاطمہ پھوپھو بے حد نرمی سے کہنے لگیں۔ "بیٹی! تم آج بہت چپ چپ ہو۔ پریشان لگتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

مشکبار نے چونک کر انہیں دیکھا مگر منہ سے کچھ بولی نہیں۔ اس سے جواب ہی نہ بن پڑا۔

اب پھوپھو نے ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپکی اور پہلے سے زیادہ محبت سے بولیں۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے مشکبار! یہاں خدا کی مہربانی سے کسی طرح کی اونچ نیچ ہے اور نہ بے جا تکلف کا رواج ہے۔ بے شک تمہاری اماں تمہیں یہاں اپنی مرضی سے چھوڑ گئی ہیں مگر اس میں کوئی حرج نہیں۔ تم ہمارے لئے ہماری بیٹی کی طرح ہو جس طرح جی چاہے بے فکری سے رہو۔ مگر خوش رہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کل اپنی اماں کے چلے جانے کے بعد سے تم کچھ زیادہ ہی خاموش خاموش اور اداس سی ہو گئی ہو۔ بے شک یہ ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں۔ تمہارے لئے اِس اور اُس گھر میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ رات کو بھی میرا خیال ہے تم روتی رہی ہو آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔"

فاطمہ پھوپھو کی نرم و ملائم گفتگو سے اس کے دل پر مزید چوٹ لگی۔ باوجود ہزار ضبط کے اس کی آنکھیں دوبارہ بھیگنے لگیں۔ پھوپھو نے فوراً اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا

اور شہد آفریں لہجے میں پوچھا۔

"کیوں--- میں سچ کہہ رہی ہوں نا؟ مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

مشکبار اور بھی زیادہ بے قراری سے رونے لگی۔

بہت دنوں کے بعد سچا خلوص اور محبت بھرا لہجہ سنائی دیا تھا۔ بے چین روح پر میٹھے میٹھے پیار کی مدھ بھری ٹھنڈک پھوار کی طرح برس گئی تھی۔ اسے سکون کا احساس تو بہت گہرا ہوا تھا مگر ساتھ ہی آنسو بھی نکل پڑے۔ جانے کیوں!

جلد ہی اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا اور آنسو پونچھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی، "نہیں پھوپھو--- ایسی غیریت والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اب آپ سب کو ہی اپنا سمجھتی ہوں۔ دراصل--- کل--- مجھے کل یقین نہیں تھا کہ اماں ہم تینوں کو--- واقعی چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ بس اس لئے ذرا طبیعت گھبرا گئی تھی۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اس میں گھبرا جانے کی کیا بات ہے!" انہوں نے نہایت ہمدردی سے سمجھایا۔ "یہ بھی تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ سنا ہے وہاں سہارن پور میں گرمی اور برسات کی وجہ سے کالرے کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ چند دنوں کے بعد جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو وہ تمہیں بلوائیں گی۔ تب تک آرام اور سکون سے یہاں رہتی رہو---"

مشکبار خاموش ہو گئی۔

ان کی ان محبت آمیز اور خلوص والی باتوں کا کیا جواب دیتی۔

جتنی اپنائیت اور سچائی ان کی باتوں میں تھی، وہ تو ترس گئی تھی ایسے لہجوں، ایسی باتوں اور ایسے جذبوں کو۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔

پھر وہ خود ہی یہ سوچ کر کہ اس کے یوں رونے کا پھوپھو جانے کیا مطلب لیں،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہیں مطمئن کرنے کے لئے وضاحت سے بولی۔ "حالات کیسے ہی رہے، اماں نے ہمیشہ رکھا ہمیں اپنے ساتھ ہی ہے یا پھر ہم لوگ اپنی نانی اماں کے ہاں رہا کرتے تھے۔ اس لئے اچانک جب اماں ہمیں یہاں چھوڑ کر اکیلی چلی گئیں تو مجھے رونا آ گیا۔ اور پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ .... اگر آج ہمارے ابا میاں ہوتے تو ہمیں ساتھ لے کر جاتے۔"

پھوپھو کے دل پر چوٹ سی لگی، وہ سوچنے لگیں۔

"..... تو یہ چھوٹی سی حساس لڑکی ہر وقت اس سوچ میں ڈوبی رہتی ہے! سچ ہے اپنے سگے باپ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی سچا اور پاک رشتہ نہیں۔"

رنجیدہ لہجے میں کہنے لگیں۔ "بس بیٹی! یہ تو اپنے اپنے نصیب کے لکھے ہیں۔ اس لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ نہ تم نہ میں۔ خدا تم کو حوصلہ دے۔ یہ بھائی بڑے ہو جائیں گے اور پھر تمہاری شادی بیاہ ہو جائے تو بہل جاؤ گی۔ اللہ بہت خوشیاں دے گا۔ اس سے اچھی اچھی دعائیں مانگا کرو۔ آج ہی سے نماز پڑھنی شروع کر دو۔ انشاء اللہ سارا پریشانیاں اور دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہر نماز کے بعد ایسا سکون اور سرور محسوس کرو گی کہ صبر و قناعت کرنا سیکھ جاؤ گی۔"

ان کے آخری جملے سن کر مشکبار نے بے بسی سے سر جھکا لیا اور بے چارگی سے جواب دیا۔ "پھوپھو! ہمیں نماز آتی نہیں، بیچ بیچ میں بھول جاتے ہیں۔"

وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ "کیوں---! تمہاری اماں یا نانی نے سکھائی نہیں کبھی!"

"اماں خود پڑھتی ہیں نہ انہوں نے کبھی سکھائی۔ نانی کے پاس ہم لوگ بہت رہے ہیں۔ جب ہمارے ابا میاں زندہ تھے تو ایک مولوی صاحب روز ہمیں قرآن شریف پڑھانے اور نماز سکھانے آیا کرتے تھے۔ مگر ابا میاں کے فوت ہو جانے کے اماں نے مولوی صاحب کا آنا بند کروا دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ پیسے بہت لیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں جو آتا تھا وہ بھی بھول گئے۔ نماز کئی دفعہ پڑھنے کی کوشش کی مگر---

کہیں بھول جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس نماز میں کتنی سنتیں ہوتی ہیں اور کتنے فرض اور نفل وغیرہ۔"

فاطمہ پھوپھو کو اس کی بھولی بھالی باتیں سن کر نہایت افسوس ہو رہا تھا۔ اس کی صاف گوئی سے متاثر بھی ہو رہی تھیں۔

وہ بھی آج دل کھول کر بول رہی تھی۔ شاید اس کے دل کی بھڑاس نکل رہی تھی اور وہ لاشعوری طور پر ایسا چاہ رہی تھی، پھر پھوپھو کی غمگساری نے راستہ کھول دیا تھا۔

"پھر تو تم نے قرآن شریف بھی نہ پڑھا ہو گا۔"

"نہیں---" اس نے بہت شرمندگی کے عالم میں گردن ہلا دی۔

پھوپھو کچھ دیر افسوس کے عالم میں سوچتی رہیں۔

دھیرے دھیرے اسے بھی اور خود کو بھی پنکھا جھلتی رہیں۔

پھر..... فیصلہ کن لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ٹھیک ہے جتنے دن بھی تم یہاں رہو روزانہ صبح میرے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بیٹھا کرو۔ اس کے علاوہ میں تمہیں نماز پڑھنا بھی سکھلاؤں گی۔ دھیرے دھیرے تم انشاء اللہ سارے اسلامی امور سیکھ جاؤ گی۔ اس طرح تمہارا دل بھی لگ جائے گا اور اہم ترین باتیں بھی آ جائیں گی۔ دیکھو بیٹی! ایک لڑکی کے لئے نماز روزہ اور تلاوت کلام پاک خواہ وہ دن میں ایک دفعہ ایک رکوع ہی کی جائے انتہائی ضروری اور بہتر ہے کبھی کبھی فرصت پا کر میں تمہیں اور بھی بہت سے مسئلے مسائل سے آگاہ کروں گی۔ تم ایک طرح سے نہ صرف یہ کہ بن باپ کی بچی ہو بلکہ اس لحاظ سے ماں کی اصل ممتا اور اس کی طرف سے اولاد کو ملنے والی مراعات اور محبت و الفت سے بھی محروم ہو۔ اس لئے میرے نزدیک تمہارے کام آنا ہمارا فرض بھی ہے اور ثواب کا کام بھی بس شرط یہ ہے کہ تم بھی مجھ سے تعاون کرنا اور پورے شوق اور لگن سے پڑھنا شروع کرنا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشکبار جوان کی باتیں بڑی عقیدت، شوق اور غور سے سن رہی تھی ایک دم سے ہی ان سے چمٹ کر رونے لگی۔

پھوپھو اسے ممتاز بھرے انداز میں آہستہ آہستہ تھپک کر خاموش کرانے لگیں۔

اس دوپہر کے بعد مشکبار میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا اور اس خوشگوار انقلاب کا واحد سبب پھوپھو فاطمہ کی سکھ بانٹنے والی ہستی تھی۔

ایک بات اور بھی اس نے خود بخود سمجھ لی تھی۔ اور وہ یہ کہ دن بھر میں سکینہ بھابی اور رئیسہ کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹانے لگی تھی، کبھی آٹا گوندھ دیا۔ کبھی مسالہ پیس دیا-- صفائی کر دی۔ ان کے بچوں کو سنبھال لیا۔ وہ دونوں یوں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھتی تھیں، اب مزید خیال رکھنے لگیں۔

سب سے پہلے اسے پھوپھو نے فجر کی نماز پڑھنی سکھائی تھی۔ سویرے اس کی آنکھ جلدی کھل جاتی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد سپارہ لے کر پھوپھو کے پاس جا بیٹھتی۔ اس کے سبق سنانے اور مزید یاد کرنے تک سکینہ بھابی باورچی خانے کا رخ کرتیں۔ وہ سپارہ رکھ کر خوشی خوشی ناشتے کے لئے آٹا گوندھ دیتی، یہ سارے کام وہ دلشاد اور شمشاد کے جاگ اٹھنے سے پہلے پہلے کر لیتی۔ پھر دونوں بھائیوں کو ناشتہ کروانے کے بعد نہلا کر کپڑے بدلوا دیتی اور میلے کپڑے دھو کر پھیلا دیتی پھر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دیورانی جیٹھانی کا ہاتھ بٹاتی رہتی۔

عصر کے وقت دوبارہ پھوپھو کے پاس پڑھنے بیٹھ جاتی۔

قدرتی طور پر وہ ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی تھی۔ بہت جلد ساری نمازیں پڑھنا سیکھ گئی۔ قرآن پاک کا سبق بھی پھوپھو جتنا صبح کے وقت دیتیں، وہ شام کو سنا ڈالتی۔

ان معمولات نے جیسے اسے صبر و سکون کے خزانے عطا کر ڈالے۔ چہرے پر ہر وقت ایک نور اور پاکیزگی احاطہ کئے رہنے لگی۔ اب تک جن سلیقوں اور حسن کا اس کی زندگی

میں دور دور تک بھی شائبہ نہ تھا اس کے اندر جذب ہونے لگے تھے اسے از خود اپنا یہ روپ بہت پسند آیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اب اس کا دل بھی یہاں لگنے لگا تھا۔ اور اس گھر کے سارے افراد دھیرے دھیرے اسے اپنے محسوس ہونے لگے۔ بچوں کے ساتھ شفقت اور بڑوں سے ادب و احترام نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے۔ گھر والوں کے علاوہ کنبے کے آنے جانے والے بھی اس کے اچھے اخلاق اور خوش اطواری کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے تھے۔

یوں رفتہ رفتہ اس نے ایک قطعی غیر اور اجنبی ماحول اور افراد کو اپنا گرویدہ کر لیا اور خود ان میں جذب سی ہو گئی۔

فاطمہ پھوپھو تو اس سے بہت ہی مانوس اور خوش تھیں۔ ہر موقع پر اس کی تعریف میں چند جملے ضرور کہتیں۔ ایسی اطاعت گزار، سمجھ دار، ذہین اور سعادت مند لڑکی جو ان کی ذرا سی محنت اور توجہ سے نکھرتی سنورتی چلی گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نائمہ بیگم کو گاؤں سے گئے تقریباً ایک ماہ گزر گیا مگر انہوں نے پلٹ کر تینوں بچوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ بلوایا۔

مشکبار کے دل و دماغ گو کہ نئے مشاغل میں الجھ کر پہلے کی نسبت بہت بہل گئے تھے لیکن پھر بھی آخر انسان ہی تھی۔ جب بھی رات کے اندھیرے میں ماں کی یاد آجاتی اس کی آنکھوں سے نیند یکلخت اڑ کر رہ جاتی اور وہ ان کے رویے اور سخت دلی پر غور کرتے کرتے رات کے آخری حصے میں سو جاتی۔

اسے حیرت ہوتی تھی کہ اماں کیسی ہو گئی ہیں۔ اگر اسے نہیں تو کم از کم ننھے دلشاد اور شمشاد کا خیال تو کر لیں۔

وہ تو کہیے یہاں کے لوگ ہی نہایت خدا ترس اور نرم دل واقع ہوئے تھے ورنہ طعنے تشنوں کے ساتھ کلیجے چھلنی ہو جاتے۔ سوتیلے رشتے ناتوں کے ساتھ یوں مستقل ہی جڑ کر رہ جانا معمولی بات تو نہ تھی! مگر نائمہ بیگم کو ان نزاکتوں کی بھلا کب پرواہ ہوتی۔

دلشاد نے کئی دن تک رو رو کر مشکبار کا آرام و چین لوٹا تھا۔ مگر پھر بالآخر سنبھل گیا تھا۔۔ سنبھلتا نہ تو کیا کرتا۔

ہاں شمشاد کی فطرت کچھ عجیب ہی ٹھس اور بے حس سی تھی۔ اس نے ماں کی

جدائی کی کچھ ایسی پروا نہیں کی تھی۔ یا پھر شروع سے محرومیوں اور تشنگی نے اسے رویے کا عادی کر دیا تھا۔ بہر کیف---اس نے بہن کو تنگ نہیں کیا۔ سارا سارا دن اپنے کم سن بچوں کے ہمراہ نیم کے نیچے کھیلتا رہتا---

ایک دوپہر، مشکبار سکینہ بھابی سے اجازت لے کر بانو کے ہاں آگئی۔

یہ لوگ فاطمہ پھوپھو کے سگے عزیزوں میں سے تھے۔ بانو انہی کی منجھلی لڑکی کا نام تھا۔ اور اسی لڑکی سے پھوپھو نے گل کی نسبت طے کر رکھی تھی۔ گو کہ دیہاتوں میں منگنیاں اور خاص طور پر بچپن کی منگنیاں کسی خاص دھوم دھام سے نہیں رچائی جاتیں۔ تاہم کوئی نہ کوئی ایسی رسم ضرور ادا کر دی جاتی ہے جس کے ذریعے ہر رشتے دار اور خاص و عام کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں لڑکے سے فلاں لڑکی کی نسبت ٹھہرا دی گئی ہے اس طرح ہوتا یہ ہے کہ لڑکی کے بقیہ امیدوار، اس لڑکی کے حق میں دستبردار ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

ایسا ہی گل اور بانو کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

لیکن یہ ہے کہ گل چونکہ فاطمہ پھوپھو کا بہت ہی چہیتا اور لاڈلا بھتیجا تھا مزید یہ کہ سب میں چھوٹا تھا، اس لئے پھوپھو نے ان کی نسبت ذرا اہتمام اور شوق سے ٹھہرائی تھی۔ تین دن تک حلوائی دروازے پر کڑھائی چڑھائے رہا تھا اس لئے کنبے کے ہر چھوٹے بڑے کو اس نسبت کا ایک ایک رتی حال معلوم تھا۔ سب لڑکیوں بالیوں کو وہ دلفریب منظر تو کبھی بھلائے نہ بھول سکتا تھا جب شرماتی بجاتی بانو کو پھوپھو کے ہاں سے آیا ہوا گلابی رنگ کا ریشمی جوڑا پہنایا گیا تھا۔

بانو، مشکبار کی تقریباً ہم عمر تھی۔ اس لئے دونوں کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ملتیں تو گھنٹوں ایک دوسری سے باتوں میں مصروف رہتیں۔ بانو اسے بچپن کے قصے اور سہیلیوں کی باتیں سنایا کرتی۔ مشکبار کے پاس اسے سنانے کو کچھ نہ ہوتا مگر وہ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی بھولی بھالی باتیں دلچسپی سے سنتی۔ بانو میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے کبھی بھی مشکبار سے اس کے حالات کریدنے کی کوشش نہ کی تھی۔

اس وقت بھی وہ دونوں ایک پلنگڑی پر پاس پاس بیٹھتی تھیں۔ بانو ایک میزپوش پر رنگ برنگے ریشمی دھاگوں سے خوشنما پنکھڑیوں والا پھول کاڑھ رہی تھی۔ وہ اس ہنر میں خاصی تیز معلوم ہو رہی تھی۔ مسلسل باتوں میں بھی مصروف تھی اور ہاتھ بھی چل رہا تھا۔

❀

کچی مٹی کا بنا ہوا یہ بڑا سا کچا گھر مشکبار کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی خوبصورتی میں سارا ہاتھ گھر کی عورتوں کا تھا، چکنی مٹی سے بنائے ہوئے گل بوٹے، چھوٹی چھوٹی دیواروں پر رکھے ہوئے برج، کمروں میں برتن سجانے کے چھجے اور ان پر ابھرے ہوئے نقش و نگار --- زمین کا فرش ایسا لپا پتا اور چکنا گویا پکا ہو۔

یہ سب عورتوں کی محنت اور ہنر مندی تھی۔ خاص طور پر رات کے وقت تو یہ گھروندا چاندی کی لہروں میں دھلا دھلایا بہت ہی اچھا لگتا۔ آنگن میں بنی ہوئی بڑی بڑی سالانہ اناج ذخیرہ کرنے کی کچی کوٹھریاں اوپر سے اتنی چکنی چکنی، صاف و شفاف اور چمکتی ہوئی نظر آتیں، جیسے چکنی مٹی کی مخروطی پہاڑیاں کھڑی ہوں ---

بڑے صحن میں پیپل کا بلند و بالا درخت کھڑا جھومتا رہتا۔ ہوائیں زور زور سے چلتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے پتے تالیاں بجا بجا کر رقص کر رہے ہوں۔ بانو سوئی میں نیا دھاگہ پروتے ہوئے شوخی سے بولی۔

"مشکبار! تم بھی اپنا جہیز کاڑھنا پرونا شروع کر دو، آخر کب یہ سلسلہ شروع کرو گی۔"

مشکبار نے شرارت سے اسے دیکھا اور ہنس کر بولی۔ "میری فکر چھوڑو۔ یہ کہو

میرے بہانے یہ جتانا چاہ رہی ہو کہ مجھے معلوم ہو جائے تم یہ میزپوش اپنے جہیز کے لئے کاڑھ رہی ہو --- کیوں! ہے نا یہی بات!"

وہ قدرے لجا سی گئی۔ مگر ڈھیٹ بن کر جواب دیا۔ "تو اس میں شک کیا ہے۔ ہمارے ہاں کا رواج ہے جب لڑکیاں سیانی ہو جاتی ہیں سائیں ان کو کپڑے، دھاگے اور سوئیاں، کروشیئے اور سلائیاں وغیرہ خرید کر دے دیتی ہیں اور لڑکیاں فرصت کے اوقات میں تھوڑا تھوڑا کاڑھتی پروتی رہتی ہیں۔ اس طرح ایک طرف جہیز تیار ہوتا رہتا تھا اور دوسری طرف ماؤں کی فکر کم رہتی ہے۔ شغل کا شغل، کام کا کام۔"

مشکبار اسے ستانے کو بولی۔ "بڑی اماں دادیوں کے انداز میں سوچتی ہو اور صورت سے ایسی بھولی بھالی لگتی ہو جیسے بات بھی کرنی نہیں آتی۔ تمہارے تو پیٹ میں داڑھی ہے بانو۔"

بانو کو اس کے مثال دینے پر ہنسی آ گئی، وہ زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔ "ایک تو یہ تم شہر والے کہاوتیں بڑی عجیب عجیب دیتے ہو۔ یعنی کہ پیٹ میں داڑھی، گویا میں لڑکی نہ ہوئی داڑھی والا بابا ہو گئی۔"

مشکبار بھی اس کے مذاق پر ہنسنے لگی۔

عین اس وقت جبکہ یہ دونوں بآواز بلند ہنس رہی تھیں، گل باہر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے اور اسی طرف آتے ہوئے زور سے بولے۔ "ارے ارے...... ایسے زور سے مت ہنسو کہ کوا بے چارہ شرما جائے۔"

بانو کی ہنسی میں فوراً بریک لگ گئے۔ اس نے جلدی سے دور پڑی اوڑھنی سنبھالی اور اپنا سامان سمیٹ کر تیزی سے اندر بھاگ جانے کی کوشش کی، مگر مشکبار نے بڑھ کر مضبوطی سے کلائی پکڑ لی اور شرارت آمیز لہجے میں بولی۔

"کہاں بھاگ رہی ہو، بھائی جان ہی تو آئے ہیں کوئی جن بھوت تو نہیں آ گیا!"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گل جو آتے ہی دوسری چارپائی پر براجمان ہو چکے تھے چھیڑتے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ "ارے بھئی تم نہیں روک سکتیں ان کو مشکبار--- میں دل ہی دل میں لاحول پڑھتا آیا ہوں۔ ان کا بھاگ جانا تو لازم و ملزوم ہے۔"

مشکبار ہنسنے لگی۔

بانو کھسیانی سی ہو کر ان کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔

ایک ہی کنبہ اور ایک ہی گاؤں ہونے کی وجہ سے بانو کا گل سے پردہ تو نہیں تھا اور نہ ہی کبھی بزرگوں نے ایسی ضرورت سمجھی تھی، مگر وہ خود بخود ہی ان سے سامنا کرنے پر جھجکتی تھی۔ کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا تو شرم و حیا سے دوہری ہو ہو جاتی۔

تھوڑی دیر ان تینوں کے درمیان خاموشی کا پردہ حائل رہا۔ پھر گل نے پوچھا۔

"اور سناؤ مشکبار-- یہاں دل لگ گیا یا اب تک اسی طرح گھبراتی ہو!"

وہ ایک دفعہ پھر ہنس پڑی اور خوش دلی سے جواب دیا:

"اب تو بہت دل لگ گیا۔ سب اپنے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ سنایئے آپ نے کیوں اتنے سارے دن لگا دیئے......" وہ کچھ کہتے کہتے اچانک تھم گئی۔ پھر سوچ کر اپنی بات پوری کی۔ "مم...... میرا مطلب ہے کہ اماں نے ہمیں بلوانے کے لئے بھی آپ کو نہیں بھیجا--- شروع میں تو میں ہر روز انتظار کیا کرتی تھی کہ شاید اماں آج بلوا لیں کیونکہ انہیں اکیلے کام وغیرہ کی بھی تکلیف ہو گی۔ مگر بہت دن گزر گئے۔ نہ آپ آئے نہ انہوں نے کوئی اطلاع بھجوائی۔ دلشاد و شمشاد بھی بہت یاد کرتے تھے اور اب آپ ایک ماہ کے بعد آئے ہیں۔ ہمیں لینے بھیجا ہے کیا؟"

وہ ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ گئی--- بہت ساری سنا ڈالیں۔ جیسے پھر کہنے سننے کا موقع نہ ملے گا۔ وہ خاموش ہو گئی تو گل نے مزاحیہ انداز میں ایک ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ "سب کچھ پوچھ چکیں، یا کوئی سوال باقی رہ گیا ہے؟" وہ شرمندگی سے ہنس دی۔

بانو نے دھیرے سے اسے چٹکی کاٹی اور شوخی سے مسکرانے لگی۔ اتنے میں گل کو آتے دیکھ کر بانو کی والدہ اور بھابی بھی ادھر ہی آ گئیں اور سلام دعا کے بعد حال احوال پوچھنے لگیں۔

❁

بانو انہیں دیکھ کر چپکے سے کھسک گئی۔

مشکبار بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ اور اس کے سارے سوال و جواب وہیں کے وہیں رہ گئے۔

ذرا دیر مزید رکنے کے بعد وہ گھر چلی گئی۔

دل و دماغ میں کھدبد سی مچی ہوئی تھی۔ گل کو ایک مہینے کے بعد دیکھا تھا اور دیکھتے ہی ماں کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ کبھی سوچتی۔

"شاید اماں نے بلوا بھیجا ہو۔ تیاری وغیرہ کر لینی چاہئے۔"

پھر خیال آتا۔

اگر ایسی بات ہوتی تو گل بھائی جان آتے ہی کہہ دیتے۔ لانے کو کہا ہی نہ ہو گا اماں نے۔

گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے شمشاد اس کی ٹانگوں سے آ لپٹا۔

"آپا...... گل بھائی جان آ گئے...... گل بھائی جان آ گئے...... مٹھائی لے کر آ گئے۔ وہ ہمیں اماں کے پاس لے کر جائیں گے...... گل بھائی جان آ گئے......"

مشکبار نے استفہامیہ نظروں سے رئیسہ کی طرف دیکھا جو سامنے چارپائی پر بیٹھی کروشیے سے جھالر بن رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"اے یونہی کہہ گئے گل بچے کو بہلانے کی خاطر۔ پھوپھو نے پوچھا تھا۔ کہہ رہے تھے تمہاری اماں نے کہلوایا ہے کہ یہاں ابھی تک گرمی کا زور نہیں ٹوٹا ہے۔ اگر بچے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پریشان نہ کر رہے ہوں تو وہیں رہنے دیں پھر بعد میں بلوالیں گے۔"

اس کورے جواب پر مشکبار کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ دلشاد اب تک مزے سے سو رہا تھا، جیسا وہ سلا گئی تھی۔

رئیسہ نے غور سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں! تم خاموش سی کیوں ہو گئیں! کیا اماں بہت یاد آ رہی ہیں؟"

"نہیں---ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بے بسی سے گردن جھکا کر بولی۔ "میں نے سوچا تھا شاید اب وہ ہمیں بلوا ہی لیں۔"

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے--سچ سچ بتانا!" رئیسہ نے کروشیا روک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

مشکبار نے اسی انداز میں جواب دیا۔ "آپ غلط سمجھیں بھابی! ایسی بات کا دریافت کرنا صرف اسی لئے تو نہیں ہو سکتا کہ خدانخواستہ ہمیں یہاں کسی طرح کی تکلیف ہے۔ مجھے تو بس اماں کی بے پروائی پر تعجب ہو رہا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ چاپ دلشاد کے پاس لیٹ کر کچھ سوچنے لگی۔

رئیسہ نے بھی مزید بات نہیں بڑھائی۔ دوبارہ اپنے کروشیئے اور جھالر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مشکبار کے دل میں سو اندیشے آ رہے تھے، سو جا رہے تھے۔

"اماں نے تو کمال کر دیا بے حسی کی حد گزار دی۔ اب ایسی بھی کیا وہاں گرمی ہو گی کہ خود تو رہ رہی ہیں اور ہم گرمی سہہ نہ سکیں گے! اتنے نازک تو نہیں ہم بہن بھائی۔"

سوچتے سوچتے اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔

خبر نہیں کتنا وقت گزرا ہو گا کہ وہ تیزی سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

دیکھا تو دوسری چارپائی پر گل زانو بیٹھے شرارت سے کہہ رہے تھے،

"اچھا جی--تو آپ پر بھی آپ کی سہیلی صاحبہ کا سایہ پڑ گیا ہے، جیسے وہ سارا سارا دن پڑی اینڈا کرتی ہیں۔ آپ نے بھی خراٹے لینے شروع کر دیئے۔"

وہ سمجھ گئی کہ یہ بانو بے چاری پر فقرے بازی ہو رہی ہے۔

جواب دیئے بغیر وہ اٹھ کر پانی پینے چلی گئی۔ کچی نیند سے اٹھنے پر ایک دم سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔

پانی پی کر واپس آئی تو گل کھانا کھا رہے تھے۔

"آؤ---تم بھی شروع ہو جاؤ۔" وہ مسکرائے۔

"شکریہ---بس آپ کھائیے۔" وہ دلشاد کے قریب بیٹھ گئی۔

جی کو یہی چنتا لگی تھی کہ وہ اماں کی کوئی خیر خیریت سنائیں۔

گل کو جیسے اس کے دل لگی کی خبر ہو گئی تھی۔ کھانا کھا کر انہوں نے ہاتھ دھوئے اور سنجیدگی سے بولے۔

"میں جانتا ہوں مشکبار کہ تم اپنے سوالوں کے جواب لینے کے لئے بے چین ہو۔ بھئی بات یہ ہے کہ اسی خیال کے تحت میں ہوسٹل سے چار پانچ مرتبہ گھر ہو کر آیا کہ شاید اماں تم لوگوں کو لانے کے لئے کہہ دیں۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم گاؤں میں ضرور ادا اور پریشان ہو گی۔ دونوں بھائیوں نے بھی پریشان کر رکھا ہو گا، مگر...... حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے ایسی کوئی ہدایت یا تاکید نہیں کی، پھر پچھلے دنوں میری کالج میں مصروفیات اس نوعیت کی رہیں کہ میں ذاتی طور پر بھی یہاں نہ آ سکا۔ تو بس جناب یہ مجبوری ہے----لے جانے کو تو میں تم تینوں کو آج ہی لے جاؤں۔ مگر پھر اس بات کا خیال آتا ہے کہ وہ سوچیں گی چند دن بچوں کو نہ رکھ سکے۔"

مشکبار نے سوچتے ہوئے لہجے میں پوچھا "اور...... اماں اکیلی سارا کام کس طرح کرتی ہیں؟ واقعی میری ضرورت نہیں ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گل مسکرائے اور بڑے رسان سے بولے۔ "ملازمہ کا انتظام تو جب وہ یہاں سے گئی تھیں، تبھی ہو گیا تھا۔"

"ہوں...... اسی لئے......" اس کا منہ اتر گیا۔

گل اس کی طرف دیکھ کر قدرے تردد سے بولے۔ "آخر تمہیں یہاں رہنے میں کیا عار ہے؟ دل نہیں لگتا کیا؟"

وہ جلدی سے بولی "بھائی جان! اب تو یہاں میرا دل خوب لگ گیا ہے۔ فاطمہ پھوپھو نے تو اس قدر مجھ پر محنت کی ہے کہ کیا بتاؤں۔ نماز پڑھنا سکھایا۔ قرآن پاک بھی ان سے پڑھ رہی ہوں۔ دونوں بھابیاں اپنی بہنوں کی طرح چاہتی ہیں۔ اور کیا چاہئے مجھے۔ دلشاد اور شمشاد بھی خوب بہل گئے ہیں۔ مجھے تنگ نہیں کرتے۔ بس-- ماں چونکہ ماں ہے، اس لئے ظاہر ہے ان کے متعلق بار بار پوچھتی ہوں۔ یہی بات میں ہر کسی سے کہتی ہوں۔ کیونکہ یہاں تو ایسی محبت ملی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ دلشاد کی طرف متوجہ ہو گئی جو سو کر اٹھ گیا تھا اور پیشاب کرنے کو کہہ رہا تھا، مشکبار اسے گود میں لے کر نالی کی طرف چلی گئی۔

گل کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

گل ایک ہفتہ گھر پر رہے۔

مشکبار نے پھر پلٹ کر ان سے اماں کا تذکرہ نہیں کیا۔

ان کے چلے جانے کے بعد دوبارہ وہی شب و روز لوٹ آئے۔ ان کے آجانے سے ذرا رونق کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ کبھی بڑی بھاوج کو چھیڑ رہے ہیں کبھی چھوٹی کو کبھی بچوں کو دھمکا رہے ہیں کبھی فاطمہ پھوپھو سے لاڈ کر رہے ہیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد ہر کوئی دوبارہ اپنے معمول پر آ گیا۔

مشکبار نے ایک بار پھر اپنے آپ کو روزمرہ کے کام کاج میں الجھا لیا۔ پانچوں وقت

کی نماز پڑھتی۔ صبح شام قرآن شریف کی تلاوت کرتی۔

❁

رت اب کچھ کچھ بدلنے لگی تھی۔ صبح کے وقت ٹھنڈک ہونے لگی تھی۔ دیہاتی عورتوں نے لحاف رضائیاں اور گدے دھوپ میں سکھانے شروع کر دیئے تھے۔ پچھلے سال کے گرم کپڑوں کی مرمت ہونے لگی تھی۔

دیہاتوں کے پرانے قاعدے کے مطابق اندر کی کوٹھریوں، چھتوں اور آنگنوں کی بھی لپائی پتائی ہونے لگی تھی۔ تاکہ آتے جاڑوں میں آرام کے ساتھ کمروں میں سو سکیں اور کیڑے پتنگے کا ڈر خوف نہ رہے۔ بھابی سکینہ اور رئیسہ بھی آج کل زیادہ مصروف رہنے لگی تھیں۔ گو کہ لپائی کا کام کرنے والی تیلی عورتیں آ کر مٹی گارے کا کام کرتی تھیں مگر ان دونوں کو ساتھ ساتھ لگا رہنا پڑتا۔

ایک دن فاطمہ پھوپھو بھابھی سکینہ سے کہنے لگیں۔ "اے سکینہ! اس دفعہ تم بڑی کام چوری سے وقت کاٹ رہی ہو۔ اگلے چند دنوں میں رمضانوں کا چاند نظر آنے کو ہے اور تم دونوں ایسے بے فکر ہو رہی ہو کہ نہ سویاں بٹ رہی ہو نہ دالیں پھٹکی ہیں اور نہ ہی بڑیاں توڑی ہیں۔"

سکینہ بھابی نے ذرا چڑ کر جواب دیا۔ "ہائے ہائے پھوپھو! بے فکری کا ہے کی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہی ہیں کہ آج کل سارا دن مٹی گارے سے الجھتے ہو جاتا ہے۔ پھر ہانڈی روٹی بچوں کے سو سو نخرے الگ۔ ذرا ایک طرف سے فرصت ہو لے تو سویاں بھی بن جائیں گی۔"

ان کا لہجہ پھوپھو کو برا لگ گیا، مگر دھیرے سے بولیں۔ "یہ سارے کام اور بچوں کا ساتھ اللہ رکھے سدا ہی ہوتا ہے یہ کہو آج کل باتیں زیادہ بناتی ہو، کام کم کرتی ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس برس تو ڈھیروں کھجور کے تنکے بھی پڑے سوکھا کیے۔ گنتی کی چنگیریں اور ٹوکریاں بناپائی ہو۔"

اب سکینہ بھابی خاموش ہو گئیں۔

یہ حقیقت تھی کہ اس سال وہ قدرتی طور پر سست سی تھیں۔ ورنہ ہر سال برسات کے موسم میں ان کی پھرتی اور تیزی طراری دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ برسات کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی وہ ہاریوں کے پیچھے لگ لیتیں کہ کھجوروں میں نئے پتے پڑ چکے ہوں گے۔ جلدی توڑ کر لاؤ۔ ورنہ دوسرے لوگ لے جائیں گے۔

پھر کھجوروں کے یہ ہرے ہرے پتے یا تنکے، جنہیں یہ لوگ، گھگے، کہتی تھیں، ہاری لاکر ڈھیر کر دیتے اور یہ لوگ ان گھگوں کو رنگ رنگ کر خوبصورت اور دیدہ زیب چنگیریں، ٹوکریاں اور مختلف چیزیں بناتی رہتیں۔

اس وقت ماحول میں تلخی سی رچ گئی تھی جسے رئیسہ نے کم کرنا چاہا۔

"پھوپھو میں نے رمضان تیلی کی بیوی اور لڑکی کو کہلوا بھیجا ہے۔ آج کل وہ تایا کے یہاں سویاں بنوا رہی ہیں۔ پرسوں ہمارے ہاں آئیں گی ہاتھ بٹانے۔"

پھوپھو کچھ نہیں بولیں۔ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئیں۔

پھر مشکبار نے دیکھا کہ ایک دن بیچ کر کے واقعی اگلے دن رمضان کی بیوی اور جوان لڑکی آگئیں۔ زور و شور سے سویوں کے لئے میدہ چھان چھان کر گوندھا جانے لگا۔ سب کی مصروفیات قابل دید تھیں۔ بڑی بڑی چارپائیوں کو دھوپ میں کھڑا کر کے رسیاں باندھ دی گئیں اور مشین میں سے نکلنے والی سویوں کے لچھے کے لچھے توڑ توڑ کر ان رسیوں پر سوکھنے کے لئے ڈالے جانے لگے۔ مشکباز کے لئے یہ سارے کام نئے اور دلچسپ تھے۔

مشین بھی عجیب دلچسپ چیز تھی۔ چکی کے پاٹ کی طرح گول سی۔ رمضان تیلی کی بیوی جو ایک دوہرے جسم کی بھاری بھر کم عورت تھی، وہ اس مشین میں خوب کرا کرا میدہ گولوں کی صورت میں ٹھونسنے کے بعد مشین کے گول پاٹ پر دھرنا مار کے بیٹھ جاتی۔

سویاں آنِ واحد میں کچکچا کچکچا کر باہر نکلنا شروع ہو جاتیں۔ ان لچھوں کو اس کی لڑکی اور رئیسہ، کبھی بھابی سکینہ ہاتھوں پر توڑ توڑ کر رسیوں پر پھیلانے لگتیں۔ اس طرح ایک پہر دن بھی نہ گزرا تھا کہ کافی سویاں تیار ہو گئیں۔

شام کو سکینہ بھابی نے بھون کر تھوڑی سی سویا پکائیں یہ سویاں بازاری سویوں کے مقابلے میں تھیں تو خاصی موٹی موٹی۔ مگر کھانے میں ان کی لذت اور خوشبو بہت مخصوص قسم کی تھی۔ جو مشکبار کو بہت ہی بھلی لگی۔

بعد ازاں ان سویوں کو بھوننے کا مسئلہ ہر سال کی طرح فاطمہ پھوپھو کے ذمے تھا۔ اور وہ تیار بیٹھی تھیں انہوں نے بڑے آنگن میں بنے تنور میں خوب لکڑیاں جھونکیں۔ حتیٰ کہ ان کی جلائی ہوئی لکڑیوں سے تنور سرخ ہو گیا۔ پھر انہوں نے تمام کوئلے اور راکھ باہر نکال دی۔ ایک کپڑے سے تنور کو اندر سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ لیا۔ اس تیاری سے فارغ ہونے کے بعد سویاں بڑے اہتمام کے ساتھ توڑ توڑ کر اس تنور میں بھر دیں۔

اور جب یہ سویاں دوبارہ تنور سے نکالی گئیں تو خوب گلابی گلابی اور مہکی مہکی ہو رہی تھیں۔ اب انہیں پکاتے وقت بھوننے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ آرام کے ساتھ مٹکے میں سے نکالو اور پکا کر کھالو۔

مشکبار کو ان سب تیاریوں سے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں رمضان المبارک کا استقبال کس احترام اور راور پر مسرت انداز میں کیا جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رمضان المبارک کے آغاز سے ایک دو دن قبل ہر امیر و غریب پوری طرح تیار ہو کر پاک صاف ہو چکا تھا۔ گھر تو گھر چوپالیں اور بیٹھکیں تک اجلی اجلی اور صاف ستھری کر دی گئی تھیں۔ ایسا اہتمام، ایسی خوشی، ایسا استقبال اور ایسا عظیم الشان سواگت --- جو شہروں میں شاید عید منا لینے کی حد تک محدود رہتا ہے۔

بچہ بچہ خوش ہو ہو کر اعلان کر رہا تھا کہ، آہا--- ہم بھی روزے رکھیں گے۔

جس شام رمضان المبارک کا چاند نظر آنے کو تھا، لوگ بانگ نماز پڑھ پڑھ کر مسجد سے سیدھے بڑے میدان میں جمع ہو ہو کر آسمان پر چاند تلاش کرنے لگے۔ گلیوں، بازاروں میں پر مسرت سا ہنگام اور رونق نظر آ رہی تھی۔ لڑکیاں بالیاں کوٹھوں پر چڑھ کر اس مقدس تلاش میں شریک ہو رہی تھیں مگر چاند ابھی کسی آنکھ کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ مشکبار بھی ایسی لڑکیوں میں شامل تھی اور اس وقت وسیع و عریض چھت کے ایک کونے میں آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔

عین اس وقت جبکہ چاند کا مہین سا، روپہلا روشن مکھڑا اس کی نظروں میں سما چکا تھا اور اس نے جلدی سے دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھا لئے تھے، گل ایک ایک کے بجائے دو دو زینے چڑھتے ہوئے اوپر آئے اور چپ چاپ اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے۔ مشکبار نے شام کو ہی سن لیا تھا کہ گل آ گئے ہیں۔ اس وقت ان کے قدموں کی چاپ بھی پہچان لی تھی۔ اس نے مختصر سی دعا مانگ کر جلدی سے ہاتھ گرا لئے اور پیچھے مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیجیے--- ہمیں بھی ایک بابرکت پھونک مار دیجئے مولانا" وہ اپنا چہرہ اس کی طرف بڑھا کر بولے۔

مشکبار جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور جلدی سے موضوع بدلنے لگی۔

"السلام علیکم بھائی جان! رمضان المبارک کا چاند نظر آ گیا۔"

انہوں نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وعلیکم السلام بہنا! ویسے میں پہلے ہی چاند دیکھ آیا ہوں۔ خیر اس خیر و برکت والی اطلاع کا شکریہ۔ اب آپ ایک اطلاع سنئے، آپ کا بلاوا آیا ہے سہارن پور سے۔"

"ہائے سچ!" وہ اچھل پڑی۔ "کیا کہلوایا ہے اماں نے؟"

گل اس کے قریب سے ہٹ کر چہار دیواری کے پاس چلے گئے اور نیچے جھانکتے ہوئے بولے "کچھ نہیں--- فقط اتنی تاکید کی ہے کہ عید سے ایک ہفتہ قبل تینوں بچوں کو ہمارے پاس چھوڑ جانا، ان لوگوں کے کپڑے وغیرہ سلوانے ہیں۔"

"اوہ"--- اتنے دور کی تاریخ سن کر وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

گل اس سے زیادہ بھی کچھ باتیں کرنی چاہ رہے تھے۔ مگر تبھی نیچے سے ان کے کسی دوست نے آواز دی اور وہ نیچے اتر گئے۔

رمضان المبارک کے بابرکت و مقدس مہینے میں مشکبار نے اس خوبصورت گاؤں میں ایسے ایسے روح پرور نظارے دیکھے کہ پھر آئندہ چل کر ساری زندگی میں اس کے لئے مشعل راہ بن گئے۔

وہ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتی کہ وہاں روزہ نہ رکھنے کا سرے سے کوئی سوال ہی نہ ہوتا تھا۔ اس ذوق، شوق اور اہتمام سے سحری میں اٹھایا جاتا اور گھر سے تازہ کھانے پکنے کی خوشبو، لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں، بچوں کے شور و شغب کی پکاریں آتیں گویا دن کا وقت ہو۔ سحری کے بعد گھر گھر سے قرآن پاک پڑھنے کی آوازیں ابھرتے لگتیں۔

ہر وہ بچہ جو دس بارہ برس کا تھا، اپنے لئے روزہ فرض سمجھتا۔ نہ اسے ماں باپ دھمکاتے، نہ سارا دن رحم طلب نگاہوں کا نشانہ بنتا۔ نہ یہاں شہر والوں کی طرح سے روزہ کشائی وغیرہ کا تصور تھا۔ روزہ اور نماز سراسر خدا کی راہ میں رکھا جاتا اور نماز پڑھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتی۔ تراویح کے وقت مسجد میں تو کھچا کھچ بھری ہی ہوتی، گھروں کے بڑے بڑے کشادہ آنگن بھی عورتوں اور لڑکیوں سے پٹے رہتے۔ بہت سے گھرانوں کی لڑکیاں اکثر تراویح مل جل کر ادا کرتیں۔ سحری میں عام طور پر ایک دوسرے کے ہاں آتی جاتیں۔

پھوپھو کے ہاں باقاعدہ ایک مرغا افطار کے وقت اور دوسرا سحری میں ذبح ہوتا تھا جو اسی وقت پکایا جاتا۔ نہ وقت کی کمی کا شکوہ --نہ کام چوری--

رمضان المبارک کا پہلا جمعہ گزرتے ہی گھر گھر عید کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور دھڑا دھڑ کپڑے سلنے لگے۔ حدیث کے مطابق ہر کسی کا کہنا تھا کہ روزوں میں کسی اخراجات کا خدا حساب نہیں لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ پھوپھو کے ہاں سب کے سال سال بھر کے جوڑے آ گئے تھے۔

شاید سترھواں یا اٹھارواں روزہ تھا۔

الیاس بھائی فاطمہ پھوپھو سے کہنے لگے۔

"کل مجھے شہر جانا ہے، درزی سے عید کے کپڑے لے آؤں۔ آپ کو جو کچھ منگوا ہو، سوچ کر بتا دیں کیونکہ پھر روزے کی وجہ سے بار بار شہر جانا نہ ہو سکے گا۔"

پھوپھو نے دونوں بہوؤں سے صلاح مشورہ کر کے ایک لمبی فہرست سامان ا لکھوا کر ان کے سپرد کر دی۔ جو جو چیزیں انہوں نے گھر کے بچوں کے لئے منگوا تھیں، ان میں مشکبار، دلشاد اور شمشاد کو بھی برابر کا شریک رکھا تھا۔

مشکبار آج کل اماں کے پاس پہنچنے کے لئے دن شمار کر رہی تھی۔

اگلے دن کا ذکر ہے---

لوگ باگ تراویح ادا کرنے میں مشغول تھے۔ رات کے نو دس بجے کا وقت ہو گا۔ پھوپھو کے آنگن میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں تراویح پڑھ رہی تھیں۔۔ اچانک گلی میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے شور مچانے لگے۔ ساتھ ہی بھاری بھرکم گاڑی۔

دروازے پر رکنے کی آواز سنائی دی، فاطمہ پھوپھو کا دل......دھڑک کر حلق میں آ اٹکا۔

نائمہ بیگم کی باآواز بلند بین کرنے کی سی سریلی اور تیز پکار صاف سنائی دے رہی تھی--- "ارے رئیسہ! نصیبوں جلی-- تم کہاں ہو۔ دیکھو تمہارا سہاگ اجڑ گیا-- چوڑیاں توڑ ڈالو---ہائے جوان جہان الیاس کیسے بچھڑ گئے سب سے---"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آواز کیا تھی، ٹائم بم تھا---

تھوڑی دیر کے لئے تو جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

ہر سینے میں سانس اندر ہی اندر الجھ کر رہ گیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

نائمہ بیگم کی آواز جس جس کے کان تک پہنچ پائی تھی اسکی تراویح ادھوری رہ گئی۔

کیا پڑھ رہے تھے -- کیا پڑھنا تھا؟ ایک سیکنڈ میں حافظے سے نکل گیا۔

خبر ایسی المناک اور روح فرسا تھی کہ بندہ جیسے خدا کو بھول بیٹھا اور یکبارگی سب کے سب بیرونی دروازے کی طرف لپکے۔

سب میں آگے بھابی سکینہ تھیں۔ پھر بدحواس اور ہوش سے بیگانی رئیسہ۔ ان دونوں کے پیچھے بانو، اس کی بہنیں ماں، مشکبار اور کئی دوسری---

فاطمہ پھوپھو سب سے پیچھے مصلے پر کلیجہ پکڑے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

ان کی زبان سے بار بار ایک ہی کلمہ نکلے جا رہا تھا---

"الٰہی خیر--- میرے مولا خیر--- یہ کیا ہو گیا---!!"

ان کے سارے جسم کی جیسے جان نکل چکی تھی۔ گھٹنوں میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اٹھ کر ایک قدم بھی چل سکتیں۔ ٹانگیں من من بھر کی ہو گئی تھیں۔

دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا،

نائمہ بیگم دروازے کی دہلیز پر آنکھوں پہ رومال رکھے کھڑی ہیں۔

بھابی سکینہ ٹھٹھک کر وہیں کی وہیں تھم گئیں۔ زمین نے گویا پاؤں جکڑ لئے، لیکن رئیسہ ان کے عقب سے نکل کر نائمہ بیگم کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور انہیں جھنجھوڑ کر چلائی۔

"کیا ہو گیا آپا بیگم---ابھی آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ ان کو کیا ہو گیا؟!! وہ کہاں ہیں......! ہائے میرے اللہ کچھ تو بتایئے......!!"

لیکن نائمہ بیگم نے جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر اسے گلے سے چمٹا لیا اور رونے لگیں--اس دہشت ناک منظر نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

سمجھ میں کچھ نہ آنے کے باوجود، بہت کچھ عقل سمجھا رہی تھی۔

سکینہ بھابی کو یوں لگ رہا تھا جیسے غش کھا جائیں گی۔ رئیسہ کا کوئی حال ہی نہ تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ مردوں میں رہی تھی نہ زندوں میں۔ اوپر سے نائمہ بیگم اس سے چمٹی اب تک رومال میں منہ چھپائے چھکوں پھکوں روئے چلی جا رہی تھیں۔

دفعتہً باہر سے مردوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے دروازے کے قریب آکر تھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا، "ہٹو...... راستے سے الگ ہو جاؤ۔ دروازے میں کیوں جمگھٹا لگائے کھڑی ہو۔"

فوراً ہی دوسری آواز نے بھی حمایت کی۔

تب کسی عورت نے رئیسہ اور نائمہ بیگم کو پکڑ کر دہلیز پار کرا دی۔ باقی عورتیں بھی دروازے سے ادھر ادھر ہٹ گئیں۔

ان لوگوں کے ایک طرف ہٹتے ہی تین اجنبی صورتوں والے سفید پوش مرد اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے دو نے ابا میاں کو اپنے بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔ جو ہوش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کم اور غشی کی سی کیفیت میں زیادہ لگ رہے تھے۔

ابا میاں کو اس ناقابل یقین حالت میں دیکھ کر کئی عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ اسی اثنا میں کسی نے مسجد تک اس نئی اور المناک صورت حال کی اطلاع پہنچوادی۔ آن کی آن میں گلی کھچا کھچ بھر گئی۔

گلی سے باہر تک سر ہی سر نظر آنے لگے۔

وہ بھاری بھر کم ٹرک، جس پر نائمہ بیگم اور ابا میاں کو وہ تینوں سفید پوش اجنبی لے کر آئے تھے، اب تک دروازے کے سامنے کھڑا تھا، اور اس کے گرد بدحواس و متوحش مردوں اور لڑکوں بچوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

ٹرک کے پچھلے دروازے پر گل سر جھکائے انتہائی رنجیدہ اور اپنے آپ سے بے گانے کھڑے تھے، آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں، جیسے بہت دیر تک روتے رہے ہوں۔

اچانک مجمع کو چیرتے ہوئے عباس گلی کی نکڑ پر نمودار ہوئے اور دوڑتے ہوئے ٹرک کی طرف لپکے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو گیا! اور کیا ہونے والا ہے!

وہ تو ابھی ابھی تراویح پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ یو لگ رہا تھا جیسے در حقیقت اصل معاملہ کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ سب اپنی اپنی ہانک ر تھے۔ ہاں یہ ہر کسی کو معلوم ہو چکا تھا کہ ابا میاں ایک ٹرک پر آئے ہیں اور ان کو معلو نہیں کیا ہو گیا ہے۔

گل کو ٹرک کے پاس عجیب و غریب حالت میں سر نہوڑائے کھڑے دیکھ کر ا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ چھٹی حس پکار پکار کر کوئی منحوس خبر سنانے لگی۔

"کیا ہو گیا...... کیا بات ہے گل! ابا میاں تو...... خیریت سے ہیں؟" انہوں نے د ہی سے چلا کر دریافت کیا۔

گل نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

❁

بڑے بھائی کو روبرو دیکھ کر جیسے ضبط کے بندھن یکلخت ٹوٹ گئے۔ ان کے منہ سے بے اختیار ایک رکی رکی سی چیخ نکل گئی اور دیوانگی کے عالم میں چلانے لگے۔

"ہم لٹ گئے بھائی جان...... الیاس بھائی گئے...... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے بھائی جان۔"

موقع پر موجود افراد ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے یوں گویا گل نے کوئی انجانی زبان...... استعمال کی ہو۔

الیاس کو بھلا کیا ہونا تھا! ہو کیا گیا الیاس کو -- سب کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے وہ! -- اور بھلا کیوں؟

وہ تو بھلے چنگے ہنستے مسکراتے ہوئے کل صبح ہی سہارن پور روانہ ہوئے تھے، گھر والوں کی بہت ساری فرمائشوں اور ضروریاتِ زندگی کا مختلف سامان خریدنے، اور ایسا تو ہر سال عید سے پہلے ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ سالانہ خریداری کے لئے شہر جاتے تھے۔ دو ایک روز اپنے ابا میاں کے پاس رہ کر سامان وغیرہ خریدتے اور پھر خوشی خوشی اپنے گاؤں لوٹ آتے تھے۔

مگر اس دفعہ کیا ہوا تھا!

آخر یہ گل رو رو کر، چلا چلا کر کیا کہہ رہے تھے!

عباس کے کانوں میں سائیں سائیں سیٹیاں بجنے لگیں۔ دماغ ماؤف سا ہو گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چکراتا سر تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئے --

عین اسی وقت وہ آدمی جو شہر سے ابا میاں کے ہمراہ آئے تھے، اندر سے نکل آئے۔ چند منٹ ابا میاں کے رشتے کے چند بھائیوں اور خاندان کے عمر رسیدہ بزرگوں

سے کچھ بات چیت کی پھر آگے بڑھ کر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

اس نے اپنی سیٹ سے اتر کر ٹرک کے پیچھے لگا ہوا تختہ جو رسیوں سے بندھا ہوا تھا، کھول کر نیچے گرا دیا۔

اونچے سے پلنگ پر کوئی سر سے پاؤں تک سفید براق چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ چپ چاپ--خاموش--سکون و سکوت کی گہری آغوش میں سویا ہوا۔

گل یہ نظارہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر پچھاڑیں کھانے لگے۔

چند باہمت مردوں نے کلمہ پڑھتے ہوئے پلنگ ٹرک سے نیچے اتار لیا۔ اور یہ پلنگ ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا ابا میاں کے گھر کے بڑے آنگن میں پہنچ گیا۔

پورے گاؤں میں اک کہرام مچ چکا تھا۔ جس جس کو اس المناک حادثے کی اطلاع مل رہی تھی، وہ بھاگا چلا آ رہا تھا۔

حتیٰ کہ ذرا سی دیر میں مزارعوں کی جھونپڑیاں خالی ہو چکی تھیں۔

ہر آنکھ اشک بار تھی۔

ہر دل نوحہ کناں تھا۔

آہوں کی یورش--- آنسوؤں کی برسات اور بین کرنے کی بوچھاڑ سے در و دیوار دہلے جا رہے تھے۔

ہر کوئی اپنے دکھ کا اظہار اپنے طور پر بھرپور انداز میں کر رہا تھا اور الیاس---

وہ سب کے رنج و غم سے بے نیاز--

ایک ابدی نیند سو رہے تھے۔

انہیں اب کسی کا شور، کسی کا بین، کسی کی پکاریں اور کسی کا رونا واپس نہیں بلا سکتا تھا۔

❁

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الیاس کا اچانک ایکسیڈنٹ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

اس جوان جہان موت نے اپنے پرائے سب کا دل دہلا کر رکھ دیا تھا، گھر کا ہر فرد نیم پاگل ہو چکا تھا۔

ابا میاں کے دل پر اس ناگہانی حادثے اور جوان بیٹے کی المناک موت نے بہت گہرا اثر چھوڑا تھا-- دنوں ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ چند دن کے اندر اندر جھٹک کر رہ گئے تھے۔

جس روز الیاس گاؤں سے ان کے پاس پہنچے تو سیدھے انہی کو سلام کرنے حاضر ہوئے تھے۔ رات بھر رہے پھر اگلی صبح ذرا سویرے ہی بازار نکل گئے تھے۔ اس وقت تک ابا میاں گھر پر ہی آرام کر رہے تھے وہ اپنے آفس دس ساڑھے دس کے قریب جاتے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہونے کی وجہ سے آرام زیادہ کرتے۔ اس لئے الیاس ان کے اٹھنے کا انتظار کئے بغیر نائمہ بیگم کو بتا کر چلے گئے۔ گاؤں میں بھی خاصا کام تھا۔ اس لئے انہیں زیادہ سے زیادہ...... کل...... واپس لوٹ جانا تھا۔ گھر کے ملازم کو وہ سامان وغیرہ اٹھانے کے لئے ساتھ لے گئے تھے۔

لیکن ابھی انہیں گھر سے نکلے بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ واپس آ گئے۔ وہ رقم کی تھیلی گھر پر بھول گئے تھے۔

رقم لے کر واپس چلے۔ اور عین اس وقت جب سامنے کی سڑک پار کر رہے تھے، ایک بھاری بھرکم گاڑی انہیں پہیوں تلے کچلتی ہوئی نکل گئی اور انہوں نے موقعہ واردات پر ہی دم توڑ دیا---شاید دوسری تیسری سانس بھی نہ لے پائے تھے۔

ابا میاں اسی وقت سو کر اٹھے تھے۔ جب لرزتا، ہانپتا، کانپتا ہوا ملازم یہ اطلاع ان تک پہنچانے آیا۔

اس ناگہانی حادثے نے ان کے ہوش و حواس معطل کر دیئے اور وہ بالکل ہی ہاتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیر چھوڑ بیٹھے---کیا ہنستا مسکراتا بیٹا کل ان کے پاس آیا تھا اور آج بے سان وگمان کیسا اجل نے ان سے ان کا لختِ جگر جھپٹ لیا تھا۔ جیسے تھا ہی نہیں کبھی۔

اس اچانک حادثے نے انہیں سوچنے سمجھنے کے لائق ہی نہ رکھا۔ گھبرا تو نائمہ بیگم بھی گئی تھیں۔ آخر کو انسان تھیں۔ ایک عورت کا حساس اور گداز دل پہلو میں رکھتی تھیں۔ حادثہ بھی اس نوعیت کا تھا کہ دشمن بھی ہوتا تو تھرا اٹھتا۔

لیکن نائمہ بیگم، ابامیاں کی نسبت تھیں حوصلہ مند۔ جب انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے ہیں۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے اٹھائی جاچکی تھی۔ بھاگ دوڑ کون کرتا۔ سہارن پور میں کوئی عزیز واقارب بھی نہیں تھے۔ لے دے کے گل تھا تو وہ بھی ہوسٹل میں۔ ان کو تو بھائی کے آنے کی اطلاع بھی نہ پہنچ سکی تھی کہ وہ راہی ملک عدم ہوچکے تھے۔ اور پھر اس اچانک روح کھینچ لینے والے المیے کو سن کر خدا معلوم ان کی کیا حالت ہوجاتی!

❀

ابامیاں کا چپراسی گھر پر ہی موجود تھا، کچھ دیر قبل ان کو لینے آیا تھا۔ نائمہ بیگم نے دانشمندی سے کام لے کر فوراً چپراسی کو ابامیاں کے چند قریبی اور خاص دوستوں کے ہاں یہ اطلاع پہنچانے دوڑا دیا۔ نتیجے کے طور پر ان لوگوں نے آکر نہ صرف یہ کہ تمام معاملات سنبھال لئے بلکہ ابامیاں کی بھی بروقت دیکھ بھال کرلی۔

بعد ازاں انہی لوگوں نے پوسٹ مارٹم کی رسم کارروائی کے بعد سول اسپتال سے لاش حاصل کی، گل کو بلوایا، آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ایک ٹرک کرائے پر لے کر، ابامیاں، نائمہ بیگم، گل اور الیاس کو گاؤں تک پہنچانے آئے۔

گھر کے شوخ وشریر بچے سہم کر رہ گئے تھے۔ بڑوں کے منہ سے بات نہیں نکلتی

تھی۔ سب آپس کے رشتے دار تھے ایک دوسرے کے دکھ کاٹے نہ کٹ رہے تھے۔

اگلے دن جب جنازہ اٹھا، کوئی عورت ایسی نہ تھی جو دھاڑیں مار مار کر نہ رو رہی ہو۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر اور بین کر کر کے ان کی آوازیں بیٹھ گئیں۔ بمشکل تمام مردوں نے آخری دفعہ منہ دکھانے کے بعد جنازہ آنگن سے اٹھایا۔ ورنہ ایک دوسرے کے اوپر روتی جھینکتی عورتیں گری پڑ رہی تھیں۔ ایک محشر بپا تھا چاروں طرف۔

اس وقت، جبکہ میت اٹھائی جارہی تھی، اک عجب منظر دیکھنے میں آیا۔

دراصل الیاس ایک خالص دیہاتی شخص تھے۔ کھیتی باڑی میں انہیں عباس سے بھی زیادہ دلچسپی تھی۔ فصلوں کے اتار چڑھاؤ، بوائی، چھلائی اور کٹائی وغیرہ جیسے کاموں میں جہاں پیش پیش رہتے تھے، وہیں انہیں اپنے مویشیوں سے بھی حد درجہ الفت تھی، بھینس، گائے، بکری، بیل اور گھوڑے سے لے کر معمولی مرغی کے چوزے تک ان کی نگاہ میں رہتے۔ اور وہ سب کے چارے پانی کا انتظام ہر وقت اپنی نظر میں رکھتے تھے۔ اگر کسی جانور کو کہیں چوٹ وغیرہ لگ گئی ہے یا بیمار ہوگیا ہے تو الیاس انسانوں کی طرح اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرتے۔ ان دن رات کی تیمارداریوں اور محبت نے بے زبان جانوروں کو بھی ان کی پہچان کروادی تھی۔ اڑیل سے اڑیل گھوڑا اور بیل بھی انہیں قریب پاکر رام ہوجاتا۔

ان کی ایک پیار بھری تھپکی سے جانور سر جھکا دیتے اور محبت سے اپنا منہ ان کے بازو سے رگڑتے اور ان کے ہاتھ چاٹنے لگتے تھے۔

تمام جانوروں میں خاص طور پر ایک بیلوں کی جوڑی اور ایک رئیسہ کو جہیز میں ملی بھوری بھینس تو ان کے قدموں کی آہٹ تک پہچانتی تھی۔ اگر کسی روز اتفاق سے الیاس گھر پر موجود نہ ہوتے اور رات سے ان تینوں کو اپنے ہاتھ سے چارا ڈالنے نہ آتے تو یہ تینوں آدھی رات تک زنجیریں تڑوا تڑوا کر بھاگنے کی مشق جاری رکھتے اور سب کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پریشان کرتے۔

اس اچانک آپڑنے والی افتاد سے اس دن کسی نے مویشی کھولے اور نہ چرواہا آ

سب جانور اپنے اپنے کھونٹے سے بندھے رہے۔

کہنے والے کہتے ہیں اور بہت سے دیکھنے والوں نے آنکھوں سے مویشی خانے م جاکر دیکھا کہ دونوں بیلوں اور بھوری بھینس کی آنکھوں سے آنسو باقاعدہ قطروں صورت میں بہہ رہے تھے اور جس وقت لوگ کلمہ پڑھتے ہوئے میت باہر لے جار تھے تو بھینس کے زور زور سے ڈکرانے کی آواز ہر کسی نے سنی---اور---اس طر ایک وہ شخص جو بہت سارے جذبوں اور محبتوں کی پہچان تھا، تہہ زمین اتر گیا۔

ایک دن اسی رونے دھونے میں بیتا--دوسرا بھی گزر گیا۔

سوئم آگیا۔

رئیسہ کے منہ میں ایک کھیل کا دانہ بھی اڑ کر نہ پہنچا۔

اسے گود والے بچے کے سوا کوئی...... بھی یاد نہ تھا۔ بس وہ سینے سے چمٹا، سو چھاتیوں کو چوستا رہتا جن میں...... غم اور فاقہ کشی کے باعث دودھ کی دھاریں بھ خشک ہو چکی تھیں۔ مگر اس دیوانی کو کچھ ہوش نہ تھا۔

سب عورتیں دانے پڑھنے میں مصروف تھیں۔

رئیسہ بھی ایک کونے میں منہ ڈھانپے، گود کے بچے کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ اس کے قریب مشکبار اور بانو، دانے پڑھنے میں مشغول تھیں۔

مشکبار بھی الیاس کی مرگِ ناگہاں پر جی بھر کے روئی تھی---اسے جانے کیوں پھوٹ پھوٹ کر رونا آیا تھا۔ اپنے رونے میں اس نے اپنی امی کو بھی قابلِ توجہ نہ سمجھا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اپنا ماں جایا ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہو۔

دانے پڑھتے پڑھتے مشکبار نے سر اٹھا کر دیکھا تو چادر اوڑھے ہوئے ایک م

رسیدہ عورت اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی اس کونے کی طرف بڑھتی چلی گئی جہاں رئیسہ منہ ڈھانپے بیٹھی تھی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے بانہیں پھیلا کر رئیسہ کو سمیٹ لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اسے دیکھ کر رئیسہ بھی بکھر گئی۔ اس کے بین سے در و دیوار کانپنے لگے، آج تو اس کی آہ و زاری دیکھی نہ جا رہی تھی۔

رو رو کر وہ بے حال ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے دانے پڑھنے والی عورتیں انہی دونوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ بانو اور مشکبار بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اچانک مشکبار کے قریب بیٹھی ہوئی سکینہ بھابی کو جانے کیا سوجھی، اپنی جگہ سے کھسک کر ان دونوں کے پاس گئیں اور انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے کرتے بڑے عجیب سے لہجے میں رئیسہ سے کہنے لگیں۔

"ایا اب بس بھی کرو...... اور بھلا تم کیوں رو رہی ہو! رونا تو مجھے چاہئے جس کے حق پر اب تم ڈاکہ ڈالو گی سوت بن کر۔"

رئیسہ کے رونے اور ہچکیوں سسکیوں میں جیسے ایک دم بریک لگ گئے اور وہ یکلخت خاموش ہو کر آنچل سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی۔

محفل پر سناٹا سا چھا گیا۔

مگر نہ کسی اعتراض کیا اور نہ ہی سکینہ بھابی کو ٹوکا۔

خلافِ توقع خود رئیسہ سے کوئی جواب بن پڑا اور نہ اس نے احتجاج کیا۔

اسی وقت کسی نے مشکبار کو پکار لیا کہ دلشاد رو رہا ہے۔

وہ اندر سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ بانو بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ آئی تھی۔

مشکبار نے روتے ہوئے دلشاد کو گود میں اٹھا لیا اور حیرانگی کے عالم میں بانو سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دریافت کیا۔

"بانو! یہ کیا قصہ ہے بھلا! رئیسہ بھابی کس سے چمٹ کر اس قدر رو رہی تھیں اور پھر بڑی بھابی نے انہیں اتنی سخت اور غلط بات کیوں کہی---؟ میں تو حیران ہوں کسی نے ان کو بھی منع نہ کیا! رئیسہ بھابی کا دل کتنا ٹوٹا ہوگا؟"

بانو نے اس کی پوری بات تحمل سے سنی اور دھیرے سے جواب دیا۔

"اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ رئیسہ باجی یا کوئی اور کیا کہہ سکتی ہیں۔ سکینہ بھابھی بے چاری سچ کہہ رہی تھیں درحقیقت قسمت تو انہی کی خراب ہے۔"

مشکبار نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر کہا "ارے...... یہ کیا تم کہہ رہی ہو! سکینہ بھابھی کی قسمت کیسے خراب ہوئی۔ بیوہ تو بے چاری چھوٹی بھابی ہوئی ہیں۔ ان کے سر کا تاج نہ رہا۔"

بانو افسوس کے لہجے میں سر ہلا کر بولی "وہ تو اپنی جگہ ٹھیک بات ہے کہ چھوٹی بھابی کا زخم تو سدا بہار زخم ہے۔ اس دکھ کو اور پہاڑ جیسے غم کو کون مٹا سکتا ہے۔ مگر مشکبار! تم تو ایک سمجھدار لڑکی ہو، اتنا تو سمجھ سکتی ہو کہ سوت کا جلایا اور سوت کا دکھ کیوں اتنا مشہور ہے۔ ساری دنیا یہ باتیں کرتی ہے تو کوئی وجہ تو ہوگی۔ پھر اس لحاظ سے سکینہ بھابی نے جو کچھ کہا ہے کیونکہ تم دیکھنا۔ جیسے ہی عدت پوری ہوگئی رئیسہ بھابی کا نکاح عباس بھائی سے کر دیا جائے گا۔"

"ہائے میرے خدا!" مشکبار کی زبان سے بے ساختہ کلمہ حیرت نکل گیا اور وہ حیران و پریشان نظروں سے بانو کی صورت تکنے لگی۔

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دوبارہ کہنے لگے۔ "اسی لئے تو کوئی اعتراض نہیں کر سکا۔ یہ جو بھی چادر والی آئی ہیں، رئیسہ بھابی کی خالہ ہیں اور دہلی میں رہتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر رئیسہ بھابی کو زیادہ رونا آگیا۔ مگر بڑی بھابی سے بھی

صبر نہ ہو سکا۔ آخر کو عورت ہی ہیں۔ ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تو وہ بھی کہہ گزریں۔ خواہ کوئی طنز سمجھے یا حقیقت۔"

مشکبار کچھ سوچتے ہوئے بولی "خیر---کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ نکاح کیا جائے۔ عباس بھائی اور بلکہ خود رئیسہ بھابی کی مرضی، وہ نکاح کریں یا نہ کریں! انکار کر دیں!"

"اونہہ...... انکار کر دیں۔" بانو جانے کیوں دھیرے سے ہنس دی۔

"ان تینوں میں سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے سامنے دم مار سکیں۔ اور ایسا کئی وجوہات کی بنا پر مجبوراً بھی کیا جائے گا۔ اول تو یہ کہ اب الیاس بھائی کے پانچوں بچے بے آسرا ہو گئے۔ باپ سے تو قدرتاً محروم ہو گئے۔ جیتے جی ماں سے بھی کس طرح چھڑوا لیے جائیں! اور بغیر شوہر کے بھابی اب اس گھر میں کیسے رہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کا سہارا چاہئے۔ اب چونکہ شوہر کا انتقال ہو گیا ہے تو سسرال سے بھی ان کا پہلے جیسا ناتہ نہیں رہ سکتا۔ سب میں بڑی بات یہ کہ ان کے والدین اور بھائی ہی انہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ میکے میں جا کر رہنے سے یہ ہوگا کہ ممکن ہے بچے ہی دربدر ہو جائیں۔ بھاگ کر ماں کے پاس جائیں گے تو دوڑ دوڑ کر اپنی ددھیال بھی آئیں گے۔ اس طرح ان کے خیالات دو طرف بٹ جانے کا خطرہ ہے۔ پھر جب یہی بچے جوان ہوں گے تو زمینوں اور دیگر جائداد میں اپنا حق علیحدہ سے مانگ سکتے ہیں۔ جبکہ ہم گاؤں کے رہنے والوں میں ایسی باتوں کو عیب سمجھا جاتا ہے ایسی ہی چند وجوہات مزید ہیں جنہیں خاندان کے بزرگ زیادہ صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام مصلحتوں کے تحت ہمارا یہ بہت پرانا رواج ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو مستقبل میں بہت ساری الجھنوں سے بچنے کی خاطر سسرال والے آپس میں اسی گھرانے میں کسی سے اس کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔ اگر جیٹھ ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ بعض گھروں میں تو دیوروں تک سے نکاح ہو جاتا ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشکبار جو انتہائی حیرت اور فکر مندی کے ساتھ یہ تمام تفصیلات سن رہی تھی، اس کے خاموش ہوتے ہی جلدی سے بولی،

"اور...... لڑکی کے والدین وغیرہ بھی منع نہیں کرتے---وہ خود بھی انکار نہیں کرتی! کمال کی بات ہے بھئی۔"

"بس...... ہمارا رواج ہے۔" بانو مجبوری کے سے عالم میں منہ لٹکا کر بولی "ماں باپ بھی سوچتے ہیں کہ چلو یہ مسئلے کا بہتر حل ہے۔ بچوں کو بھی ددھیال سے زیادہ پیار کہاں مل سکتا ہے اور پھر ایک بیوہ عورت کا ٹھکانہ بھی کہاں--!! اور چونکہ یہ رواج ہمارے پرکھوں سے چلا آرہا ہے اس لئے کسی کو بھی اعتراض کا حق نہیں ہوتا۔ ویسے اگر بغور اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو یہی حل سب میں مناسب اور بہتر نظر آتا ہے صبر تو خدا وقت کے ساتھ ساتھ دے ہی ڈالتا ہے۔ مگر یہ مسئلہ تو پوری زندگی چلتا ہے۔ بچوں کے تحفظ کی خاطر سب چپ سادھ لیتے ہیں۔"

مشکبار بھی چپ کی چپ رہ گئی۔

بانو نے ایسی مفصل بات کی تھی کہ مزید سوال وجواب کی گنجائش ہی ختم ہوگئی تھی۔ ویسے بھی مشکبار کا دماغ پل بھر میں زقندیں لگاتا جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا۔

یہ نئے نئے انکشافات سن کر اس کے سامنے اپنی پوری زندگی کا نقشہ گھوم گیا تھا۔ روح پر خود بخود اک وزن سا آپڑا۔

جب وہ یتیم ہوئی تھی---اس کے ابا میاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان تینو کو چھوڑ کر رب پاک کو پیارے ہوگئے تھے، اس وقت وہ خاصی چھوٹی ہونے کے باوجود بہت باشعور اور حساس تھی۔

ان کے اس چھوٹے سے گھرانے میں جو جو انقلابات بپا ہوئے تھے، وہ سب اس کے دل میں روزِ اول کی مانند جاگزیں تھے اور وہ اس سانحے کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر فراموش کر دینے والوں میں سے نہیں تھی--

اس وقت وہ بار بار اپنے جی ہی جی میں سوچے جا رہی تھی

"ہائے...... کہنے کو دیہاتی ہیں یہ سب...... لیکن کس قدر سمجھ دار اور دور اندیش ہیں...... کتنی فراست اور عقلمندی سے ایسے معاملات طے کرتے ہیں کہ کوئی یتیم بچہ دربدر کی ٹھوکریں نہ کھائے...... کوئی بے آسرا نہ کہلائے؟

نائمہ بیگم کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

ان کا زیادہ وقت نیم کے نیچے پلنگ پر لیٹے یا ابا میاں کے کمرے میں گزرتا۔

اب رت بدل رہی تھی۔ گرمی نے پاؤں سمیٹ لئے تھے ہر وقت خوشگوار سی خنکی کا احساس طبیعتوں میں سکون کا باعث رہتی۔ رات کے آخری پہر میں اکثر جب ہوائیں شبنم سے بوجھل ہو جاتیں تو یہی معمولی سی خنکی ٹھنڈ میں تبدیل ہو جاتی۔

لیکن اس خوشگوار خنکی کے باوجود نائمہ بیگم کو ہر وقت اختلاج قلب کی شکایت رہتی اور اسی تکلیف میں ایک کے بعد ایک پان بنا بنا کر کلے میں دبائے جاتیں اور "ہائے، ہائے" کرتی رہتیں۔ دوسرے پھر انہیں ہر وقت کے روتے بسورتے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔ روتی آنکھیں، بہتے آنسو اور نالہ وشیون کی آوازوں سے ان کے کان پک چکے تھے۔

یہ سب ان کی نازک مزاجی پر بہت بڑا بار تھا مگر زبان سے کچھ کہنے سے بھی گرزاں رہتی تھیں۔ زمانہ ساز اور جہاندیدہ تھیں، سمجھتی تھیں کہ یہ سسرال والے بے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حد مضبوط اور اپنی پرانی قدروں کے پوری طرح پابند ہیں۔ نثار احمد کی طرح ان لوگوں کو تو دباؤ میں رکھ نہ سکتی تھیں۔

یہی سبب تھا کہ وہ طبیعت کی خرابی کے باوجود کان دبائے چپ چاپ پڑی تھیں اور ابا میاں سے شہر چلنے کی فرمائش نہیں کر رہی تھیں۔ خوب جانتی تھیں کہ صدمہ بہت بڑا اور دل بہت چھوٹا ہے سنبھلتے سنبھلتے سنبھلے گا۔ ایسے نازک اور المناک موقع پر انہیں چھیڑنے کا مطلب بجائے ہمدردی کے عذاب بن جاتا ہے۔

لیکن---

ایک دن ہوا یہ کہ ان کے اندر کہیں مصلحتوں کی نیند سوتی نائمہ بیگم یکلخت غضبناک ہو کر بیدار ہو بیٹھیں اور ان پر پرانا جلال طاری ہونے لگا۔

اس روز الیاس کا دسواں تھا۔

نائمہ بیگم حسب معمول گھنیری نیم کے ٹھنڈے اور فرحت بخش پیڑ کے چھاؤں تلے لیٹی تھیں۔ چہرے پر ہلکا سا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ گویا سو رہی ہوں۔ مگر جاگ رہی تھیں۔

آج دور و نزدیک کے دیہاتوں سے بھی لوگ آئے تھے مگر گھر کے اندر صرف عورتیں تھیں۔ چہرے پر ہلکا سا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ گویا سو رہی ہوں۔ مگر جاگ رہی تھیں۔

آج دور و نزدیک کے دیہاتوں سے بھی لوگ آئے تھے مگر گھر کے اندر صرف عورتیں تھیں۔ مردوں کا انتظام باہر رکھا گیا تھا۔

نائمہ بیگم سے کچھ فاصلے پر چند عورتیں دوسرے پلنگ پر باتوں میں مصروف تھیں۔ اچانک ایک عورت...... انگوٹھے سے اشارہ کر کے دھیرے سے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ نائمہ بیگم دوسرے جی سے ہیں۔"

دوسری جھٹ سے مسکرا کر بولی۔ "ارے تمہیں فقط معلوم ہی ہوتا ہے اور ہم تصدیق بھی کر چکے ہیں۔ وہ جب یہاں سے واپس آکر سہارن پور ہو گئی ہیں، تب ہی سے پاؤں بھاری ہے ان کا۔"

"خدا کی شان ہے۔"

تیسری ٹھنڈا سانس بھر کر طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ "بڑھاپے میں گل کے ابا میاں پھر سے باپ بن رہے ہیں۔ گل میں اور اس آنے والے بچے میں کتنے سالوں کا فرق ہوگا! ارے مجھے تو سوچ کر ہنسی آتی ہے۔"

باقی عورتیں بھی منہ دبا دبا کر ہنسنے لگیں۔

نائمہ بیگم کو بہت برا معلوم ہوا۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی طبیعت کی ویسے ہی تیز تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ان سب مذاق اڑانے والیوں کے کلیجے چبا ڈالیں۔ مگر مصلحتاً خاموش لیٹی رہیں۔

اتنے میں ایک عورت قدرے زور سے کہنے لگی۔ "ارے تم ساریوں کے دماغ تو نہیں چل گئے--اس میں بھلا ہنسنے اور کاٹھی اور ٹھٹھول بازی کی کونسی بات ہے! مرد تو سدا ساٹھا اور پاٹھا کہلاتا ہے پھر ہمارے بھائی میاں تو ماشاء اللہ صحت اور کاٹھی میں جوانوں سے بھی بڑھ کر گبھرو نظر آتے ہیں۔ تم خود ہی سوچو مرد کے لئے بچے......"

ایک عورت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور چپکے سے بولی۔ "اے چپ ہو جاؤ وہ کہیں سن نہ رہی ہوں۔"

"سنا کریں میری بلا سے۔" وہ بڑی دلیری سے انگوٹھا دبا کر بولی۔ "میں بڑی ان کی برائی کر رہی ہوں جو ڈروں۔ میں تو اپنے بھائی میاں کی بات کر رہی ہوں۔ اب فرض کرو ہماری بھابی زندہ سلامت ہوتیں تو کیا گل کے بعد ان کی کوئی اولاد ہی نہ ہوتی! ارے میں کہتی ہوں بچوں کے ڈھیر لگے ہوتے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گل کی ماں کے تذکرے پر کچھ عورتیں سنجیدہ ہو گئیں۔

جن عورتوں نے مذاق کی ابتدا کی تھی، وہ تھیں بھی مرحومہ کے میکے والیاں۔

تھوڑی دیر میں وہاں اسی کی جواں سالہ موت کا تذکرہ چل نکلا اور پھر اسی کی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ کے آنسو بھی نکل آئے۔

چند ایک تو نائمہ بیگم کو سنا سنا کر برملا کہنے لگی تھیں،

"ارے اگر ہماری ہاجرہ بی بی زندہ ہوتی تو یہ ...... دوسری شادی ہی کیوں ہوتی، غیروں کا منہ کیوں دیکھنا پڑتا۔ سوتیلی ماں کیوں آجاتی ...... ہماری ہاجرہ ہی نہ اتنے بڑے گھر میں راج رچ رہی ہوتی۔"

اسی نوعیت کی باتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔

ہر کسی کی زبان چلنے لگی۔

سب اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔ بڑھ چڑھ کر اس بحث میں حصہ لینے لگیں۔

جب یہ باتیں نائمہ بیگم کی قوتِ برداشت کو چیلنج کرنے لگیں اور غصہ ان کے دماغ پر ٹھوکریں رسید کرنے لگا تو وہ وہاں سے اٹھیں اور کمرے میں آگئیں۔

یہی غنیمت تھا کہ انہوں نے ان عورتوں سے جھڑپ نہیں کی تھی ورنہ ان کے منہ نوچ ڈالتیں۔

لیکن اسی وقت وہ دل ہی دل میں ایک اہم ترین فیصلہ کر چکی تھیں اور وہ نائمہ بیگم ہی کہاں جو اپنے فیصلے پر عمل درآمد نہ کرتیں۔ انہوں نے کمرے میں آکر اپنے آپ سے وعدہ لیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جیسے ہی موقع آیا وہ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا کر دم لیں گی۔

وہ اسی صورت ابا میاں کے کنبے کی عورتوں سے آج کی گفتگو کا بدلہ لینا چاہ رہی تھیں۔

اب انہوں نے دل میں کیا ٹھانی تھی، یہ تو وقت ہی بتاتا۔

رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر ابا میاں حسبِ معمول بہت دیر تک مردانے حصے

میں رہے۔

جب ایک ایک کر کے سب لوگ اٹھنے لگے تو رات گئے وہ بھی اپنے کمرے کی طرف آگئے۔ نائمہ بیگم، اب تک ان کے انتظار میں جاگ رہی تھیں اور کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ ان کے تیور دیکھ کر ہی ابا میاں سمجھ چکے تھے کہ آج وہ ضرور کسی طرح کا دھماکہ کرنے والی ہیں۔

اور ایسا ہی ہوا بھی۔

جیسے ہی وہ بستر پر نیم دراز ہوئے نائمہ بیگم نے الٹی میٹم دے ڈالا،

"بس جی بہت رہ گئے ہم۔ اب نہیں رہا جاتا۔ رختِ سفر باندھیے۔"

"کیوں -- کسی سے لڑائی جھگڑا ہو گیا ہے کیا!" انہوں نے تھوڑا سا مسکرا کر پوچھا۔

"لڑائی جھگڑا کیسا!" وہ صاف ٹال گئیں۔ مصالحانہ انداز میں بولیں۔ "آپ کو اچھا خاصا معلوم ہے کہ آج کل میری طبیعت ہر وقت اوبتی رہتی ہے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر کے اتنے دنوں سے پڑی ہوں۔ گرمی کی وجہ سے ہر وقت دل گرتا رہتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ الیاس بے چارے کی ناگہاں موت سے ماحول افسردہ اور دکھی دکھی رہتا ہے اب یہ سب کچھ برداشت کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ اس مارے کہہ رہی ہوں کہ دوبارہ آجایئے گا۔ اب چلئے۔"

ابا میاں نے سنجیدگی کے لہجے میں جواب دیا۔ "چھٹی تو زیادہ میری بھی منظور نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میں یہ سوچتا تھا کہ کم از کم بیسواں تو ہو جائے۔ پھر چلتے۔ یوں ایک دم جانا اچھا بھی نہیں لگتا۔"

وہ طبیعت میں بھری تلخی چھپا کر بولیں۔ "بیسویں، چالیسویں میں دوبارہ آکر شریک نہیں ہو سکتے! اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا، یہاں مستقل رہنے میں یہ قباحت ہے کہ آپ کی ملازمت کا بھی ہرج ہوگا اور میری طبیعت الگ خراب ہے۔ وہاں شہر کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاملہ ہے۔ سو طرح کا آرام ہے۔ یہاں تو کمبخت گرمی میں تپ کر مر جاؤ لیکن مجال ہے کہ ذراسی نگوڑ ماری برف ہی مل جائے......"

"ابا میاں نے ان کی بات کاٹ دی اور خوش خلقی سے مزاحاً کہنے لگے۔ "آگے یہ بھی تو کہیئے کہ یہاں دیہات میں بھلا مہکتے ہوئے ماوے کی قلفیاں اور جمی جمائی آئس کریم کہاں -- وہ خوشبو دار فرنی کی کلہیاں اور رس ملائی کہاں -- وہاں تو جب چاہو حاضر---"

"اے ہے -- بڑے آئے کہیں گے۔" وہ قدرے اٹھلا کر اور بن کر بولیں۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم میٹھے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ منوں مٹھائیاں اور سوغاتیں پڑی رہیں ہمارا کبھی جی نہیں للچایا۔ ہاں -- اپنی بات کیجئے تو کوئی یقین بھی کرلے۔ جب تک کھانے پر کوئی میٹھی چیز نہ ہو نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔ گاجر کا حلوہ تو ساری سردی بنا بنا کر ہماری طبیعت اوب گئی۔"

اور دھیرے دھیرے منہ میں دباپان چباتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔

"پھر...... چل رہے ہیں نا سویرے سہارن پور......"

نائمہ بیگم کی ضد کسی صورت ٹوٹنے کا نام نہ لے رہی تھی۔

"ہاں...... آں...... آں......"

وہ بے خیالی میں فقط گردن ہلا کر رہ گئے۔

"صاف صاف جواب دیجئے -- تاکہ میں تیاری کرلوں۔" اس دفعہ وہ جھنجلا کر بولیں۔

"سوچ لو اچھی طرح---" وہ اپنے خیالات کی رو سے چونک کر بولے۔ "ا[illegible] عجلت میں چلے جانا مجھے تو مناسب نہیں معلوم ہوتا -- اول تو اپنا جی نہیں مانتا [illegible] الگ کریں گے۔"

نائمہ بیگم کو غصہ آگیا۔ تنک کر بولیں۔

"بس پھر تو ٹھیک ہے آپ یہاں بیٹھے رہیے اپنے کنبے والوں کو پکڑے۔ میں صبح بچوں کو لے کر سہارن پور چلی جاؤں گی، یہ طے ہے کہ اب نہ رکوں گی۔"

انہوں نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا اور بے ساختہ پوچھا۔ "بچوں کو اس دفع ساتھ ہی لے کر چلو گی؟"

"نہیں تو کیا ساری عمر یہیں گزار دیں گے؟" انہوں نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

❀

لہجہ ایسا تھا کہ ابا میاں ان کو ایک نظر دیکھ کر رہ گئے۔ جواب میں کچھ بولے نہیں۔ بلکہ انہوں نے چپ چاپ سیدھے لیٹ کر کروٹ بدل لی۔

نائمہ بیگم نے بھی مزید بات چیت نہیں بڑھائی اور نہ ہی صبح چلنے کے لئے مزید استفسار کیا۔ جانے کیوں خاموشی اختیار کرلی۔

باوجود اس کے کہ رات صحیح طور پر گاؤں سے چلنے کا فیصلہ ہو پایا تھا اور گفتگو ادھوری رہ گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہوا وہی جو نائمہ بیگم نے کہہ دیا تھا۔

سویرے فجر کی نماز سے ہو کر ابا میاں نے ایک آدمی بائیسکل پر شہر بھیج دیا۔ دس بجے کے قریب ان کے دروازے پر کرائے کی ایک جیپ کھڑی تھی اور نائمہ بیگم بے حد اطمینان اور سکون سے چلنے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ چونکہ وہ امید سے تھیں۔ اس لئے ابا میاں نے دھچکوں اور جھٹکوں وغیرہ کے خوف سے یکے پر سفر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

مشکبار کو بھی کوچ کا حکم مل چکا تھا اور وہ جلدی جلدی دونوں بھائیوں کو نہلاتی دھلاتی پھر رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانے کیوں---

اسے سہارن پور جانے کی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ آج سے قبل وہ جب بھی گل، شہر سے آیا کرتے تھے، وہ ان سے سب سے پہلے یہی سوال کیا کرتی تھی کہ اماں نے ہمیں بلایا نہیں---؟ وہ ہمیں اپنے پاس بلا کیوں نہیں لیتیں۔

لیکن اب جبکہ سچ مچ جانے کا وقت آ پہنچا تھا تو اس کا دل آپ سے آپ اداس ہوا جا رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بھری آ رہی تھیں اور طبیعت پر جیسے منوں بوجھ آن پڑا تھا، ساری چستی جاتی رہی تھی۔

اس کے جانے کا سن کر بانو اور بہت سی ہمجولی لڑکیاں جمع ہو گئیں سب اداس اور رنجیدہ تھیں۔ بھابی سکینہ، رئیسہ حتیٰ کہ فاطمہ پھوپھو تک کا دل دکھ رہا تھا۔ یوں جیسے ان کی بہت عزیز شے ان سے بچھڑ رہی ہو۔

گھر میں اتنا بڑا سانحہ ہو جانے کے باوجود فاطمہ پھوپھو اپنی وضع داری اور رسم رواج کی پابندی فراموش نہ کر پائی تھیں۔ انہوں نے وقتِ رخصت ان تینوں بہن بھائیوں کو کئی کئی جوڑے کپڑے اور مشکبار کے منع کرتے کرتے بھی بہت سی چیزیں جیسے چنگیریں، ٹوکریاں، ازار بند اور چوٹیاں وغیرہ دی تھیں۔ بانو اور کئی دوسری لڑکیوں نے بھی حسبِ توفیق تحائف دیئے۔

مشکبار کی حساس اور غیور طبیعت پر چرکے پر چرکا لگتا رہتا۔ وہ ہزار خواہش ہو کے باوجود کسی کو کوئی تحفہ نہ دے سکی تھی۔ زخمی نگاہوں سے ماں کی صورت دیکھ رہی۔ جب یہ سب لوازمات اس اطمینان سے دیکھ رہی تھیں، جیسے یہ ساری وصولی ان کا حق رہی ہو۔

مشکبار کے جانے کا سب سے زیادہ افسوس بانو کو تھا۔ وہ اس عرصے میں اس کے بہت قریب آ گئی تھی اور اس حد تک مانوس ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر ایک شام بھی

گزارتی تھی۔

چلتے وقت وہ باقاعدہ آنسوؤں اور ہچکیوں سے روئی۔

جیپ میں بیٹھ کر مشکبار کو یکبارگی خیال آیا کہ جب وہ اس گاؤں میں---اس گھر میں اتری تھی تو ابا اس بھائی زندہ سلامت موجود تھے---اور اب جبکہ رخصت ہو رہی ہے تو وہ ہیں نہیں---ان کی مشفق اور مہربان ہستی یاد کر کے اس کے بھی آنسو چھلک پڑے۔

لیکن اس کی ہلکی سی سسکی پر نائمہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا تو اس نے جلدی سے ہتھیلی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

جیپ کے پہیوں کو حرکت ہوئی اور وہ آگے بڑھ گئی۔

بہت ساری کہانیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔

کچھ کہانیاں آگے بڑھ آئی تھیں۔

کوئی آنکھ، کوئی دل اور کوچ نہیں جانتی تھی کہ اس کے لئے مستقبل کے دامن میں کیا ہے؟

مشکبار بھی نہیں جانتی تھی کہ آئندہ کبھی زندگی میں دوبارہ اس گاؤں میں آنا ہو گا بھی یا نہیں، کون جانے!

مگر کوئی اس کی دل کی دھڑکنوں میں بیٹھا دھیرے دھیرے اصرار کئے جا رہا تھا۔

"یہاں...... اس گاؤں میں تم نے بہت کچھ پایا ہے۔ یہاں فاطمہ پھوپھو رہتی ہیں...... یہاں بانو ہے۔ تمہیں یہاں ضرور لوٹ کر آنا ہو گا۔ صرف تم ہی ان کو یاد نہیں کرو گی بلکہ وہ سب بھی تمہیں کبھی نہ بھولیں گی۔ تم نے یہاں نماز پڑھنی سیکھی۔ قرآن حکیم پڑھا---روزے کا صحیح لطف اٹھایا---اور بہت سی دینی کہانیاں اور مذہبی مسائل سے آگاہ ہوئیں---فاطمہ پھوپھو کی ان نیکیوں اور عنایتوں کو بھول مت جانا۔"

وہ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور جیپ سفر آگے ہی آگے طے کرتی رہی۔

گل ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ یوں بھی بڑے بھائی کی موت کے بعد سے ان کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ کئی روز تک بخار بھی آتا رہا تھا۔

نائمہ بیگم آج کل ننھے منے کپڑوں کی کتر بیونت میں لگی رہتی تھیں۔ کلے میں پان دبا ہے، ہونٹ لال انگارہ ہو رہے ہیں، اپنا بھاری بھر کم وجود لئے تخت پر بیٹھی ہیں، ہاتھ میں قینچی ہے اور سامنے خوش رنگ کپڑوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔

دن کے بیشتر وقت میں ان کا یہی مشغلہ ہوتا۔

آج کل ان کا وجود قدرے بھاری بھی ہو گیا تھا۔ ان کا سب سے چھوٹا بچہ دلشاد ہی تھا۔ جو اب ماشاءاللہ پانچ چھ برس کا ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد نخل امید میں دوبارہ ثمر آنے کے آثار ظاہر ہوئے تھے۔ اگر بیوہ نہ ہوئی ہوتیں اور پھر بیٹھی نہ رہتیں تو حالات دوسرے ہوتے۔ بہر حال یہ طے تھا کہ اس موجودہ صورتِ حال سے وہ بہت مطمئن اور پرسکون رہتی تھیں۔ بچے کی متوقع پیدائش کی خبر سے ابا میاں بہت خوش تھے۔

نائمہ بیگم نے اپنے کام کی رفتار میں بہت کمی کر دی تھی۔ ایک ملازمہ کا مستقل انتظام ہو چکا تھا اور پھر مشکبار بھی آ چکی تھی۔ ویسے وہ میاں کی طرف سے غافل نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے لئے کھانا اپنے ہاتھ سے ہی تیار کرتیں۔ باقی کام انہوں نے مشکبار اور ملازمہ کے درمیان بانٹ رکھا تھا۔

گو کہ مشکبار پر کام کا خاصا وزن تھا مگر ملازمہ ہونے کی وجہ سے برتن مانجھنے، جھاڑو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور نچلی منزل سے پانی بھرنے کے جیسا پر مشقت کام اس کے حصے سے خارج کر دیا گیا تھا۔۔وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی۔ ورنہ گاؤں جانے سے پہلے یہ سارے کام بھی اسی کے سپرد تھے۔ جو بہر حال صبر شکر کے ساتھ کرنے پڑتے۔ سب میں زیادہ مشکل کام اسے نیچے سے پانی بھر کے اوپر لانا لگتا تھا۔

دونوں بھائیوں کے اور اپنے کپڑے اب بھی اسے خود ہی دھونے پڑتے تھے۔ ابا میاں اور اماں کے کپڑے ملازمہ دھوتی۔ ویسے زیادہ کپڑے تو دھوبی کے ہاں جاتے تھے۔

یہاں کے معمولات اور گاؤں کے روز مرہ کے کاموں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

شروع کے چند دنوں تو مشکبار بوکھلائی بوکھلائی رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کام کو کہاں سے پکڑے اور کہاں ختم کرے! مگر پھر دھیرے دھیرے اپنی فطری ذہانت اور محنت سے ہر مشکل پر قابو پالیتی، دونوں بھائیوں کو...... سنبھالتی بلکہ اپنی پنج وقتہ نماز کو بھی نہیں بھولی تھی۔

ماں اس کی اس عادت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں مگر زبان سے کبھی اظہار نہ کرتی تھیں، وہ بہت کم کسی کی تعریف کرنے کی عادی تھیں۔

یہاں سہارن پور میں بہ نسبت گاؤں کے، مشکبار کی زندگی قطعی محدود اور یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ وہاں پر دن کے بیشتر حصے میں ہم عمر لڑکیوں کا ساتھ رہتا تھا۔ کبھی ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانا بھی ہو جاتا۔ اس ہنسی مذاق اور باتوں میں بہت سارے وقت کا احساس بھی نہ رہتا تھا۔

مگر یہاں ہر وقت گھر کے اندر محصور رہنا پڑتا۔ نہ کہیں کا آنا جانا۔ نہ کسی سے ملنا ملانا۔ دنوں کسی کی صورت دکھائی نہ دیتی۔ ویسے ابا میاں کے دوستوں کے ہاں کئی اماں کا آنا جانا تو ہو گیا تھا۔ انہوں نے کئی گھرانوں میں اپنے جی بہلانے کے سامان کر لئے تھے۔ کبھی کبھی بے حد اہتمام اور سلیقے سے تیار ہو کر ان کے ہاں چلی جاتیں

ایسا بھی ہوتا کہ کچھ ان کی واقف کار خواتین ادھر آنکلتیں۔

لیکن مشکبار کو اس قسم کی آمد و رفت سے مزید کوفت میں مبتلا ہونا پڑتا۔ کیونکہ اماں اپنی عادت کے مطابق نہایت فراخدلی سے آنے والوں کو کھانے پر روک لیتیں چنانچہ کام کا بوجھ یکلخت بڑھ جاتا اور مشکبار دل ہی دل میں ان سب کو کوستی ہوئی اس نئی مصروفیت میں دھنستی چلی جاتی اور تو اور جب وہ دستر خوان پر بیٹھ جاتیں تو دلشاد اور شمشاد کے علاوہ ان کے ننھے بچوں کو سنبھالنا اور بہلانا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو جاتا۔ اس لئے وہ ہر صبح دعا کرتی۔

"خدایا! اماں کی کوئی سہیلی ہمارے گھر نہ آئیں۔"

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔

گاؤں میں الیاس بھائی کا بیسواں اور پھر چالیسواں بھی ہو گیا۔

مگر مشکبار تڑپ تڑپ کر رہ گئی، اس کا جانا نہ ہو سکا۔

اماں جاتیں تو شاید اسے بھی لے جاتیں۔ مگر وہ اپنی حالت کے پیش نظر گئی نہیں۔ نہ ہی ابا میاں نے اصرار کیا۔ خود اکیلے ہی جا جا کر فاتحہ میں شریک ہوتے رہے۔ مشکبار ہزار چاہنے کے باوجود بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد نہ کر سکی۔ دل مسوس کر رہ گئی۔ فاطمہ پھوپھو، سکینہ بھابی، رئیسہ بھابی، بانو اور بہت سارے پر خلوص لوگ رہ رہ کر یاد آئے۔ جی چاہا پر لگا کر اڑ جائے اور ان سب سے مل آئے۔ مگر حالات نے اجازت دی اور نہ اس نے اماں کے ڈر سے جانے کا اصرار کیا۔

صبح کے کوئی ساڑھے دس بجے ہوں گے۔

نائمہ بیگم چھوٹے چھوٹے کپڑوں کی کتر بیونت سے فارغ ہو کر ذرا کمر سیدھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے کو تخت پر لیٹ گئی تھیں۔

ملازمہ نیچے سے پانی لا کر مٹکے بھر رہی تھیں اور مشکبار مسالہ پیس رہی تھی۔ اچانک زینے میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دلشاد اور شمشاد ایک ساتھ چلانے لگے۔

"آہا...... بھائی جان آگئے...... آہا! بھائی جان آگئے......"

مشکبار نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

گل آہستہ قدموں سے اندر داخل ہو رہے تھے، وہ بھونچکی سی رہ گئی۔

ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی وہ پہلے سے آدھے بھی نہ رہے تھے۔ رنگت بھی بہت ماند پڑ گئی تھی۔ شانے قدرے جھکے جھکے سے لگ رہے تھے۔

آگے بڑھ کر انہوں نے اماں کو سلام کیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ دونوں لڑکے ان سے اس طرح چمٹ گئے جیسے برسوں کے بچھڑے آج مل پائے ہوں نائمہ بیگم ہنس کر بولیں۔

"ارے پیٹھ پیچھے تو کبھی ان دونوں نے گل کا نام تک نہ لیا اور اب صورت دیکھ کر کیسے واری صدقے ہوئے جا رہے ہیں، خوشامدی -- چاپلوسی کہیں کے --"

گل مسکرا دیئے اور دونوں بچوں کو اپنے سے قریب کر کے پیار کرنے لگے۔

مشکبار دوبارہ سر جھکا کر مسالہ پیسنے لگی تھی مگر اب اس کے ہاتھ سست پڑ گئے تھے۔ الیاس بھیا کے انتقال کے بعد اس نے بھی آج ہی گل کو دیکھا تھا اور دل میں گاؤں کی بہت ساری یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔

جی چاہ رہا تھا کہ ان سے سب کے متعلق فرداً فرداً دریافت کرے اور پوچھے کہ وہ لوگ بھی ہمیں یاد کرتے ہیں یا نہیں۔

مگر وہ یہ سب کچھ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی خاموشی سے مسالہ پیستی رہی۔

نائمہ بیگم نے ان سے پوچھا۔

"اور سناؤ وہاں کا سب کا کیا حال ہے؟ سکینہ، رئیسہ اور پھوپھو وغیرہ کا۔"

"ٹھیک ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ سب آپ کو دعا سلام کہتی تھیں۔"

نائمہ بیگم چپ ہو گئیں اور مشکبار کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

"مشکبار! گل کے لئے کچھ چائے ناشتہ وغیرہ تیار کرو۔ سیدھے گاؤں سے آ رہے ہیں۔"

گل جلدی سے بولے۔

"نہیں...... نہیں...... میرے لئے کچھ تکلف مت کیجئے میں گھر سے ناشتہ کر کے ہی چلا تھا۔ یہاں سیدھا تو مشکبار کی چند امانتیں پہنچانے کے لئے چلا آیا ہوں ابھی کالج چلا جاؤں گا۔ بہت غیر حاضریاں ہو چکی ہیں۔"

اپنے ذکر پر ایک بار مشکبار نے چونک کر اس طرف دیکھا۔

"کونسی امانتیں ہیں کس نے بھیجی ہیں انہیں؟"

گل نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنی اٹیچی کو کھولا اور اپنے کپڑوں کے اوپر رکھی کئی ایک پھولوں اور موتیوں والی چوٹیاں، ریشمی دھاگوں سے کاڑھے ہوئے دو تکئے اور ایک میز پوش، ایک فردیاں پڑا لال رنگ کا دوپٹہ نکال کر تخت پر رکھ دیا اور مشکبار کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"یہ ساری چیزیں تمہیں بانو نے بھجوائی ہیں اور کہا ہے کہ اپنے جمپر کا ناپ بھجوا دو۔ ایک سوٹ تمہارے لئے کاڑھ کر بھیجوں گی۔"

مشکبار جھجکتی، شرماتی قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ مارے خوشی کے اس کے گال تمتما اٹھے تھے اور منہ سے کوئی آواز نہ نکل پا رہی تھی۔

نائمہ بیگم نے بھی اٹھا اٹھا کر ایک ایک چیز خوف یور سے دیکھی مگر کچھ اظہار خیال نہ کیا۔ اپنی پرانی عادت اور فطرت کے مطابق۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گل خود بخود ہی دوبارہ بتانے لگے۔

"مشکبار! تمہاری سب سہیلیاں تو تمہیں وہاں بہت یاد کرتی ہیں۔ جہاں چار مل جل کر بیٹھیں تمہارا ذکر ضرور چھڑتا ہے۔ گھر میں پھوپھو بھی بات بات پر تمہیں یاد کرتی رہتی ہیں۔ الیاس بھائی کے ۔۔ چالیسویں والے دن سب نے تمہیں بہت یاد کیا۔ خیال تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

مشکبار نے دھیرے سے شرمگیں لہجے میں جواب دیا۔ "اماں کی طبیعت اچھی نہ تھی بھائی جان! اس لئے میں کس کے ساتھ آتی۔"

پھر قدرے رک رک کر ماں کی طرف دیکھتے دیکھتے اضافہ کیا۔ "میں بھی یہاں سب کو بہت یاد کرتی ہوں...... اور...... بانو تو مجھے بہت زیادہ یاد آتی ہے۔"

واقعی یہ سب تھے...... اور بانو کا بے پناہ خلوص دیکھ دیکھ کر اس کا جی بھرا چلا آرہا تھا۔ اس سے بھلا کس نے کب اور کہاں ایسا پیار کیا تھا!

نائمہ بیگم نے موضوع کی تبدیلی کی ضرورت کو اول جانا، پان لگاتے ہوئے بولیں

"اے بھیا! تم نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے! کبھی آئینہ بھی دیکھا ہے، گل کیا رہے گل کے بھوت بن گئے ہو۔"

گل ہنس کر چپ ہو رہے۔ واقعی انہوں نے بھائی کا بہت صدمہ کیا تھا۔ پہلے سے آدھے بھی نہیں رہے تھے۔ کہاں بھرے بھرے گال اور تمتماتی ہوئی سرخ و سفید رنگت اور کہاں مرجھائے مرجھائے اداس اور گم صم گل ۔۔

ملازمہ جو پانی بھر چکی تھی، ہاتھ پونچھتی ہوئی فرش پر آ بیٹھی اور گفتگو میں پہلی دفعہ شریک ہوتے ہوئے افسوس کے لہجے میں کہنے لگی،

"ہائے بی بی! کیا کہتی ہو...... جس کا جوان جہان بھائی یوں ایک پل میں چٹ پٹ ہو جائے اس کا غم اور صدمے سے جو بھی حال ہو جائے کم ہے۔ بڑے صاحب کو دیکھئے

کس قدر کمزور اور خاموش ہو گئے ہیں۔ ہائے مجھے ان کڑیل جوانوں کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کیسے خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ ہم نوکروں سے بھی جب بات کی، ہنس کر کی۔"

کسی نے بھی اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

گل کا چہرہ پہلے سے زیادہ تاریک اور افسردہ ہو گیا، وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ ملازمہ نے بھی ان کے دلی تاثرات کا اندازہ کر لیا تھا، اس لئے خاموش ہو گئی۔

مشکبار ساری چیزیں سمیٹ کر اندر چلی گئی پھر گل کے لئے چائے بنا لائی۔ چائے پیتے ہوئے وہ کچھ دیر بیٹھے نائمہ بیگم سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر ہوسٹل جانے کا کہہ کر چلے گئے۔

مشکبار کے تمام تر دلچسپیاں چہار دیواری کی محدود فضاؤں کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ جاڑوں کا موسم پوری طرح ماحول پر حاوی ہو چکا تھا۔ آج کل دن چھوٹے اور راتیں خوب لمبی لمبی ہو گئی تھیں۔

وہ دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کام کاج میں جتی رہتی، رات کو جب کمرے میں اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ لیٹتی تو ذہن ہزاروں خیالات کی آماجگاہ بن جاتا اور وہ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی کہیں سے کہیں جا پہنچتی۔

رات طویل اور سرد ہونے کی وجہ سے نیند بیچ میں ہی اچٹ اچٹ جاتی تو کبھی وہ اٹھ اٹھ کر بانو کی دی ہوئی سوغاتوں کو کئی کئی بار اپنے اکلوتے بکس سے نکال نکال کر دیکھتی اور ہزاروں دفعہ کی سوچی بات دوبارہ سوچنے لگتی کہ کاش کبھی وہ خود بھی بانو کو ایسی ہی کئی چیزیں بھیج سکتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالآخر جب یہ سوچ بڑھتے بڑھتے ایک اہم ترین خواہش بن گئی اور یہ خواہش ایک ارمان اور حسرت کی طرح جی کو جلانے لگا تو ایک روز اس نے ڈرتے ڈرتے ماں سے کہا۔

"اماں آج کل جاڑوں کی راتیں خوب بڑی بڑی ہیں۔ رات کو ہمیں خاصی فرصت ہے آپ ہمیں کوئی سوتی کپڑا خرید دیں۔ ہم میز پوش اور تکیے کاڑھیں گے۔"

ماں نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

"کیا تمہیں کشیدہ کاری آتی ہے! ہم نے تو کبھی تمہارے ہاتھ میں سوئی تک نہیں دیکھی۔"

مشکبار ان کے نرم لہجے سے خوش ہو کر بولی۔

"اماں ہمیں گاؤں میں بانوں نے پھول کاڑھنا سکھائے تھے اگر آپ کپڑے لے دیں تو...... ہم خراب نہیں کریں گے ضرور پھول کاڑھ لیں گے۔"

نائمہ بیگم نے خاموشی سے چند منٹ کچھ سوچا پھر بولیں۔ "تم اپنے جہیز کے لئے میز پوش اور تکیے وغیرہ کاڑھنا چاہتی ہو۔"

مشکبار دھک سے رہ گئی۔

بات کرنے سے قبل اسے گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس کی ماں ایسا غلط اندازہ قائم کریں گی اور بے دھڑک اس کے منہ پر کہہ بھی گزریں گی۔

وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی، افسوس کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔ پھر اس سے ایک منٹ بھی وہاں رکا نہ جا سکا۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ ان کی طرف سے خود بخود اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔ وہ سارا دن افسردہ رہی۔

شام کے وقت جب وہ چائے بنا کر لائی تو ماں نے دوبارہ استفسار کیا۔

"صبح تم کپڑے کا کہہ کر غائب کیوں ہو گئی تھیں! تم نے بری بات نہیں کی تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم کشیدہ کاری سیکھ چکی ہو۔ خیر...... کل ہم چند تھان رنگین

کپڑے کے منگوائیں گے تم ان میں سے رنگ اور کپڑا پسند کر لینا۔ پھر جیسا کہو گی ریشمی دھاگے بھی آ جائیں گے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو مشکبار خوشی سے اچھل پڑتی۔ مگر اس وقت اسے معلوم تھا کہ اماں مغالطے میں یہ ساری مہربانی کر رہی ہیں۔

خبر نہیں کیسے بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

"لیکن...... اماں ہم یہ میز پوش اور تکیے...... بانو کے لئے کاڑھیں گے...... آپ خفا تو نہ ہوں گی۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئیں۔

لیکن مشکبار نے کہا اس معصومیت اور سادگی سے تھا کہ جانے کیوں وہ چپ کی چپ رہ گئیں اسے لعنت ملامت کر سکیں اور نہ کپڑا منگوا دینے سے انکار کیا۔

چنانچہ اگلے دن انہوں نے باہر کا سودا سلف لا کر دینے والے لڑکے کو دکان پر بھیج کر کئی رنگوں میں سوتی کپڑوں کے تھان منگوا دیئے اور جن جن میں سے مشکبار نے کہا، کپڑا کٹوا کر دے دیا۔

اسی روز مشکبار کے پاس رنگ برنگے خوش رنگ ریشمی دھاگے بھی آ گئے۔

احساسِ تشکر سے اس کی آنکھیں بھر بھر آئیں۔

ایک دم ہی ماں کی طرف سے دل صاف ہو گیا اور وہ رہ رہ کر سوچنے لگی،

"ہائے اللہ! میری امی کتنی اچھی اور فراخ دل ہیں اور میں کتنی بری ہوں کہ دل میں کبھی ان کے لئے اچھا سوچتی نہیں۔ ان کی سہیلیوں کو بھی برا بھلا کہتی رہتی ہوں...... اف! خدا مجھے معاف کرے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھرا بھر جاڑوں نے ماحول کو ٹھٹھر اڈالا تھا۔

اور جاڑے بھی کیسے، دنوں سورج بادلوں سے منہ نہ نکالتا۔ ایسی ٹھنڈ، ایسے اکڑا ڈالنے والے سرد ہواؤں کے جھکڑ اور خنک خنک فضائیں کہ الامان! رگوں میں لہو جمتا محسوس ہوتا۔

لوگ باگ جلدی جلدی باہر کے کام کاج نمٹا کر گھروں میں سر شام جا چھپتے۔ گلی کوچے جلد ہی سنسان ہو جاتے۔ بھیڑ بھاڑ، رونق اور لوگوں کی چہل پہل نہ ہونے کی وجہ سے بازار بھی گرمیوں کی نسبت ذرا جلدی بند ہو جاتے۔

اس روز بھی بلاک کی ٹھنڈ تھی۔

صبح ہی سے فضاؤں میں کہر کی چادر تنی تھی۔ سرد جھونکے الگ مزاج پرسی کر رہے تھے۔ نائمہ بیگم کی طبیعت کئی دن سے زیادہ ہی گری گری تھی اوپر سے انہیں نزلے زکام کی شکایت بھی لاحق ہو گئی۔ وہ سارا دن پچھلے کمرے میں رضائی اوڑھے لیٹی رہتیں۔ جب دھوپ نکلتی تو باہر تخت پر آن بیٹھتیں۔

جاڑا بخار آجانے کی وجہ سے ملازمہ نے بھی لگاتار دو تین چھٹیاں کر لیں۔ مشکبار ایک دم ہی کام کے بیشمار بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔ مگر تھی صبر و تحمل والی زبان سے اف

تک نہ نکلنے دی اور سارا کام آرام و سکون سے سمیٹ لیتی۔ مجال ہے جو پیشانی پر بل بھی پڑ جائے۔

سارا دن تھک کر چور ہو جانے کے باوجود بھی رات کو اکثر وہ خاصی دیر تک تکیوں کے پھول کاڑھتی رہتی لیکن کبھی دلشاد اور شمشاد ضد کر بیٹھتے کہ آپا آج تو ہم کہانی سنیں گے --- پھر ان کا اصرار اتنا بڑھتا کہ بالآخر اسے ہتھیار ڈالنے پڑتے اور وہ بچپن میں نانی اماں سے سنی ہوئی کوئی کہانی شروع کر دیتی۔ جسے سنتے سنتے دونوں بھائی میٹھی نیند کی وادیوں میں جا اترتے اور یہ اپنی کشیدہ کاری کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ ہر ہر ٹانکے پر اسے بانو کی ہنستی مسکراتی شبیہ نظر آتی بعض اوقات اس کی کوئی پر مزاح بات یاد کر کے اس کے ہونٹ بھی مسکرا اٹھتے۔ درمیان میں اٹھ اٹھ کر بھائیوں کو اچھی طرح لحاف بھی اوڑھاتی جاتی --- یہی دونوں بھائی تو اس کی کل امیدوں کا مرکز تھے۔ ہر نماز کے بعد ان کی بھلائی، بہتری اور اچھے مستقبل کے لئے خدا کے حضور دعائیں مانگتی۔

❀

اس وقت بھی --- ابھی زیادہ رات نہیں بیتی تھی۔ دلشاد اور شمشاد کہانی سنتے سنتے سو گئے تھے اور مشکبار لحاف ٹانگوں پر ڈالے ریشمی دھاگوں سے پھول کاڑھ رہی تھی۔ یہ کڑھائی وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رنگین دھاگوں کا شیڈ بھی کپڑے پر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ہر پھول کی پتی میں جیسے نفاست اور صفائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے یہ خوبصورت مصروفیت مل جانے سے وہ بڑی مگن اور خوش رہتی۔ اس دن کے تصور میں یہ سوچ سوچ کر اس کا دل مطمئن رہتا کہ جس روز یہ میزپوش اور تکیے بانو کو ملیں گے تو کس قدر خوش ہو گی۔

اس وقت کڑھائی کرتے ہوئے بھی اس کے سادہ سے ذہن میں یہی خیالات گھوم رہے تھے --- اچانک اس کی قوت سماعت چونکی ہو گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ پوری طرح کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگی۔اس نے صاف طور پر سنا کوئی تیز تیز قدموں سے زینے اترتا آرہا تھا۔

ایک لمحے کو اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑ دھڑانے لگا۔

اس وقت رات کے اس پہر کون سردی اور پالے میں گھومتا پھر رہا ہے؟ اچانک اسے خیال آیا۔

ہائے اللہ! یہ کوئی چور اچکا نہ ہو جو چوکیدا کو چکر دے کر چوری کرنے ہمارے گھر آگھسا ہو---!"

اس خیال کو یوں بھی تقویت مل رہی تھی کہ اوپر کے حصے میں سوائے اماں اور ابا میاں کے کوئی بھی نہیں رہتا تھا اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ اتنی رات گئے وہ نیچے اتریں۔ مشکبار نے تو انہیں کبھی دن میں بھی یوں دھما دھم زینے اترتے نہیں دیکھا تھا۔

جب تک وہ خیالی گھوڑے دوڑاتی، زینے اترنے والے نے دروازے کی زنجیر بھی گرائی تھی۔ آواز صاف کمرے کے اندر تک آئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آخر ایسا دیدہ دلیر اور نڈر چور کون ہے جو رات کے اس پہر اتنے زور شور کے ساتھ سارے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔ جسے نہ گھر والوں کے جاگ پڑنے کا اندیشہ تھا نہ دیکھ لئے جانے کا خطرہ---

دفعتاً وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

ابا میاں کی آواز اس نے پہچان لی تھی۔ وہ چوکیدار کو پکار رہے تھے۔

معلوم نہیں اتنی رات گئے کیا کام پڑ گیا ہے؟

اس نے سوئی میں نیا دھاگا پروتے ہوئے سوچا۔ اس کے ذہن میں کھولا باندھی رہی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد قدموں کی چاپ دوبارہ ابھری۔

لیکن یہ صرف ابا میاں کے پیروں کی ہی چاپ نہیں تھی۔ بلکہ کئی قدموں کی

تھی۔ باوجود کوشش کے مشکبار سے رہا نہ گیا۔ وہ دبے قدموں اٹھ کر کمرے کے ے سے باہر جھانکنے لگی۔

❀

چوکیدار باہر کے دروازے پر کھڑا رہ گیا تھا۔ ابا میاں کے ہمراہ دو عورتیں تھیں۔ ا ملازمہ کو تو مشکبار نے صاف پہچان لیا مگر دوسری عورت اس کی سمجھ میں نہیں ۔سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے یہ عورت ابا میاں کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں کر اوپر چلی گئی۔

مشکبار کی پریشانی اور فکر مندی دوچند ہو گئی۔

اس کی سمجھ میں یہ سارا گورکھ دھندا نہیں آرہا تھا۔ اب اس کا دیدہ کڑھائی میں بھی ں لگ رہا تھا۔ خالی بیٹھے بیٹھے جی گھبرانے لگا۔ نیند بالکل اڑ چکی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں موہوم سا اندیشہ جاگا

کہیں امی کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔ کئی دنوں سے بیمار رہتے ہیں، یہ ں آتے ہی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اوپر جا کر صحیح صورتِ حال معلوم کرے۔ مگر ابا میاں کی وجہ سے نبط کئے ہوئے تھی حالانکہ انہوں نے آج تک کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ قدرتی طور ن سے بہت ڈرتی تھی۔ اس نے کبھی ان سے بات نہیں کی تھی چھٹی کے دن ہمیشہ ا کی یہی کوشش رہتی کہ ان کے سامنے نہ پڑنے پائے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی بے تابی اور پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا ہر طرف ں سناٹا طاری تھا۔ اگر وہ خود ابا میاں کو دو عورتوں کے ساتھ اوپر چڑھتے نہ دیکھ لیتی تو ن کرنا دشوار ہوتا کہ کچھ لوگ جاگ رہے ہیں۔

بہت دیر تک جب دل کو قرار نصیب نہ ہوا تو وہ اپنے تمام تر حوصلوں اور جرأتوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو یکجا کر کے بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور دبے دبے قدموں زینے کی طرف آئی۔ یہ وہی سیڑھیاں تھیں جو سارا دن اس کے پیروں تلے ہوتی تھیں، گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کبھی نیچے کبھی اوپر آنا جانا پڑتا رہتا--- اور اب رات کے ان لمحوں میں یہی زینہ بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن لگ رہا تھا۔

ایک منٹ بعد ڈیوڑھی میں کھڑی آہٹ لیتی رہی، چھت سے چلتے پھرتے قدموں کی دھیمی دھیمی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ بڑی ہی ہمت کر کے وہ پہلی سیڑھی چڑھی، پھر آہستہ آہستہ بیچ سیڑھیوں پر پہنچ کر رک گئی۔ یہاں سے سیڑھیاں مڑ جاتی تھیں اور اس موڑ سے سامنے کا آنگن اور باورچی خانے کی ایک کھڑکی صاف دکھائی دیتی تھی۔

یہ اس کی چھٹی حس ہی تھی کہ وہ ایک دم آگے نہیں بڑھ گئی۔ بس ذرا سی گردن بڑھا کر جھانکا--- ایک لمحے کے لئے جہاں کی تہاں رہ گئی۔ گویا پتھر کی بن گئی ہو۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

عین سامنے ابا میاں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔

اب وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ آگے جائے یا نہ جائے--- کہیں وہ پوچھ نہ بیٹھیں کہ تم اتنی رات گئے اوپر کیا کرنے آئی ہو؟ تمہارا کیا کام ہے؟ چلو بھاگو یہاں سے۔

باورچی خانہ روشن تھا اور وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

---یہ آدھی رات کو اماں کیا پکوا رہی ہیں؟

ابھی وہ اوپر جانے یا نیچے اترنے کا فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ دفعتاً کسی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز تیر کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

'ہائے اللہ۔'

مشکبار دھم سے وہی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس کا حساس سا چہرہ گلابی پڑ گیا اور ہونٹ خود بخود مسکرانے لگے۔

'---اچھا---تو ساری بات یہ تھی---راز کھل ہی گیا۔'

اس نے دل کی خوشگوار سی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے خوش ہو کر سوچا۔ پھر دھیرے دھیرے قدموں سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

دونوں بھائی بدستور نیند کے جھکولوں میں مست و بے خود تھے۔

اس نے بھی چارپائی پر لیٹ کر لحاف اچھی طرح چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔

بہت دیر کے بعد اب اسے سردی کا احساس ہوا تھا۔

ساری رات وہ خوابوں میں ننھے منے پیارے پیارے بچے دیکھتی رہی--- ہنستے، روتے، کھلکھلاتے بسورتے ہوئے بچے---

صبح تک ذہن میں یہی کھولا باندھی رہی کہ جانے اللہ نے بھائی دیا ہے یا بہن!

سویرے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ملازمہ گھر پر ہی موجود تھی مگر چادر والی عورت نہیں تھی۔

ملازمہ نے اسے دیکھتے ہی ہنس کر اطلاع دی۔

"مبارک ہو بی بی! خدا نے تمہیں ایک پیاری سی بہن دی ہے۔"

ابا میاں حسب معمول دفتر چلے گئے تو مشکبار بھی جھجکتی ہوئی کمرے میں گئی۔ اماں آنکھیں موندھے سیدھی لیٹی تھیں۔ شاید سو رہی تھیں۔ پاس ہی وہ منی سی جان لیٹی تھی۔ گلابی گلابی ننھے منے ہاتھوں اور خوبصورت نرم و نازک چہرے والی گڑیا--- مشکبار کو بہت بھائی--- بہت اچھی لگی--- وہ کتنی ہی دیر اسے پیار کرتی رہی۔

اگلے چند دن تو بہت مصروفیت رہی۔

نائمہ بیگم کے کہنے پر زور و شور سے چھٹی کی تیاریاں کی گئیں۔ تمام جاننے والوں کے گھروں میں بلاوے تقسیم ہوئے، بچوں کے نئے کپڑے بنے۔ گھر سجایا گیا اور ایک دن پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھٹی والے دن دونوں اماں بیٹی خوب اچھے اچھے گوٹے کناری والے جھلمل جھلمل کرتے ہوئے نئے کپڑے پہنے اور خوب بن سنور کر محفل میں بیٹھیں۔ چند ایک گانے بذاتِ خود ڈھولک پر نائمہ بیگم نے بھی گائے۔ بعض خواتین ان کے اس جوش و خروش اور اہتمام کو حیرت اور تعجب سے دیکھتی رہیں۔

حسبِ توفیق انہوں نے ہر گھر میں علیحدہ علیحدہ لڈو بھی تقسیم کرائے۔

غرضیکہ انہوں نے بیٹی پیدا ہونے کی خوب جی کھول کر خوشی منائی اور اپنا دل رکھا۔ اسی روز انہوں نے اس بچی کا نام 'ماہتاب بانو' تجویز کیا۔

مگر---قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

'ماہتاب بانو' کی ننھی سی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ جو کہنے والے کہتے ہیں کہ جن کے لاڈ گھنیرے، ان کے دکھ بہتیرے، تو یہی مثال اس ننھی سی جان پر بھی صادق آئی۔
جیسا نائمہ بیگم اسے پہلی اولاد کی طرح سینت سینت کر رکھا، نظر گزر سے پرہیز کیا۔ ہوا کا ایک جھونکا قریب سے گزر جاتا تو یہ چونکی ہو جاتیں، ویسا قدرت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

❀

سردی کا زمانہ تو تھا، کڑاکے کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ ایسی کہ لحاف سے ہاتھ بھی باہر نہ نکالا جائے۔ حالانکہ نائمہ بیگم ہر وقت ماہتاب بانو کو کرتا ٹوپی پہنائے رکھتیں اور گھنٹوں تخت پر دھوپ کھلایا کرتیں، مگر ہونی شدنی کو کون روک سکا ہے!

معلوم نہیں کب اور کیسے---بے چاری بچی کو ٹھنڈ لگ گئی۔ ڈاکٹروں حکیموں کو دکھاتے دکھاتے پسلی چلنے لگی۔

سب کی متفقہ رائے تھی کہ نمونیہ ہو گیا ہے اور نمونیہ بھی کیسا، ڈبل نمونیہ--- نائمہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابا میاں کی پریشانی بھی دیدنی تھی---ابھی تو

اس بچی کو گاؤں والوں میں سے کسی نے دیکھا تک نہ تھا۔

ابا میاں نے ہوسٹل ملازم کو بھیج کر گل کو بلوا لیا تھا، وہی ہر ڈاکٹر اور حکیم کے پاس بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

ایک تین دن کے اندر کئی معالج تبدیل کیے گئے۔ مگر ہوا وہی جو خدا کو منظور تھا۔
اس کی اجازت کے بغیر تو پتہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

چوتھے دن صبح صادق کے وقت---

ننھی ماہتاب نے اپنی ماں کی آغوش میں دم توڑ دیا۔

نائمہ بیگم نے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ روتے ہوئے اسے ابا میاں کی گود میں ڈال دیا۔

❀

معصوم ماہتاب کی اچانک موت نے نائمہ بیگم کا مزاج بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ جیسے آپ ہی آپ بجھ کر رہ گئیں۔ لیکن اس تبدیلی کے ساتھ ہی ان کا رویہ دلشاد اور شمشاد سے بڑی حد تک اچھا ہوتا گیا۔ بچے ماں کی محبت کو ترسے ہوئے ایک دم ہی ان کے ہو کر رہ گئے۔

خاص طور پر دلشاد تو ہر وقت یہی چاہتا تھا کہ ماں کے ساتھ دبکا رہے۔

ماہتاب کے انتقال سے مشکبار بھی سہم کر رہ گئی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا مگر اب دلشاد شمشاد کو ماں سے قریب دیکھ کر اسے روحانی خوشی کا احساس ہوتا۔

سال بھر کے وقفے سے نائمہ بیگم نے ایک تندرست بیٹے کو جنم دیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ بھی دو ماہ کا ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس کا نام انہوں نے بڑے ارمانوں سے 'جہاں زیب عالم' رکھا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ پکارنا نصیب نہ ہوا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے تھوڑے وقفے سے ان کے تین بچے، ان دونوں سمیت انہیں داغِ مفارقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے گئے۔

نائمہ بیگم کا صدموں، غموں اور دکھوں سے برا حال تھا۔ کچھ سمجھ نہ آتی کہ کیا کریں۔ قدرت گود تو ہری کرتی تھی مگر بھری نہ رہنے دیتی تھی۔ یہ تو سب میں زیادہ دکھ کی بات تھی۔ اس سے بہتر ہوتا کہ یہ بچے دنیا میں انہیں دکھ دینے آتے ہی نہ۔۔۔!

اپنے طور پر انہوں نے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ڈاکٹری اور حکیمی علاج تو وہ نوزائیدہ بچوں کا شروع ہی سے رکھتی تھیں مگر ان کی زندگی کی خاطر ابا میاں سے چوری چوری تعویذ گنڈوں تک پر اتر آئیں۔

لکھنؤ اور سہارن پور کے درمیان خاصا فاصلہ ہونے کے باوجود ان کے میکے سے اب بھی کبھی کبھار کا ناتہ جڑا ہوا تھا۔ اس عرصے میں ان کے بھائی ذاکر حسین نے موٹر خرید لی تھی ان کے حالات بہتر ہو گئے تھے۔ ان کی...... اماں ابھی تک حیات تھیں لیکن کبھی بھول کر بھی بیٹی کی دہلیز پر قدم نہ رکھا۔

ذاکر حسین کبھی سال چھ مہینے میں پھیرا لگا جاتے۔ ایک بار شاہ جہاں بھی ان کے ہمراہ آئی تھیں۔ یہاں چہیتی نند کو بچوں کے لئے بلکتا دیکھ گئی تھیں۔ ازراہِ ہمدردی اس نے لکھنؤ پہنچ کر تعویذوں کا ایک پلندے کا پلندہ بھیج ڈالا۔ مگر۔۔۔ کسی ایک تعویذ نے بھی خاک اثر نہ کیا اور نائمہ بیگم نامراد ہی رہیں۔

اب وہ خاصی حد تک چڑچڑی بھی ہو گئی تھیں اور ماہتاب بانو کے فوت ہو جانے کے بعد پہلے پہل جو انہیں دلشاد اور شمشاد پر مامتا آئی تھی۔ اب اس کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ وہ خود پے در پے صدموں سے ویران اور اجڑی اجڑی رہنے لگی تھیں۔

حالانکہ اگر سمجھ داری اور دیانتداری سے کام لیتیں تو ان تین بچوں سے بھی جی بہلا سکتی تھیں آخر کو یہ بھی ان ہی کی پیٹ کی اولاد تھے۔ لیکن ایسا ان کے لئے ممکن نہ ہوا اور وہ اپنی ہائے ہائے میں مصروف رہتیں۔

اب تو وہ ابا میاں کے طعام و قیام کا خیال بھی کم ہی رکھتیں۔ جی اٹھتا تو کچھ اپنے ہاتھ سے پکا بنا دیتیں ورنہ گھر میں جو کچھ ہوتا وہی ان کے سامنے بھی جاتا۔

انہی دنوں کوئی کھیل تماشہ یا دوسری دلچسپی یاد نہ آتی۔

اتنے عرصے میں مشکبار بھی خوب سمجھ دار اور ہوشیار ہو گئی تھی۔ باورچی خانے کا بیشتر کام کاج اس نے خود بخود بحسن و خوبی سنبھال لیا تھا۔ کھانا وغیرہ ماں کی طرح سلیقے اور ہنر مندی سے تیار کرنے لگی تھی۔

اس کے کاڑھے ہوئے تکیے اور میز پوش کب کے مکمل ہو چکے تھے مگر وہ آج تک بانو کو بھجوا نہ سکی تھی۔ ویسے کے ویسے بکس میں دبے پڑے تھے۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ بانو کے لئے مشکبار ایک یادِ پارینہ بن کر رہ گئی تھیں۔ اس ایک ملاقات کے بعد دوسری دفعہ کا ملنا نہ ہو سکا تھا۔ نہ وہ لوگ کبھی یہاں آئی تھیں نہ نائمہ بیگم نے کبھی پلٹ کر گاؤں جانے کا نام لیا تھا۔ وہ اپنی الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس دوران بس گل کا آنا جانا رہا۔

انہوں نے وکالت کا آخری سال بھی کامیابی کے ساتھ پاس کر لیا تھا۔ پھر ایک اچھے وکیل کے ساتھ مل کر پریکٹس کرنے لگے تھے۔ دو ایک سال کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ اپنی وکالت علیحدہ کر لیں گے۔

ان تینوں بہن بھائیوں کے ساتھ گل کا رویہ وہی پہلے کی طرح نرم اور خوشگوار تھا۔ وہ ان لوگوں کے لئے ایسے ہی کڑھتے تھے جیسے اپنے سگے اور ماں جائے بہن بھائیوں کے لئے۔

گزشتہ بہت سارے دنوں سے وہ ایک خاص طرح کی فکر میں غلطاں تھے۔ ایک اتوار کو ہمت کر کے انہوں نے اپنے والد کے سامنے وہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس روز چھٹی ہونے کی وجہ سے ابا میاں گھر پر ہی تھے۔ اور برآمدے میں لیٹے ہوئے کسی دینی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نائمہ بیگم دوسرے پلنگ پر براجمان ترکاری بنا رہی تھیں اور مشکبار باورچی خانے میں کچھ کام کر رہی تھی -- گل کچھ دیر نائمہ بیگم سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر برابر موقع کی تلاش میں رہے -- جیسے ہی ابا میاں نے کوئی بات کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے لحہ غنیمت جانا، بلا تمہید کہنے لگے۔

"ابا جی! یہاں اپنے گھر سے نزدیک ہی ایک نیا پرائمری اسکول کھلا ہے۔ دلشاد اور شمشاد سارا دن بے کار گھومتے اور شرارتیں کرتے رہتے ہیں، اگر آپ کی رائے ہو تو ان دونوں کو داخل کروا دیا جائے۔"

ابا میاں چونک کر ان کی صورت گھورنے لگے۔

نائمہ بھی ترکاری بنانا چھوڑ کر چاقو ٹوکری میں رکھ کر اس طرف متوجہ ہو گئیں -- مشکبار سرتاپا گوش بن کر باورچی خانے کے دروازے سے چپک کر یہ اہم ترین گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگی۔

ابا میاں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

"کہاں پر کھلا ہے یہ اسکول؟"

"یہاں سے چند گلی پیچھے ہٹ کر مین روڈ سے پہلے ہی، بڑا سا گیٹ ہے سبز رنگ کا محل وقوع ایسا ہے کہ موٹر کے وغیرہ کا خوف نہیں ہے۔ کیونکہ سڑک پار کرنی نہیں پڑے گی۔ گلیاں ہی گلیاں ہیں......"

"یہ تو تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔" ابا میاں نے ان کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

"اب یہ دونوں اتنے بڑے بڑے ہو چکے ہیں۔ الف ب تک نہیں جانتے۔ یہ تو

معلوم کرو ان کو درجہ اول میں داخلہ بھی مل جائے گا یا نہیں -- مجھے دراصل اب تک کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ اور تمہاری اماں ماشاء اللہ ان کی طرف سے ایسی غافل ہیں کہ نہ کبھی خود خیال کیا نہ میری توجہ دلائی۔ میں سمجھتا ہوں اس میں میری زیادہ غفلت کو دخل بھی نہیں ہے کیونکہ یہ میری عادت ہے کہ میں گھر کے اندرونی معاملات میں تاک جھانک نہیں کرتا۔ اب یہی دیکھ لو کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان دونوں بچوں کی کیا مصروفیات ہیں اور یہ سارا دن کیا کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کو کب کا ہی اسکول میں داخل کر دینا چاہیے تھا---"

وہ بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔

سب سر جھکا کر سنتے رہے۔ گل نے بہت نازک موضوع چھیڑا تھا۔ جو درحقیقت ابا میاں کے عین دل پر جا کے لگا تھا اور شاید وہ خود کو قصوروار سمجھ رہے تھے مگر انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ الزام نائمہ بیگم کو بھی دیا تھا۔

اور نائمہ بیگم ---وہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔ واقعتاً غفلت اور بے پروائی سے انہوں نے بھی کام لیا تھا۔ کبھی بچوں کی ضروریات کو قابلِ غور نہ سمجھا۔

گل کو ابا میاں کی اس درجہ حمایت کا یقین نہ تھا۔ خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ حوصلہ اور جرأت مزید بلند ہو گئی۔

انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مصالحانہ انداز میں کہنے لگے۔

"نہیں---ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ ویسے بھی دو ایک اساتذہ سے میری ذاتی واقفیت ہے داخلہ تو انشاء اللہ بآسانی ہو جائے گا۔ میں تو آپ کی اجازت اور رائے لینا چاہتا تھا۔ اگر آپ کہیے تو میں کل صبح ہی یہاں حاضر ہو کر بچوں کو اسکول چھوڑ آؤں گا۔ تمام اساتذہ سے تعارف بھی ہو جائے گا اور داخل بھی کروا دیے جائیں گے۔ تاخیر سے ویسے بھی کام نہیں لینا چاہیے -- ششماہی امتحانات سر پر ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور ادھر باورچی خانے میں مشکبار کا دل بلیوں اچھل اچھل جا رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر گل بھائی جان کے ہاتھ چوم لے۔ ان کے حق میں ہزاروں دعائیں کر ڈالے۔ جو اس کے بھائیوں کے لئے سگے خون سے بھی زیادہ بڑھ کر سوچ رہے تھے اور اپنے والد سے بے حد ڈرنے کے باوجود آج کتنا بڑا رسک لے کر وہ موضوع زیر بحث لا چکے تھے، جو آج تک کسی کے ذہن میں آیا ہی نہ تھا۔ بچے ہونے کی وجہ سے وہ دونوں سارا دن ماں سے پچاسوں کوسنے اور نت نئی گالیاں سنتے لیکن شوخیوں اور شرارتوں سے پھر بھی باز نہ آتے تھے۔ کوئی دوسری مصروفیت نہ ہونے کے سبب بعض اوقات ان کی ضدوں سے مشکبار کا بھی جی عاجز آ جاتا۔ ابا میاں کے دفتر چلے جانے کے بعد ساری سیڑھیوں میں اودھم مچاتے پھرتے۔ کبھی گرتے کبھی چوٹیں لگواتے۔

اب دونوں کے اسکول داخل ہو جانے کا منصوبہ سن کر سچی خوشی سے اس کی آنکھیں بار بار بھری چلی آ رہی تھیں۔ دل ممنونیت کے احساس سے لبریز تھا۔ آج بھائیوں کے بہتر مستقبل کے لئے مانگی ہوئی اس کی دعائیں پوری ہونے کا دن آ گیا تھا اور اس کے لئے وہ گل کی مشکور و ممنون تھی۔

ادھر باہر بالآخر آخری فیصلہ ہو چکا تھا۔

ابا میاں نے کھلے دل سے گل کو کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے میاں! تم ان دونوں شیطانوں کے داخلے کا بندوبست کرو مگر ان کو اسکول پرسوں لے جانا کل سویرے آکر انہیں درزی کے پاس لے جاؤ، یونیفارم وغیرہ سلے گا اور جو ان کا نصاب اور دوسری پڑھنے لکھنے کی چیزیں ہیں وہ سب خرید کر ان کے حوالے کرو۔"

"جی بہت اچھا۔" گل نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

ابا میاں ان سے باتیں کرنے کے بعد دوبارہ کتاب میں محو ہو گئے۔

اور گل نے مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف دیکھا جہاں مشکبار بے اختیار کھڑکی میں سے جھانک کر ان کو دیکھ رہی تھی۔

جیسے زبانِ حال سے ان کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔

گل کے لبوں پر ایک مطمئن اور پر سکون سی مسکراہٹ تیر گئی۔

آج وہ بھی بہت خوش اور آسودہ تھے۔

ابا میاں کے اس آسانی سے رضامند ہو جانے کا تو انہیں بھی گمان نہ تھا۔ بس ڈرتے جھجکتے ہی یہ ذکر چھیڑا تھا جو خدا کی قدرت کہ بالآخر کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

نائمہ بیگم دوبارہ ترکاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ اس ساری گفتگو کے دوران چونکہ وہ خود دل ہی دل میں قائل اور شرمندہ سی ہو چکی تھیں، اس لئے انہوں نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا اور تو اور ابا میاں کے اپنے متعلق ریمارکس کو بھی بڑی حوصلہ مندی اور وسیع النظری سے پی گئی تھیں۔ ظاہر ہے ہو انہی کی اولاد کی فلاح و بہبود کے لئے کہہ رہے تھے۔ ورنہ انہیں بھلا کیا ضرورت پڑی تھی۔

گل اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھے۔

باپ کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں پوچھنے لگے۔

"کیوں اماں جان! آپ نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی! اگر آپ ماسٹر جی کی پٹائی وغیرہ سے اندیشے میں مبتلا ہوں تو پھر...... پھر رہنے دیتے ہیں۔"

نائمہ بیگم جانتی تھیں وہ شوخی پر آمادہ لگ رہا تھا۔

انہیں جھوٹ موٹ جھڑک کر بولیں۔ "چپ رہے...... چلا ہے باتیں مٹکانے۔ میری بلا سے ماسٹر ان آفت کے پرکالوں کو ماریں یا تھپکیاں دیں۔ بھلے سے چند گھنٹوں کے لئے گھر سے دور تو رہیں گے۔ یہاں تو سارا دن اور دوپہر وہ ناک میں دم رکھتے ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ بس توبہ بھلی۔ مجھے تو ان نگوڑ مارے اسکولوں کا معلوم نہ تھا ورنہ میں تو اردلی کے ساتھ بھجوا کر ان شریروں کو کب سے اسکول میں بندھوا چکی ہوتی۔"

ان کے لفظ 'بندھوانے' پر گل ہنس پڑے۔ "واہ اماں! آپ نے تو بیک جنبش زبان مکتب کو 'اصطبل' بناڈالا۔ اسکول نہ ہوا وہ باڑا ہو گیا جہاں مویشی باندھے جاتے ہیں۔"

وہ بھی ہنس پڑیں اور مشکبار کو آواز دے کر بولیں۔ "لو بھئی یہ ترکاری لے جاؤ۔ ہم نے بنادی ہے۔ اب پکانا تمہارا کام۔"

وہ ترکاری لے کر دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی تو گل تردد سے بولے۔ "اماں! خدا معلوم آپ کو کیا ہو گیا ہے اب تو ہفتوں آپ کے ہاتھ کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی۔ وہاں ہوٹلوں کا ابلا ابلایا کھانا کھا کھا کر طبیعت اوب جاتی ہے۔ یہاں ہر اتوار کو اس لئے دوڑے چلے آتے ہیں کہ آج ضرور ہماری اماں نے کوئی مزے کی چیز بنائی ہو گی۔ مگر......اس نے منہ بسورتے ہوئے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

نائمہ بیگم کو ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔ "اے تم تو اس طرح رونے بیٹھ گئے جیسے مشکبار ڈھنگ کا نہ پکاتی ہو۔ میرا تو خیال ہے اب وہ اچھا خاصا مزے کا کھانا تیار کر لیتی ہے۔ کوئی ایسا خاص نقص یا کمی نہیں ہوتی۔ اسی لئے تو میں بھی بے فکر ہو گئی ہوں۔"

"اجی چھوڑیئے۔" گل جھنجھلا کر بولے۔ "جو آپ کے ہاتھ میں لذت اور مزہ ہے وہ دوسرے کے ہاتھ میں تھوڑی ہی ہو سکتا ہے۔ آپ کی باتوں سے بہلے وہ جس نے آپ کے تیار کردہ کھانے چکھے نہ ہوں۔ افسوس! مجھے تو وہ گیا وقت ہاتھ نہیں لگتا۔"

نائمہ بیگم کو اپنی تعریف سن کر دلی خوشی ہوئی۔

بہت دنوں کے بعد کسی نے ایسی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ ان کے خود باورچی خانے میں دلچسپی نہ لینے پر ٹوکا تو ابا میاں نے بھی تھا مگر ایک دو بار کہنے کے بعد چپ

سادھ لی تھی اور اب خاموشی سے جو پکتا کھا لیتے تھے۔ وہ فطری طور پر شریف النفس انسان تھے، ان کا خیال تھا کہ پے در پے اولاد کا زخم کھا کھا کر ان کی بیوی کا دل زخمی ہو چکا ہے اور اب بلاوجہ ان کو چھیڑنا کم ظرفی کے مترادف ہو گا۔

مگر آج گل جو شکوہ کرنے پر اترے تو گلہ کرتے چلے گئے۔ نائمہ بیگم ان کی ضد پر بہت دنوں کے بعد کھل کر ہنس رہی تھیں۔ انہیں اس وقت وہ گل کا اپنائیت بھرا لہجہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یوں خود ان کا رویہ گل سے ہمیشہ بہت بہتر اور مناسب رہا تھا۔ وہ گل کو کافی حد تک پسند کرتی تھیں اور ان کی کسی بات کا برا بھی نہ مانتی تھیں۔

اس دفعہ بھی انہوں نے پاندان اپنی جانب کھسکاتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔ "اے بھئی! دل کیوں میلا کرتے ہو۔ اگر ہمارے ہاتھ کا کھانا ہی پسند ہے اور اتنی کمی محسوس کرتے ہو تو یہ کونسی بڑی بات ہے کسی روز پکا کر کھلا دیں گے --- بس اب خوش ہو جاؤ۔"

گل پہلے سے بھی زیادہ اترا کر بولے۔ "کسی روز کا کیا مطلب ہوا! اور آج میں آخر کیا قباحت ہے؟ یہ نیک کام آپ آج ہی کیوں نہیں کر ڈالتیں۔"

"اس وقت!" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ "نابابا--- اب تو بہت دوپہر چڑھ گئی ہے۔ جو کچھ مشکبار پکا رہی ہے وہی صبر شکر سے کھا لینا۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ اگلی اتوار کو ضرور کوئی نہ کوئی اہتمام کر ڈالوں گی۔ چلو لگے ہاتھوں تمہارے باوا پر بھی احسان ہو گا۔ پچاس بار ٹوک چکے ہیں مجھے۔"

آخری جملہ انہوں نے ابا میاں کو سنانے کے لئے کہا تھا اور کہہ کر بے اختیار ہنس بھی پڑی تھیں۔

مگر انہوں نے شاید ساری گفتگو ہی نہیں سنی تھی۔

اسی طرح کتاب پڑھنے میں مصروف رہے۔ متوجہ نہیں ہوئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نائمہ بیگم اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔

اور گل، شمشاد و دلشاد کو بلا کر ان سے اسکول کی باتیں کرنے لگے۔

جاتے جاڑوں اور آتی گرمیوں کے خوشگوار شب و روز تھے۔ نہ زیادہ گرمی --- نہ زیادہ سردی۔

ایسے میں قدرت نے ایک بار پھر نائمہ بیگم کی جھولی بھر دی۔

اس دفعہ ان کی گود میں سانولی رنگت، معمولی سے نقوش اور دبلے پتلے وجود والی نازک سی بیٹی نے آنکھ کھولی تھی۔

دلشاد، شمشاد اور مشکبار کی بہن تو وہ کسی طرف سے بھی نہ لگتی تھی۔ نہ ہی ابا میاں کی سرخ و سپید رنگت لی تھی اس نے۔ نہ نائمہ کے تیکھے تیکھے نقوش چرائے تھے۔ بس اپنے رنگ میں رنگی ہوئی۔

--- اور --- خدا کی شان --- کہ یہی بچی جی پڑی نہ اسے نزلہ زکام ہوا نہ کھانسی کھرے نے پکڑا، بخار آیا نہ بیمار ہوئی۔ ہاں ہاتھوں پیروں اور آنکھوں میں زندگی کی چمک ہی چمک بھری پڑی تھی۔ اور واقعی وہ جی بھی گئی۔

اس کی روز افزوں بڑھتی صحت دیکھ کر ماں باپ پھولے نہ سماتے۔ ایک مرتبہ بھی ڈاکٹر کے چکر لگانے نہ پڑے نہ ملاسیانوں کو دکھانے کی نوبت آئی۔ نائمہ بیگم اس کا مکھڑا دیکھ دیکھ کر جیتیں۔ پچاسوں ہی رنگ برنگی فراکیں سی ڈالیں۔ وہ بھی خوب شوخ تھی۔ ماں کو دیکھ دیکھ کر ہنستی --- کھلکھلاتی --- جو بھی توفیق ہوئی نائمہ بیگم بھی کبھی اس کا صدقہ، کبھی خیر خیرات کبھی اتارے دیتی چلی گئیں۔ خدا نے زندگی دے کر دنیا میں بھیجا تھا، سو اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ دھیرے دھیرے تین چار ماہ کی مدت بیت گئی۔

اب وہ اس کی طرف سے خاصی مطمئن رہنے لگی تھیں۔ اس مرتبہ خود نام رکھنے

کے بجائے سامنے والی جامع مسجد کے حافظ صاحب کو بلوا کر نام رکھوایا۔ اور اسی روز سے
ر کے سب سے چھوٹوں میں وہ 'عائشہ بیگم' کے نام سے پکاری جانے لگی۔ لاڈلی ---
تی اور اکلوتی --- عائشہ --- دیکھتے ہی دیکھتی ماضی والی خوش لباس، خوش خلق اور خوش
نائمہ بیگم دوبارہ بیدار ہوتی چلی گئیں۔

ایک عائشہ کیا ملی، ان کی اجاڑ اور سنسان گلی کی سی زندگی لہلہا اٹھی۔ دھیرے
ھیرے سارے رنگ دوبارہ چمک اٹھے تھے اب وہ پہلے کی طرح اپنے پسندیدہ کاموں
ں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ زندگی میں اک گہما گہمی اور رونق سمٹ آئی تھی۔ اس
شگوار تبدیلی سے ابا میاں نے سکون کا سانس لیا۔

اگر کہیں عائشہ بولنے کے لائق ہوتی اور وہ آسمان کے تاروں کی فرمائش کر بیٹھتی
چھ تعجب نہ تھا کہ اس کی اماں سنجیدگی سے تارے توڑ لانے کی ترکیب بھی سوچنے
جاتیں --- بچی کی ایک معمولی سی چیخ ان کے دل کا ناسور بن جاتا۔ ایسا ہتھیلی کا پھپھولا
کہ اگر سو رہی ہے تو کسی کا زور سے بولنا تو دور کی بات، کسی کی مجال نہ ہوتی کہ چلے
پیروں کی دھمک تو پیدا ہو جائے!

وہ تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ گل نے شمشاد اور دلشاد کو اسکول کی راہ دکھلا دی تھی
وہ صبح کے گھر سے نکلے بعد دوپہر ہی اندر گھستے تھے ورنہ اللہ معلوم ان کی شرارتوں پر
ا ان کا کیا حشر نہ کر ڈالتیں! پکے فرش پر مشکبار قدم دبا دبا کر چلتی، کسی وقت بے
ں میں زینے تیز تیز چڑھ آتی اور ایسے میں جو عائشہ سو رہی ہوتی تو اماں ایک زبان میں
رصلوٰتیں سنا ڈالتیں۔

چڑیل، ڈائن اور کٹنی، تو ان کے مخصوص القابات تھے جن سے وہ مشکبار کو بلا تکلف
میں کئی دفعہ نواز ڈالتیں۔ ان کے علاوہ کوسنے بھی تھے، جو خاص انہی کی ایجاد تھے
بار ہر کوسنے پر دل مسوس کر رہ جاتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماں کے سراسر ترجیحی سلوک سے ایک آہ اس کے دل سے نکلتی اور بعض اوقات تو بڑی مظلومیت سے سوچنے لگتی۔

'اے اللہ میاں! تونے اماں کو اتنی کڑی اور زہریلی زبان کیوں عطا کی ہے؟ ایسی ایسی باتیں تو کوئی ماں بھی اپنی بیٹی کو نہ سناتی ہوگی۔ میں ایسی کون سی خطا کر جاتی ہوں؟ سارا دن تو ان کی مرضی کے مطابق کام کاج میں الجھی رہتی ہوں۔ یہ پھر بھی کبھی خوش نہیں ہوتیں۔ عاشی ذرا سی ہے پھر بھی ہر وقت...... اس کے لئے نت نئے کپڑے اپنے ہاتھ سے سیتی ہیں اور ہمیں تو کبھی ایک دوپٹہ بھی رنگ کر نہیں دیا--- کبھی بال بھی نہیں سلجھائے ہمارے!'

اپنے بالوں کے متعلق سوچ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو قطار در قطار بھر آتے۔

جہاں اسے قدرت نے لمبے لمبے قابل رشک کالے بھنورا سے بال عطا کئے تھے وہی اسے خدا کی یہ عطا بہت بڑا عذاب معلوم ہوتے۔ کسی نہ کسی طرح سلجھا سلجھا کر چوٹی تو وہ باندھ لیا کرتی تھی مگر ان بالوں کا دھونا--- اس کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا! جب تک وہ لکھنؤ میں تھی، نانی اماں ہمیشہ اسے بلوا کر بڑی محنت اور محبت سے اس کے بال دھوتیں، خوب دیر تک ایک ایک بال میں تیل جھلتیں اور پھر کس کے چوٹی باندھ دیا کرتیں۔

مگر اب وہ زمانے کہاں تھے بھلا---!

سب کچھ خواب وخیال ہو چکا تھا۔

نانی اماں کے تصور کے ساتھ ہی اسے اپنے چچا، چچی اور ان کے بیٹے یاد آجاتے-- بچپن کی شوخیاں، شرارتیں یاد آتیں -- منوں مٹی تلے سو جانے والے جان سے پیارے -- ابا یاد آجاتے۔ اور ان سب انمول اور قیمتی یادوں کے ساتھ ساتھ ہی--

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ جاتی۔

چند برسوں کے اندر کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

انقلابات آگئے تھے---زندگیاں الٹ پلٹ کر رگئی تھیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، گھر میں عائشہ کی اہمیت بڑھتی جارہی تھی۔ نائمہ بیگم کی لاڈلی اور چہیتی جو تھی۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب گھر گھر انگریزی کی اہمیت اور ضرورت کے چرچے گونج رہے تھے۔ لوگ انگریزی پڑھ رہے تھے۔ سیکھ رہے تھے۔ بچوں کو انگریزی طرز معاشرت سے آگاہی ضروری خیال کی جانے لگی تھی۔ خوش حال گھرانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں داخلے لے رہے تھے۔

نائمہ بیگم اپنے آس پاس اور ملنے جلنے والوں کے بچے کے یہ چونچلے اور ڈھنگ بہ نظر غور دیکھ رہی تھیں۔ اور سب کچھ ذہن نشین کئے جارہی تھیں۔ عائشہ ابھی اس قابل تو نہ تھی کہ پڑھائی لکھائی جاتی۔ اس لئے نائمہ بیگم نے اپنی حسرت یوں پوری کی کہ عائشہ کے لئے الگ سے ایک ملازم رکھا گیا جو ہر شام اسے باقاعدگی سے بچہ گاڑی میں بٹھا کر قریبی پارک میں ہواخوری کے لئے لے جاتا۔ نائمہ بیگم نے درزی سے اس کے لئے خوبصورت اور انگریزی طرز کے کپڑے بھی سلوائے اور ابھی سے اس کے بال بوائے کٹ رکھوائے تھے۔

ننھی عائشہ کے یہ ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر مشکبار کے دل میں کبھی حسد یا رشک کے جذبات نہیں بھڑکے۔ وہ اس کے اچھے اچھے کپڑے اور کھلونے دیکھ کر خوش ہوتی۔ لیکن نائمہ بیگم خود ہی کبھی ایسی اوچھی بات کر جاتیں کہ وہ دہل کر رہ جاتی اور بعد میں سوچتی ہی رہ جاتی کہ اماں ایسی فرق والی بات کیوں کرتی اور سمجھتی ہیں-- جس کا مجھے گمان تک نہیں ہوتا-- میں کوئی بیوقوف ہوں کہ اپنی ہی ذرا سی بہن سے جلوں گی! اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر---مجھ میں اور اس میں تو کتنے ہی سارے برسوں کا فرق حائل ہے!

ایک روز اس کے ہاتھ سے دھوتے ہوئے عاشی کے دودھ کی بوتل گر کر ٹوٹ گئی اور اتنی سی بات پر اماں نے کس کس کر دو دھو کے اس کی پیٹھ پر جڑ دیئے۔

یہ بھی خیال نہ کیا کہ اب وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں رہی کہ یوں بچوں کی طرح پٹے۔

مگر نائمہ بیگم کی سی مطلق العنان حکمران کو بھلا یہ سچ کون سنا سکتا تھا؟ مشکبار کو اس مار کو بہت ملال ہوا تھا اور جب اماں دوپہر کو عائشہ کے ساتھ اپنے کمرے میں جا سوئیں تو وہ بہت دیر تک چھجے پر کھڑی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ نیچے بازاروں میں خوش باش لوگوں کا اژدھام تھا۔

کھلی کھلی سڑکیں اور نکھری نکھری فضائیں تھیں۔

فٹ پاتھوں پر چلنے والے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ بچے گلیوں میں خوبصورت بستے ڈالے آ جا رہے تھے۔ رونق تھی---چہل پہل تھی--گہما گہمی اور شور و غوغا تھا۔

مگر آج مشکبار کے دل کو سکون نہ تھا۔ روح جیسے داغدار ہو گئی تھی۔ لاکھ نہ چاہنے کے باوجود نائمہ بیگم سوتیلی ماؤں کی طرح ننھی عاشی کے لئے خود بخود اس کے دل میں تعصب اور حسد پیدا کر رہی تھیں۔

"یا اللہ! میں کیا کروں--اور کہاں جاؤں!"

اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھ کر خود ہی اپنے آنسو پونچھ لئے۔ ظہر کی اذان ہو چکی تھی اور سامنے جامع مسجد کے صحن میں نمازی جمع ہونے لگے تھے۔ مسجد بھری بھری اور آباد ہو رہی تھی۔

ابا میاں کا یہ گھر کچھ ایسے محل وقوع سے بنا ہوا تھا کہ اونچائی پر بنی ہوئی جامع مسجد کا صحن اور سامنے کا برآمدہ یہاں سے صاف نظر آتا تھا۔ مشکبار کا جب بھی جی گھبراتا وہ

یہاں سے نمازیوں کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے، وضو کرتے اور نماز ادا کرتے ہوئے کتنی کتنی دیر کھڑی دیکھتی رہتی۔

یہ پانچوں وقت کا روح پرور نظارہ اسے بہت تسکین دیتا تھا۔

اس چھجے سے گھوم کر اگر دوسری طرف کے جنگلے میں جا کھڑے ہوتے تو ایک وسیع و عریض حویلی کی بالائی چھت کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ چھت بہت کشادہ اور خوبصورت طرز تعمیر کا منہ بولتا شاہکار لگتی تھی۔ سامنے کو ڈھلواں چھت والی برساتی بنی تھی۔ جس کے گول گول سرخ رنگ کے ستون دوپہر کو سورج کی روشنی میں اور رات کو چاند کی اجلی چاندنی میں بہت خوبصورت لگتے تھے۔ چھت کا آنگن کچھ اس انداز سے بنا ہوا تھا...... کہ ہر طرف سے گول نظر آتا تھا۔ فرش اتنا چمکدار اور صاف جیسے وارنش کی گئی ہو۔

اب تو خاک دھول سے ماند پڑ گیا تھا۔ صفائی کون کرتا! کیونکہ اس حویلی میں رہنے والے لوگ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ بہت دن گزر گئے تھے مشکبار صرف اتنا جانتی تھی کہ اس حویلی کے مکین کسی نواب فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آج کل کہاں غائب تھے؟ وہ لاعلم تھی۔ حویلی نیچے اوپر ویران اور سنسان پڑی رہتی ورنہ اکثر بچوں کے شور و غل کی آواز ہی چھت سے سنائی دے جاتی تھی۔

اس وقت دوپہر میں وہ تنہا کھڑی کھڑی سوچ میں ڈوب گئی۔

مسجد میں مولوی صاحب نے نماز شروع کر دی۔

وہ بھی اس نیت سے مڑی کہ جا کر وضو کرے اور دنیاداری کی خرافات کو چھوڑ کر اپنے خدا کے حضور جھک جائے۔ جو نیتوں کا بھید جانتا ہے۔

عین اس وقت جبکہ وہ مڑنے کا قصد کر رہی تھی، اس کی نگاہ نیچے جم کر رہ گئی۔ یوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشکبار جیسے خوشی اور مسرت سے بے خود ہوئی جا رہی تھی۔ یوں گویا اس کے اپنے سگے رشتے دار آگئے ہوں۔ حالانکہ نہ اس کا خون کا رشتہ تھا۔ نہ پہلے سے کوئی جان پہچان۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ ان سب کے خلوص نے اس کا دل اس حد تک موہ لیا تھا کہ وہ اپنے پرائے کی تمیز بھول گئی تھی۔

نائمہ بیگم جو اس کے دہائی دینے پر ہڑ بڑا کر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھیں، اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر پوچھنے لگیں۔ "اے کیا ہو گیا ہے دیوانی لڑکی! ہوش و حواس میں بھی ہے یا دن میں خواب دیکھنے لگی ہے۔ کون آرہا ہے تیرا باپ اس دوپہر میں۔"

❀

مشکبار کو جیسے ہوش آگیا۔ لیکن پھر بھی سرخوشی کے عالم میں جلدی سے بولی۔ "اماں! بتا تو رہی ہوں کہ گاؤں سے سارے لوگ آئے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے عباس بھائی کو یکے سے اترتے دیکھا ہے۔"

نائمہ بیگم کو اور کچھ نہ سوجھا تو مسہری کے نیچے جھک کر اپنی جوتی تلاش کرنے لگیں اسے مارنے کے لئے۔

مگر اس سے قبل کہ وہ اپنی حسرت پوری کرتیں، آگے آگے عباس اور ان کے پیچھے پیچھے وہ سب کی سب کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"السلام علیکم! کہئے کیسے مزاج ہیں؟"

عباس نے بھاری بھر کم آواز میں نائمہ بیگم کو سلام کیا اور ان کی مزاج پرسی بھی کی۔ وہ بے چاری ہکا بکا اپنی جگہ پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

بانو بھاگ کر مشکبار سے لپٹ گئی تھی اور کسی طور پر اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔

سکینہ بھابی اور رئیسہ آگے بڑھ کر ساس کے قریب کھڑی ہو گئیں۔

نائمہ بیگم نے جلد ہی اپنی بدحواسی پر قابو پالیا۔ سب کو محبت اور خلوص سے بٹھایا۔

گویا اس نے ساکت کر دیا ہو--- اس نے دیکھا بڑی سڑک سے مڑ کر دو یکے گھر کی طرف آئے اور بالکل دروازے کے سامنے رک گئے۔ دونوں یکوں پر چاروں طرف سے پردے منڈھے ہوئے تھے اوپر گول چھتریاں تھیں۔

مشکبار نیچے مزید نیچے کی طرف جھک کر غور سے دیکھنے لگی۔

وہ جی ہی جی میں اندازے لگانے لگی۔

"یہ اتنے سارے مہمان کہاں سے آگئے ہمارے ہاں--! ہائے اللہ! کہیں اماں کی سہیلیاں وغیرہ نہ ہوں۔ پھر تو سمجھو شامت آئی۔"

اچانک---

اس کی ساری سوچیں، سارے خیالات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے۔ آنکھوں کے گوشوں میں ایک جانی پہچانی سی چمک لہرا گئی-- دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں سرسرانے لگیں۔ اس کا جی چاہا۔ یہیں سے ایک زوردار خوشی کا نعرہ مار کر نیچے کود جائے اور سب کے گلے لگ جائے۔

وہ سب ایک ایک کر کے یکوں سے اتر رہے تھے۔

تبھی مشکبار کو جیسے ہوش آگیا۔

وہ الٹے قدموں بے تحاشہ چلاتی ہوئی نائمہ بیگم کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"ارے..... اماں اٹھئے..... جلدی سے اٹھ جائیے..... وہ..... گاؤں سے بہت سارے مہمان آئے ہیں..... وہ سب نیچے یکوں سے اتر رہے ہیں..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے..... ایک ایک کو پہچان بھی لیا ہے..... ان میں بھابی سکینہ بھی ہیں۔ رئیسہ بھی..... اور اماں..... سنئے تو۔ ان کے ساتھ بانو بھی آئی ہے۔ میں نے اس کو چادر کے اندر سے پہچان لیا ہے..... وہ بانو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ اب آپ جلدی سے اٹھ جائیے اماں..... وہ لوگ اوپر آنے والے ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اڑ گئی تھیں۔ ہر روز مشکبار کو خواب میں دیکھتی تھی آج بھی سارے سفر کے دوران اس کی باتیں کر رہی تھی۔ کئی بار ہم نے ٹوکا بھی مگر اس کی زبان تو میرٹھ کی قینچی بنی ہوئی تھی۔

مشکبار، بانو کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

آج اس کا ایک ایک رواں خوش تھا ان سب کو اچانک دیکھ کر وہ اپنی ساری رنجشیں بھول بیٹھی تھی۔ اسے صحیح معنوں میں بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

شربت کے دوران نائمہ بیگم نے خاموش بیٹھی بھابی سکینہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے! سکینہ جب سے آئی ہیں، چپ بیٹھی ہیں۔ کسی بات میں دلچسپی نہیں لے رہیں اور میں دیکھ رہی ہوں یہ پہلے کی نسبت کمزور بھی بہت ہو گئی ہیں۔ کیا بیمار ہیں؟

❀

سب ایک دم ہی خاموش ہو گئے۔

رئیسہ کے چہرے سے ایک تاریک سا سایہ گزر گیا۔

سکینہ بھابی اب بھی خاموش رہیں۔ جیسے چپ کا روزہ رکھ رکھا ہو۔

عباس کھنکار کر بولے۔ "آپ کو کیا بتاؤں! سوچا تھا۔ فرصت سے عرض کروں گا۔ مگر اب آپ نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو بتا دوں کہ انہی کی وجہ سے ہم آج شہر آئے ہیں۔ ان کی طبیعت بہت دنوں سے خراب رہنے لگی ہے۔ آپ خود ہی دیکھ رہی ہیں کہ یہ پہلے کیا تھیں اور اب کیا ہو گئی ہیں جس نے جو بتایا ہم تو کر چکے ہیں۔ اپنے گاؤں کے علاوہ آس پاس کے ہر حکیم اور ہر وید کو گھر پر بلا بلا کر ان کا علاج کرایا مگر کوئی آرام نہیں آتا۔ کوئی کچھ مرض تجویز کرتا ہے کوئی دوسری بیماری بتاتا ہے۔ اب عاجز آ کے ہم نے ادھر کا رخ کیا ہے۔ یہاں سہارن پور میں تو ایک سے ایک ڈاکٹر ہو گا۔ سوچا ہے کہ ابا میاں سے مشورہ کر کے اب انگریزی علاج کروا کے دیکھ لیتے ہیں۔ شاید اسی سے کچھ شفا مل جائے۔"

فرداً فرداً ہر کسی کی خیر خیریت دریافت کی۔ فاطمہ پھوپھو کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا ان کی بینائی پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے اس لئے ساتھ نہیں آسکیں نہ ہی وہ کہیں گھر کے علاوہ آنا جانا پسند بھی کرتی تھیں۔

عباس ایک طرف کرسی پر بیٹھے ننھی عائشہ کو گود میں لئے پیار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں ایک خوشگوار سا ہنگامہ مچ گیا۔ سکینہ بھابی اور رئیسہ کے بچے بھی آئے تھے اور بچوں سے جو ماحول میں ایک دم رونق ہو جاتی ہے وہ سبھی جانتے ہیں۔ اسی شور میں عائشہ بھی اٹھ بیٹھی تھی اور اب عباس کی گود میں ٹھنسی ایک ایک کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔

جب ہنگامہ ذرا سرد پڑا اور ایک دوسرے کی بات سمجھ میں آنے لگی تو نائمہ بیگم نے مسکراتے ہوئے مشکبار کی طرف دیکھا اور کہنے لگیں۔

"مشکبار! بانو سے باتیں کرنے کو بہت وقت پڑا ہے۔ ذرا اٹھ کر سب کے لئے شربت تو تیار کر لو۔ بچے پیاس کی شدت سے بلک رہے ہیں۔"

ہاں اماں! جا رہی ہوں۔" وہ خوش خوش یہاں سے اٹھ گئی۔

بانو بھی اس کے پیچھے ہی لپک گئی۔ اسے شہر آنے سے زیادہ مشکبار سے ملنے کی خوشی ہو رہی تھی اور اب اس سے ایک پل بھی الگ ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دونوں نے باتیں کرتے کرتے باورچی خانے میں جا کر شربت تیار کیا اور ٹرے میں کانچ کے گلاس سجا کر ہنستی مسکراتی دوبارہ کمرے میں آئیں۔

نائمہ بیگم ہنس کر بولیں۔ "اے بانو! تم آتے ہی کام میں لگ گئیں۔ بھئی یہ کیا بیوقوفی ہے؟"

وہ ہنس کر چپ ہو رہی لیکن رئیسہ بولی۔ "اجی آپا بیگم! بانو کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ جب سے سہارن پور آنے کا سنا تھا اس کی نیندیں مارے خوشی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساری تفصیل سن کر نائمہ بیگم کو سچ مچ بہت افسوس ہوا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔ "آخر تکلیف کس نوعیت کی ہے؟ یہ کیا محسوس کرتی ہیں؟"

اس دفعہ سکینہ بھابی خود بولیں۔ "آپا بیگم! تکلیف بظاہر ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ میں خود اس انوکھی بیماری سے تنگ آچکی ہوں۔ اب یہ آخری علاج سمجھ کر اوران سب کے بے حد اصرار پر یہاں آگئی ہوں۔ اگر اب بھی میں اچھی نہ ہوئی تو خدا معلوم-- میں کیا کر گزروں گی۔ میں نے بھی بس یہ فیصلہ کر لیا ہے۔"

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آخری جملہ انہوں نے صرف اپنے میاں سے مخاطب ہو کر انہیں ہی سنانے کو کہا ہے۔

عباس بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے مگر زبان سے کچھ نہیں بولے۔ نائمہ بیگم نے اچنبھے سے پوچھا۔

"اور...... تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آخر مرض کیا ہے۔ تم کیا محسوس کرتی ہو! ان مایوس کن باتوں کا کوئی تو سبب ہوگا۔ بھلا ایسی کونسی بیماری ہے جو حکیموں اور ویدوں کی بھی سمجھ سے بالاتر ہے! کچھ تو بتاؤ---"

سکینہ بھابی نے اسی مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

"بس آپا بیگم! ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا دل ڈوبا جارہا ہے-- بیٹھا جارہا ہے-- اور بیٹھ جاتا بھی نہیں-- بعض دفعہ سانس تیز تیز چلنے لگتا ہے۔ کبھی تھم تھم کے آتا ہے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ٹھار پڑ جاتے ہیں اور سر میں بے شمار چکر ہی چکر بھر جاتے ہیں۔"

نائمہ بیگم جوان کی باتیں بغور سن رہی تھیں اور دل ہی دل میں کسی خاص نتیجے پر پہنچ رہی تھیں، ان کے خاموش ہوتے ہی وثوق سے بولیں۔"

عباس جلدی سے کہنے لگے۔ "جی ہاں اسی لئے ہم نے تھک ہار کر ادھر کا رخ کیا ہے۔ شاید خدا تعالیٰ یہیں صحت یاب کردے۔ ہمارے یہاں رہنے سے آپ کو تکلیف تو بے شک ہوگی مگر میں بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ پھر آپ سے ملنے کے شوق میں بانو اور دوسرے بچوں نے بھی ضد پکڑلی......"

نائمہ بیگم نے ان کی بات کاٹ دی اور قدرے برا مان کر بولیں۔ "دیکھو میاں عباس! یہاں ایسی غیریت والی باتیں تو کرو نہیں۔ اگر کہیں تمہارے ابا میاں یہ باتیں سن لیں تو آفت کر دیں گے۔"

اب یہاں اسی قسم کی باتیں چھڑک گئی تھیں۔

مشکبار، ماں کا اشارہ پاکر مہمانوں کے لئے کچھ کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بانو بھی اس کے ساتھ ہی باورچی خانے میں آگھسی۔

پھر تو وہ سارا دن سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ رات کو سوئی بھی اسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے کمرے میں۔

ساتھ رہنے کی وجہ سے باتیں تو تمام دن ہی ہوئی تھیں۔ مگر رات کو جب یہ دونوں لیٹیں تو مشکبار نے وہ بات پوچھ ڈالی جو سکینہ بھابی کو دیکھتے ہی اسے یاد آگئی تھی اور ایک دفعہ بانو اس موضوع پر اس سے بات کر چکی تھی۔

بانو ایک منٹ خاموش رہی پھر دھیرے دھیرے سے بولی۔ "اس روز جو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو عام طور پر اس کا نکاح وہیں سسرال میں کسی سے کر دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ عدت پوری ہو جانے کے بعد تم دیکھ لینا رئیسہ بھابی کا نکاح عباس بھائی صاحب سے پڑھوا دیا جائے گا وہی بات تو تم پوچھ رہی ہو نا!"

مشکبار نے جلدی سے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "ہاں وہی بات -- میرے ذہن میں رہی تو بہت دن تھی، پھر دھیرے دھیرے میں بھول سی گئی تھی۔ آج دوبارہ یاد آگئی۔"

بانو نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ "کمال ہے تم کو اتنی اہم خبر معلوم ہی نہیں۔ اور کیا آج تم نے رئیسہ بھابی کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں دیکھیں۔ انہوں نے زیور بھی پہن رکھا ہے اور ہار سنگھار بھی کیا ہوا ہے۔"

مشکبار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تو کیا...... سچ مچ......"

"اور کیا جھوٹ موٹ!" بانو نے آہستہ سے ہنس کر جواب دیا۔ "ان دونوں کے نکاح کو بہت دن ہو گئے ہیں۔ تم سکینہ بھابی کی حالت نہیں دیکھ رہیں۔ اسی غم میں تو کھ کر کانٹا ہو گئیں۔ وہاں گاؤں میں تو سب نے ٹی بی کا مرض بتا دیا ہے۔ پریشان ہو کر بھائی صاحب یہاں لے کر آئے ہیں۔"

"ہائے اللہ میری توبہ --" مشکبار کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "اتنی بڑی بات کا مجھے

نوں کان پتہ نہیں -- میں نے تو گھر میں کبھی یہ تذکرہ ہی نہیں سنا۔ کبھی گل بھائی جان نے بھی نہ بتایا۔"

"لو جی -- تم بھی عجب بے خبری کی بات کرتی ہو۔"

بانو نے گل کے نام پر آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "جس روز یہ نکاح ہوا ہے وہ وہیں پر موجود تھے۔"

"اف میری توبہ۔" مشکبار اب بہت حیران و پریشان تھی۔ "ممکن ہے اماں نے مجھے بتانا ضروری نہ سمجھا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ اسی لئے تو بے چاری سکینہ بھابی کا ہڈی سے چمڑا لگ گیا ہے۔ ہائے اللہ! کیسی موٹی تازی اور صحت مند تھیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھیں۔ اب تو بس فقط ڈھانچہ رہ گئیں۔ ہائے بانو! رئیسہ بھابی نے بھی منع نہیں کیا اس نکاح کو؟ نہ کرتیں تو۔"

بانو سر ہلا کر بولی۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بے چاری مانتی نہیں تھیں۔ انہوں نے صاف صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ اپنی جیٹھانی پر ظلم نہیں کریں گی اور ان کی سوت بن کر نہیں رہیں گی -- اسی ضد میں وہ اپنے میکے میں عدت کے بعد جا بیٹھیں۔ مگر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے چین نہ لینے دیا۔ ایک طرف عباس بھائی صاحب کو عاجز کرنے لگے دوسری طرف رئیسہ بھابی کے والدین کو سمجھانے لگے۔ پتہ بھی ہے تم کو اگر رئیسہ بھابی فوراً ہی نکاح کے لئے آمادہ ہو جاتیں تو بہت پہلے یہ کام ہو چکتا۔ وہ تو ان کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اتنے دن گزر گئے -- ورنہ عدت کی مدت -- نکال کر حساب لگاؤ الیاس بھائی کے انتقال کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ چنانچہ جب خاندان والوں کا اصرار دونوں طرف حد سے زیادہ بڑھ گیا اور بات بالآخر پنچایت تک جا پہنچی تو -- آج سے چار مہینے پہلے یہ نکاح ہو گیا -- بس مشکبار! وہ دن گیا اور یہ دن آیا -- سکینہ بھابی بے چاری کسی دن بھی اچھی نہ رہیں۔ دراصل انہیں عباس بھائی سے بہت محبت ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس دوسراہٹ کو ان کا ذہن قبول نہ کر سکا۔ اب تو ہر وقت ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے۔ حالانکہ بھائی صاحب بہت خیال کرتے ہیں، فاطمہ پھوپھو بھی دلجوئی میں لگی رہتی ہیں مگر ان کی روح کو لگا گھاؤ کم نہیں ہوتا۔ ہر بات میں ان کے حق کو فوقیت دی جاتی ہے۔ گھر میں اہمیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ رئیسہ بھابی بے چاری بھی کبھی کچھ نہیں کہتیں مگر معلوم ہوتا ہے سکینہ بھابی اپنے مرض کو گھٹانے کے بجائے بڑھانا چاہتی ہیں--"

بانو خاموش ہوئی تو مشکبار کے پاس کہنے سننے کو بھی نہیں رہا تھا۔ دونوں رات گئے تک یہی ذکر چھیڑے رہیں۔

پھر بانو جمائیاں لیتی ہوئی بستر پر ڈھیر ہو گئی تو مشکبار نے بھی سر تکیے پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

اگلے دن ابا میاں نے اپنے ایک اچھے ڈاکٹر دوستوں سے سکینہ بھابی کے لئے تفصیلی گفتگو کی اور پھر ان کے باہمی مشورے سے علاج کروایا۔ انہیں بھی بہو کی حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا تھا۔ مگر سوائے افسوس کے کر کیا سکتے تھے۔ یہ تو دونوں کے معاملے تھے۔

نائمہ بیگم نے ان لوگوں کے یوں اچانک چلے آنے پر ناک بھنویں نہیں چڑھائی تھیں۔ آخر کو یہ سب ان کے سسرالی عزیز تھے اور نکاح کے بعد اب پہلی مرتبہ ان کے ہاں آئے تھے۔ وہ بھی مجبوری کی حالت میں اس لئے انہوں نے اپنا رویہ ان کے ساتھ بدستور نرم اور خوشگوار رکھا۔ اور خاص مہمانوں کی خاطر تواضع کرائی۔

گل بھی سب کے آنے کی اطلاع پاکر اگلے دن ہی آگئے تھے اور اب حسب دستور ان کے ڈاکٹروں کے ہاں چکر پہ چکر لگتے۔

انہیں دیکھ کر بانو کی شوخیاں حد سے بڑھ جاتیں۔ آنکھوں میں مستی ہی مستی گھل جاتی-- ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی۔

ایک دوپہر وہ دونوں باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ گل سب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ان کی موجودگی سے بانو کھلی جارہی تھی۔ مشکبار نے اسے چھیڑنے کی نیت سے کہا۔ "سب کے نکاح بیاہ کی تو تمہیں بڑی فکر لگی رہتی ہے۔ ہر کسی کے قصے سناتی ہو۔ کبھی اپنے بارے میں بھی تو اطلاع دو کہ کب شادی ہو رہی ہے تمہاری-- اب تو گل بھائی جان کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی۔"

بانو کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ زور سے اسے چٹکی کاٹ کر بولی۔ "اچھا جی-- میں کیا اتنی خراب ہوں کہ اپنا بیاہ آپ خود رچالوں گی تم کس مرض کی دوا ہو۔ بھائی جان، بھائی جان، تو جپتی رہتی ہو اور بیاہ نہیں کر سکتیں اپنے چہیتے اور لاڈلے بھائی جان کا۔"

مشکبار زور سے ہنس پڑی۔ "ارے میرے اختیار میں ہو تو ابھی اور اسی وقت یہیں اور اسی باورچی خانے میں قاضی جی کو بلوا کر تم دونوں کا نکاح پڑھوا دوں۔"

دونوں کے حلق سے ایک ساتھ ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

بانو نے جوش مسرت میں اس کی پیٹھ دھموکے ہی دھموکے جڑ ڈالے۔ جب سے بانو آئی تھی، مشکبار بہت خوش رہتی۔ دونوں کے درمیان اکثر یہی ذکر اور گل کی باتیں ہوتی رہتیں۔ روایتی منگیتروں کی طرح بانو شرما جاتی مگر چونکہ مشکبار سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی اس لئے ہر طرح کی باتیں کر جاتی۔

پندرہ بیس دن ہوا کی مانند اڑ گئے۔

یہاں کے علاج معالجے سے یہ ہوا کہ سکینہ بھابی کی کھانسی اور ہر وقت رہنے والا ہلکا ہلکا بخار ٹوٹ گیا اور چہرے پر بحالی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

عباس کے مارے خوشی سے پاؤں زمین پر نہ لگتے۔

اتنے عرصے میں ان بے چاروں کا ایک پاؤں گاؤں میں ہوتا تھا تو دوسرا اسہارن پور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں۔ دونوں طرف کی فکر تھی ان کو۔

سکینہ کو بہتر حالت میں دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ سکینہ کو مزید بہتری کے لئے یہیں رہنے دیں اور رئیسہ و بچوں کو گاؤں واپس لے جائیں۔ کیونکہ ان دونوں کے چلے آنے سے وہاں گھر میں بھی کام کاج کے کئی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ فاطمہ پھوپھو اکیلی کیا کیا کرتیں!

ایک دن شام کے وقت جبکہ سب چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، انہوں نے یہی ذکر چھیڑ دیا۔

لیکن رئیسہ کو ساتھ گاؤں لے جانے کا سن کر سکینہ بھابی ایک دم کنٹرول سے باہر ہو گئیں۔ مارے غصے کے ان کی آنکھیں ابل پڑیں۔ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ عباس کیا کہنا چاہتے ہیں، بس دو ٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”بس ہو گیا علاج ولاج-- میں بھی یہاں رہ کر کیا کروں گی۔ میں بھی گاؤں واپس جاؤں گی۔“

نائمہ بیگم اور گل نے بھی بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک ہی رٹ لگاء رہیں۔ ان کی ”نا“، ”ہاں“ میں نہیں تبدیل ہو سکی۔ تھک ہار کر سب خاموش ہو گئے۔

بحالتِ مجبوری عباس دو دن مزید رکے۔ پھر ڈاکٹر سے اچھی طرح مشورہ کیا۔ جو جو دوائیں تجویز کی گئیں، وہ سب خریدیں، ترکیب استعمال ذہن نشین کی اور بالآخر ایک صبح سب کو لے کر گاؤں کو سدھارے۔

نائمہ بیگم کا گھر ایک دم ہی ویران اور سنسان ہو گیا۔

بانو اس دفعہ بھی جاتے وقت مشکبار سے چمٹ کر دھواں دھار روئی۔ مشکبار نے اماں سے پوچھ کر مہینوں پہلے کے کاڑھے ہوئے میز پوش اور تکئے کے غلاف بانو کو اپنی یادگار کے طور پر سونپ دیتے تھے۔

وقت سست رفتاری کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ کاروبار زندگی اسی طرح

رواں دواں رہا۔

جب سے گاؤں کے مہمان آ کر گئے تھے، نائمہ اکثر کسی الجھن میں گرفتار سی رہنے لگی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اندر ہی اندر کسی مسئلہ پر الجھتی رہتی ہیں-- کوئی الجھن، سلجھانے میں مصروف رہتیں۔

مشکبار کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ کبھی ماں کی جھڑکی سن لی۔ کبھی رولی کبھی ہنس لی۔ وقت کب رکا ہے--- بلا آواز چلتا گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
آئیڈیل پبلک لائبریری
0301-7283296
نزد گھنٹہ گھر کمالیہ ★ عظیم احمد طارق 0334-9630911

بات تو کچھ بھی نہ تھی۔

بس اسے مشکبار بے چاری کی شامت اعمال کہہ لیجیے۔

ورنہ ایسا تو اکثر و بیشتر ہوتا ہی تھا کبھی فرصت کے لمحات میں جی گھبرایا تو وہ مسجد کی طرف والے چھجے پر آکھڑی ہوئی یا ٹہلتی ہوئی دوسری طرف کے جنگلے کی طرف گئی تو وہیں تھم گئی۔

ادھر چند دنوں سے حویلی جیسے آباد ہو گئی تھی۔ وہاں اب رونق اور چہل پہل کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ لیکن اگر مشکبار ذرا سی بھی ہوشیار ہوتی تو اس امر کو بظاہر تاڑ سکتی تھی کہ حویلی کی یہ رونق دن کے بجائے رات کو نظر آتی تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ لوگ باگ اب آنگنوں میں سونے لگے تھے۔ صحن اور چھتیں آباد ہونے لگی تھیں۔ حویلی کی چھت رات کو بقعہ نور رہنے لگی تھی۔ ایسا گزشتہ چند روز سے ہی ہوا تھا۔

ادھر سانولی شام چھم سے اتری، ادھر حویلی کی چھت سولہ سنگھار کر کے بننے سنورنے لگی۔ سفید چاندنیاں یہاں سے وہاں تک بچھ جاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گھنگرو اور موسیقی کی محفل جم جاتی۔

مشکبار کو یہ نیا مشغلہ مل گیا تھا۔ وہ اکثر اماں کی نظر بچا کے رات کو کام سے فارغ ہو کر ادھر آنکلتی اور جنگلے کے سوراخوں سے آنکھ لگا کر دوسری طرف کا منظر دیکھنے کی کوشش کرتی۔

اس روز ابا میاں گاؤں گئے ہوئے تھے۔

اور آج ہی یوں لگ رہا تھا جیسے محفل شباب پر ہے۔ کوئی خاص بات تھی۔ اماں عائشہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو مشکبار جس کا شام سے دھیان ادھر ہی لگا ہوا تھا، دلشاد اور شمشاد کو نیچے لٹا کر جلدی جلدی اوپر آگئی اور دبے پاؤں جنگلے میں جا چکی۔

محویت کے عالم میں اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ حالانکہ آج دلشاد کی طبیعت سرِ شام سے اچھی نہ تھی۔ مگر اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس ساز و آواز کی محفل کو چھوڑ کر نیچے اتر جائے۔

بیچ چھت پر ایک بجلی سے کوند رہی تھی۔ گانے اور ناچنے کی محفل جوبن پر تھی اور چاندنیوں پر بیٹھے امیر زادے و نواب زادے داد پر داد دے رہے تھے، حقے اور پان چل رہے تھے۔

اس کو احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب اور کس وقت ابا میاں اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ جب وہ پوری قوت سے چنگھاڑے تو وہ کئی فٹ اچھل پڑی اور انہیں سر پر کھڑے دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگی۔

وہ سخت غصے کی حالت میں چلا کر کہہ رہے تھے۔

"---مردود---نامعقول---یہاں کیوں کھڑی ہے---دیدوں کی شرم ڈھل گئی ہے---طوائفوں کی محفلیں دیکھتی ہے---بے غیرت---بے حیا---"

انہوں نے زندگی میں پہلی بار اسے ڈانٹا تھا اور وہ بھی اتنے شدید انداز میں---اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کے غیر متوقع طور پر چلانے کی آواز سن کر اماں بی بھی باہر نکل آئیں ابامیاں کا روئے سخن ان کی طرف مڑ گیا۔

"تم اتنی لاپرواہ اور غافل ہو چکی ہو کہ تمہیں اچھے برے کی تمیز نہیں رہی...... یہ بھی نہیں معلوم اور احساس کہ گھر میں سیانی بچی موجود ہے اور...... مشتری بائی کی محفل کا نظارہ کر رہی ہے یہاں سے...... لاحول ولا قوۃ......"

مشکبار گرتی پڑتی نیچے بھاگی---

اماں نے کیا جواب دیا--کیا نہیں--اس نے نہیں سنا، وہ تو بار بار توبہ کر رہی تھی۔ اپنے پر سو سو دفعہ لعنت بھیج رہی تھی اب بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ یہ مشتری بائی کی محفل ہے......

❁

رات شاید پہلا پہر طے کر چکی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ دوسری پریشانی یہ لاحق ہو گئی تھی کہ دلشاد کو ڈھیروں بخار چڑھا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنی غفلت پر ندامت ہونے لگی۔

بچے کی کیفیت سرسامی سی ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک دھڑک جا رہا تھا۔ اب اتنی ڈانٹ ڈپٹ کھا کر اوپر کیسے جائے؟ دلشاد کی حالت سے کیسے آگاہ کرے؟

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی پریشانی اور بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دلشاد کی حالت بگڑتی جا رہی تھی سارا پنڈا توے کی طرح دہک رہا تھا۔

بالآخر اس نے سوچا نہ بتانے پر صبح مزید شامت آسکتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ جا کر پہلے دروازہ کھٹکھٹاؤں گی---پھر دلشاد کے متعلق بتا کر بھاگ آؤں گی۔ ابامیاں کے سامنے ہی نہیں پڑوں گی۔"

اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی۔

اور سہج سہج قدم رکھتی زینے چڑھ کر اوپر آگئی۔

اماں کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔

اس کی ہمت بندھ گئی۔

اماں ابا دونوں ہی باتیں کر رہے تھے۔ اماں تیز لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ وہ صاف لہجے میں کہہ رہی تھیں......"تو اس میں حرج ہی کیا ہے...... آپ غور نہیں کر رہے، بس اوپری انداز میں سوچ رہے ہیں، اس لئے غلط سمجھ رہے ہیں...... آپ سوچئے......... وہ شہر میں رہتا ہے یہیں کا رہن سہن سیکھ گیا ہے، گاؤں دیہات میں اس کی شادی سراسر ناانصافی ہو گی۔ میں آپ کو یہ زیادتی ہرگز نہ کرنے دوں گی...... پھر سب میں بڑی بات یہ کہ...... میں اسے ذاتی طور پر پسند کرتی ہوں۔ میں نے عرصہ ہوا دل ہی دل میں اسے اپنی بیٹی کے لئے منتخب کر لیا تھا...... وہ مجھے پسند ہے بس آپ کان کھول کر سن لیجئے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ مشکبار کی شادی اگر ہو گی تو صرف گل سے ہی ہو گی...... ورنہ کسی سے نہیں...... خواہ اس کے لئے آپ کو اپنے پورے کنبے سے جنگ کیوں نہ کرنی پڑے---سن لیا آپ نے---"

مشکبار کی آنکھوں کے نیچے اندھیرے پھیل گئے۔

کانوں میں سائیں سائیں بجنے لگی۔

وہ کلیجہ پکڑ کر بے اختیار فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

❁

اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو گئی۔

نہ چیخنے کی ہمت رہی نہ دیکھنے کی بصارت۔ وہ چلانا چاہتی تھی۔ اپنا احتجاج اندر تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔

اتنی رات گئے یہ تنہا اور کمزور سی لڑکی کمرے کی دہلیز سے باہر کلیجے کو تھامے بے سدھ پڑی تھی لیکن کوئی پرسان حال نہ تھا۔

اماں اور ابا میاں کو گمان تک نہ تھا کہ اس ننھی سی فاختہ پر ان کی زہریلی گفتگو سے کیا بیت گئی اور حساس دل پر کیسی گہری چوٹ پڑی ہے۔ وہ دونوں تو مسلسل اپنی باتوں میں مصروف تھے ان کے بولنے کی آواز اب تک کواڑوں کی اوٹ سے سنائی دے رہی تھی لیکن مشکبار کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں--اور--اب اسے کچھ سن کر کرنا بھی کیا تھا؟ جو کچھ سن لیا تھا، وہی پی جانا ممکن لگ رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر کہے۔

"یہ آپ لوگ کس نوعیت کی باتیں کر رہے ہیں، آپ کو نہیں معلوم، گل بھائی جان کو میں سچ مچ اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ وہ مجھے ایک بہن کی طرح چاہتے ہیں۔ لوگو! کبھی بہن بھائی کی شادی بھی ہوئی ہے! نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے اور پھر وہ تو پرائی امانت ہیں۔ ان کی نسبت ان کی خاندانی روایات کے مطابق بہت پہلے بانو کے ساتھ طے ہو چکی۔"

بانو، کا خیال آتے ہی اس کی بند آنکھوں کے سامنے بانو کا شوخ اور معصوم چہرہ پھرنے لگا۔ اس کی حسین آنکھیں، جو گل کا ذکر آتے ہی مست و بے خود ہو جاتیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کا خوبصورت پنچھی پنکھ پسارے آ بیٹھتا تھا۔

وہ یہ سب کیسے اور کیونکر برداشت کر پائے گی! ہائے میں نے یہ کیا سنا۔ کاش! میں اس وقت یہاں تک آتی ہی نہ--کم از کم یہ جان لیوا بات چیت تو سننے سے بچی رہتی۔"

معلوم نہیں کتنی دیر تک وہ اسی طرح بے حس سی پکے فرش پر بیٹھی رہی۔ رات

کے ان بے چین گھنٹوں میں اسے اپنے وجود تک سے نفرت ہو رہی تھی۔ برابر کی حویلی سے گھنگھروؤں کی چھن چھن اور پائل کی جھنکار سنائی دینی بند ہو گئی تھی ہر طرف ایک طویل و عریض خاموشی اور سکوت کی چادر تنی تھی۔ اماں اور ابا میاں شاید کسی حتمی فیصلے پر پہنچے بغیر نیند کی وادی میں اتر چکے تھے اور کمرے میں تیز روشنی کے بجائے کم پاور کا بلب جل رہا تھا۔

مشکبار نے اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے وجود کو بمشکل سمیٹا اور ڈگمگاتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کھلے کواڑوں کے پار دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر یکبارگی مشکبار کو یاد آ گیا کہ وہ تو دلشاد کے متعلق اماں کو بتانے جا رہی تھی کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مگر اتنی دیر اسے ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ وقتی طور پر وہ اپنی الجھن بھول کر لپکتی ہوئی ننھے دلشاد کے پاس پہنچی اور اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

اس کے سیاہ بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔ جانے کس وقت اسے بھرپور طور پر پسینہ آ کر بخار ہلکا ہو گیا اور سانسیں بھی اعتدال پر آ گئی تھیں۔ نیند میں اس وقت وہ بے چین اور بے قرار کے بجائے پر سکون لگ رہا تھا۔

مشکبار کے بے تحاشا دھڑکتے ہوئے دل کو جیسے قرار نصیب ہو گیا۔ اس نے سکون و اطمینان کی ایک گہری سانس کھینچی اور وہیں پلنگ پر بیٹھ کر بھائی کی پیشانی سے ننھے ننھے بالوں کے لچھے سمیٹنے لگی۔

باہر سیاہ اور بوجھل رات دھیرے دھیرے بیتے جا رہی تھی۔ لمحات دبے پاؤں آگے کا سفر طے کرتے جا رہے تھے۔ سونے والے میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔

ایک مشکبار تھی، جو چپ چاپ اپنی عجیب و غریب تقدیر پر غور کرتی سوچوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنگن میں ادھر سے ادھر بیتابی سے ٹہلتی پھر رہی تھی۔

دلشاد کے بخار کی طرف سے قدرِ اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اس کی ازلی حرماں نصیبی کو جلنے اور کڑھنے کے نئے نئے روزن نظر آ گئے تھے۔ اور وہ نئے سرے سے ماتم کناں ہو چکی تھی۔

❁

ان پریشان لمحوں میں اسے ابا میاں کی ڈانٹ پھٹکار بھی یاد نہیں تھی۔ بس رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے بانو اور گل کی صورتیں آ آ گڈ مڈ ہونے لگتیں۔

اماں کی بے حسی اور سنگدلی پر رنج بھی ہو رہا تھا۔ حیرت بھی تھی اور افسوس بھی کتنے مزے اور آسانی کے ساتھ وہ ابا میاں پر اپنے دل کا راز کھول بیٹھی تھیں۔ اور اس طرح بلا جھجک اظہار خیال کر رہی تھیں جیسے گل پر ان کا حق رہا ہو۔

مشکبار کو اس بات پر شدید تعجب تھا کہ اماں کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ بانو گل کی بچپن سے مانگ ہے ان کے خاندان کی لڑکی ہے اور یہ اہم فیصلہ ان کے بزرگوں کے سامنے ہوا تھا۔ اب بھلا اماں کی خواہش پر سب لوگ کیا سوچتے! انہیں ابا میاں سے ایسی بات کہتے ہوئے فاطمہ پھوپھو اور گھر کی دوسری عورتوں کی لاج بھی نہ آئی سب سے بڑھ کر بانو کے گھر والے اور خود بانو کا معصوم دل--وہ تو شاید یہ فیصلہ سن کر بند ہی ہو جائے۔

"اے اللہ پاک! ابا میاں کسی صورت بھی اماں کا یہ ناجائز مطالبہ پورا نہ کریں خواہ اماں کتنا ہی چلائیں غرائیں!"

مشکبار انتہائی بے کسی اور لاچاری کے عالم میں خدا کے حضور گڑگڑانے لگی--

جب ہر طرف سے امیدیں ٹوٹ جائیں اور کوئی سہارا دکھائی نہ دے تو خدا کی قابل بھروسہ ذات کے سوا کسی کا آسرا نہیں ملتا۔ وہ بھی اپنی ذہنی پریشانیوں اور کوفت سے

گھبرا کر رو رو کے اپنے رب سے فریادیں اور آہ و زاریاں کرنے لگی۔ اب اس ایک راستے کے سوا اس کے پاس بھلا چارۂ کار کونسا رہ گیا تھا! جب سگی ماں ہی دشمنی پر آمادہ ہو جائے تو پھر اس بھری پری کائنات میں کون ساتھ دیتا ہے؟

معاً لیٹے لیٹے اسے خیال آیا۔

"ارے..... کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ گل بھائی جان جن کی زندگی بھر کا سوال تھا وہ بھی اماں کی بات مان جائیں! ظاہر ہے منگنی کے بعد سے بانو کے ساتھ ان کو بھی ضرور کچھ نہ کچھ دلی تعلق اور انسیت پیدا ہو گئی ہو گی، آخر کو بانو میں برائی ہی کونسی تھی! پھر بھلا گل بھائی جان کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی سوتیلی ماں کی آرزو پر اپنی آرزوؤں کو قربان کرتے..... ظاہر ہے وہ ضرور انکار کر دیں گے بس پھر تو اماں اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گی۔"

سوچوں میں یہ خیال ابھرتے ہی مشکبار کی جھلستی اور جلتی ہوئی روح کو جیسے قرار آ گیا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور اب اس کے تھکے ماندے وجود اور دل و دماغ پر بھی سستی اور غفلت طاری ہونے لگی تھی۔

وہ جی ہی جی میں گل کے انکار کر دینے کی دعائیں مانگتی مانگتی سو گئی۔

اگلی صبح حسب معمول طلوع ہوئی۔

سب کچھ ویسے کا ویسے تھا۔ مگر مشکبار کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ جی ہول رہا تھا کہ جانے اب کیا ہو؟

وہ ڈرتے ڈرتے اوپر آئی اور سہمی سہمی سی کام میں لگ گئی۔ دل کو ہر پل یہی دھڑکا رہا کہ کہیں ابا میاں دوبارہ بلا کر ڈانٹ ڈپٹ شروع نہ کر دیں کہ رات حویلی کے آنگن میں کیوں جھانک رہی تھیں! لیکن خیریت ہی گزری۔ حتیٰ کہ وہ تیار ہو کے اپنے دفتر کے لئے بھی روانہ ہو گئے۔ خلافِ توقع نائلہ بیگم نے بھی اسے ٹوکا نہ رات والی کوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات دہرائی۔ بلکہ جب اس نے ڈرتے ڈرتے دلشاد کے بخار کا بتایا تو اسے جھڑک دینے کے بجائے ملازم بلوا کر دلشاد کی دوا لانے کی ہدایت کی۔

مشکبار نے اس خلافِ امید صورتِ حال پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

لیکن اس دن ایک حیرت انگیز تبدیلی ضرور دیکھنے میں آئی اور وہ یہ کہ نائمہ بیگم نے دوپہر کے کھانے پہ ذرا بھی اہتمام نہ کیا۔ صرف بکرے کے گوشت پالک کے سالن اور بھنوا آلوؤں تک اکتفا کر کے بیٹھ گئیں۔ یہ دونوں چیزیں بھی انہوں نے اشکبار سے پکوائیں --خود ہاتھ بھی نہ لگایا--

تقریباً ایک ہفتے تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔

ابا میاں جیسے ہی دفتر سے واپس لوٹتے، نائمہ بیگم کا منہ خود بخود پھول جاتا، کبھی عائشہ کو ڈانٹ رہی ہیں کبھی مشکبار کو کسی بات پر ٹوک دیا، یا دلشاد و شمشاد کو جھڑکنے لگیں۔

جلد ہی مشکبار کو اندازہ ہو گیا کہ اماں بی اپنے ایجاد کردہ خاص حربوں سے ابا میاں کو زچ کرنا چاہتی ہیں اور اپنی ناراضگی جتانا مقصود ہے۔

ایساں کہاں تک ہوتا!

اور ابا میاں کہاں تک برداشت کرتے۔

ایک روز جبکہ چھٹی تھی اور ابا میاں گھر پر ہی تھے، دونوں میاں بیوی میں باقاعدہ طور پر جھڑپ ہو گئی مشکبار گھبرا کر دونوں لڑکوں کو نیچے اتار لے گئی اور خود سیڑھیوں میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

کیونکہ ظاہر ہے اس جنگ کا تعلق سراسر اسی کی ذات سے تھا۔

لیکن اس پر جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ اس معاملے میں ابا میاں میں ذرا بھی دم خم نہ تھا۔ وہ محض تھوڑی دیر اماں کے تابڑ توڑ حملوں کا جواب دیتے رہے مگر پھر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بالآخر مصالحانہ انداز میں کہنے لگے۔

"نائمہ بیگم خدا گواہ ہے کہ تمہاری خواہش مجھے بہت عزیز رہتی ہے۔ یہاں بھی میرا مقصد تمہاری مخالفت کرنا ہرگز نہیں ہے تمہیں یہ بھی اچھی طرح علم ہے کہ میں ذاتی طور سے کنبہ برادری یا اپنے پرائے کی تخصیص کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ گل کا باپ ہونے کے ناتے میرے لئے بانو یا مشکبار میں کوئی فرق نہیں ہے مگر میں صرف یہ سوچ کر تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا کہ گل کا یہ رشتہ بہت سارے لوگوں کے درمیان طے پایا ہے۔ سارے گاؤں کو اس رشتے کا علم ہے اور وہ لوگ ایسے معاملوں میں بہت حساس اور اپنی روایات کے پابند ہوتے ہیں ذاتی طور پر میں ان خرافات کا قائل نہیں ہوں مگر اب تمہاری اس اچانک ضد نے میرے لئے بہت مشکل حالات پیدا کر رہے ہیں ایک طرف تمہارا دل بھی میلا نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری طرف گاؤں والوں کو خفا کرنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ خاص طور پر اپنی ہمشیرہ فاطمہ کا دل دکھانا میرے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔ کیونکہ انہوں نے یہ رشتہ بہت شوق اور چاہت کے ساتھ طے کروایا ہے لیکن بہر حال اب تمہاری مسلسل ضد کی وجہ سے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا-- نائمہ بیگم--! ذرا ادھر میرے قریب بیٹھ جاؤ اور ذرا سکون و تحمل سے میری بات سنو--- سنو! ابھی ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ کیوں نہ یہ معاملہ ہم گل کی مرضی پر چھوڑ دیں--! اب دیکھو نا۔ اگر میں ہاں کر بھی دوں تو کیا خبر گل یہ سن کر کیا کہے! آخر کو وہ ایک باشعور، تعلیم یافتہ اور عاقل و بالغ نوجوان ہے میرے خیال میں اس سے دریافت کرنا تو ضروری ہے ویسے آگے تمہاری مرضی......!"

❁

نائمہ بیگم نے اچانک ہی ان کی بات کاٹ ڈالی اور اطمینان کے لہجے میں بولیں۔

"خیر--اس بات کی فکر آپ جانے دیجئے۔ میں بھی کوئی زبردستی نہیں کئے دے رہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں۔ بات میں بات شادی کا تذکرہ چل نکلا تھا تو میں آپ پر اپنے دل کی خواہش کا اظہار کر بیٹھی تھی۔ جسے آپ نے لے کر افسانہ بنا ڈالا۔ رشتے ملنے کو کیا ہے ایک آپ کا بیٹا ہی تو نہیں ہے۔ بیسیوں درجنوں مل جائیں گے۔"

ابا میاں جلدی سے بولے۔ "بخدا میرے دل میں قطعی کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ اب شاید تم برا مان گئی ہو۔ مگر یہ تو سوچو میں نے کونسی غلط بات کہہ دی ہے، اگر تم ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر غور کرو تو یقیناً میری بات تمہیں ناگوار نہیں گزر سکتی۔ ہاں اگر گل کی نسبت نہ ٹھہر چکی ہوتی تو میں تمہارے سامنے اس کی مرضی کی پروا بھی نہ کرتا۔"

نائمہ بیگم ذرا دیر کے لئے خاموش رہ گئیں۔ شاید دل ہی دل میں اپنی کامرانی پر خوش ہو رہی تھیں۔ بالآخران کا حربہ کامیاب ہو گیا تھا۔

مشکبار اس سے زیادہ نہ سن پائی۔ نیچے کے کمرے میں دلشاد اور شمشاد نے اودھم مچا رکھا تھا وہ بھاگ کر زینے تک آ رہے تھے، "آپا۔۔ آپا۔" کا شور کر رہے تھے۔

مشکبار نے مزید رکنا بیکار سمجھا اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ کمرے میں آگئی۔

"آپ بو یکھو۔۔ بھائی جان۔۔۔ بھائی ہمیں مار رہا تھا۔" چھوٹے دلشاد نے شمشاد کی شکایت پیش کر دی۔

جواب میں شمشاد نے اس کی شرارتیں بیان کرنی شروع کر دیں مشکبار کا دماغ ویسے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں کو ایک ایک چپت لگا کر سونے کے لئے لٹا دیا اور خود بھی وہیں لیٹ رہیں۔

اتفاق سے اسی شام۔۔۔

جبکہ ابا میاں اپنے کسی دوست کے ہاں گئے ہوئے تھے، گل میاں آگئے، نائمہ بیگم انہیں دیکھتے ہی خوش ہو گئیں اور بڑی لگاوٹ سے پوچھنے لگیں۔

"اوہو آج کدھر بھول پڑے۔۔۔ اسی شہرت میں رہتے ہوئے مصروف تو یوں

رہتے ہو جیسے باپ کے گھر آنا بھی معیوب ہو!"

"استغفر اللہ۔" گل کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب سے پریکٹس شروع کی ہے مصروفیت کی وجہ سے ہفتے عشرے میں آنے لگا ہوں ورنہ پہلے تو قریب قریب ہر شام حاضر ہو جایا کرتا تھا ادھر چند روز سے ایک کیس نے برابر الجھائے رکھا۔"

مشکبار نے یہ ساری گفتگو سل پر مسالہ پیستے ہوئے سنی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا وہی گل جنہیں وہ بڑی سادگی اور صفائی سے "بھائی جان" کہا کرتی تھی، اس وقت اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس میں یہ تبدیلی ماں کی گفتگو نے پیدا کر دی تھی۔

سل دھو کر وہ جلدی سے باورچی خانے میں گھس گئی اور کان لگا کر ماں بیٹے کی باتیں سننے لگی۔

آج کل اس کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ جہاں گھر میں طویل قسم کی گفتگو شروع ہوتی اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور دل میں سو طرح کے اندیشے رینگنے لگتے۔

اس وقت بھی وہ پوری توجہ کے ساتھ باہر کی گفت و شنید سننا چاہ رہی تھی۔ مگر مشکبار کے کام کی کوئی ایک بات بھی نہ تھی۔ گل نے ایک بار اسے پکار کر پینے کے لئے پانی بھی منگوالیا۔ قریب گئی تو باقاعدہ اس کی خیر خیریت بھی دریافت کی۔

خاصی دیر کے بعد جب وہ شام کی چائے تیار کر کے باہر پہنچا چکی تھی اور اب جلدی جلدی چپاتیاں توے پر ڈال رہی تھی تو اسے نائمہ بیگم کی آواز سنائی دی جو بڑے سرسری انداز میں گل سے پوچھ رہی تھیں۔

"تمہاری پریکٹس تو اب خوب اچھی چلنے لگی ہو گی گل!"

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ مگر کچھ خاص نہیں۔" گل نے لگی لپٹی کے بغیر جواب دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میں نے کونسا باقاعدہ طور پر اپنی ذاتی پریکٹس شروع کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ اس لئے نفع نقصان کا مسئلہ بھی نہیں ہے بس ایک مشہور ایڈووکیٹ کی نگرانی میں مقدمے کر رہا ہوں کیونکہ وکالت کا قاعدہ بھی یہی ہے۔ جب انشاءاللہ خوب اچھی طرح چل نکلوں گا تو اپنی پریکٹس علیحدہ سے شروع کروں گا۔"

"اوہو...... تو یہ بات ہے۔" نائمہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے زور سے کہا۔ "لیکن گل بیٹے! جب تم الگ سے پریکٹس شروع کرو گے تو تمہیں اپنی دوکان جمانے کے لئے کافی روپے کوڑی کی بھی ضرورت ہوگی۔ تب کیا کرو گے!"

"لیجئے صاحب! یہ بھی کوئی بات ہوئی!" گل نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "آپ بہت بھولی ہیں امی جان! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اب تک میری تعلیم کے اخراجات کیسے اٹھ رہے تھے! ظاہر ہے اسی طرح مجھے مزید عملی ترقی کے لئے بھی روپیہ فراہم کیا جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ ابا میاں نے کبھی میرے تعلیمی اخراجات نہیں اٹھائے اور نہ ایک محدود سی تنخواہ میں ان کے پاس گنجائش بچتی ہے۔ آخر ان کے اپنے ذاتی اخراجات بھی تو ہیں لہٰذا میں ہمیشہ اپنے اخراجات بڑے بھائی صاحب سے لیتا رہا ہوں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کبھی کسی طرح کی تنگی ترشی نہیں دیکھی۔ اب بھی انہوں نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جیسے ہی تم کو یہ ایڈووکیٹ علیحدہ پریکٹس کی اجازت دے دے تم فوراً جتنی رقم درکار ہو-- مجھ سے لے سکتے ہو۔ اب بتائیے مجھے کیوں فکر و تردد ہونے لگا! بلکہ میں تو آج کل کسی بہترین محل وقوع والی دکان کی تلاش میں ہوں۔

نائمہ بیگم نے جی ہی جی میں مطمئن ہو کر سر ہلایا اور بولیں۔ "اے ہاں-- میں بھی بعض دفعہ سٹھیا جاتی ہوں۔ کونسی بے فضول بات پوچھ بیٹھی۔ سچ تو ہے کہ آخر وہ زمین جائداد کس کی ہے! تم بھائیوں کی ہی تو ہے آخر آمدنی تم لوگوں کے کام نہ آئے گی تو کہاں جائے گی!

گل ہنس کر چپ ہو گئے اور پاس کھڑی عاشی کو گدگدانے لگے۔

اچانک نائمہ بیگم کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ چونک کر پوچھنے لگیں۔ "ارے ہاں گل! تمہاری شادی کب ہے۔ میں نے تو اس چاند میں سن رکھا تھا۔"

شادی کے تذکرے پر ان کے کانوں کی لویں جل اٹھیں۔ دھیرے سے جواب دیا۔

"معلوم نہیں...... مجھے کچھ خبر نہیں۔"

❀

"لے لو نوشہ میاں کو ہی نہیں معلوم۔" انہوں نے زوردار ٹھٹھا مار کر کہا۔ "پچھلے دنوں جب سکینہ یہاں علاج کروانے آئی تھیں میں نے اس وقت یہ تذکرہ سنا تھا اور اس لڑکی بانو کو بھی تبھی غور سے دیکھا تھا۔" پھر بڑی دیدہ دلیری اور صفائی سے کہنے لگیں۔ "ایک بات ہے گل! خواہ تمہیں برا معلوم ہو۔ مگر وہ لڑکی مجھے تمہاری ہم پلہ نہیں لگی-- تم میں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

"باورچی خانے میں بیٹھی مشکبار کا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔

ہائے اللہ! اماں ایسی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئی ہیں---! محض اپنی مطلب برآری کے لئے۔ اللہ میری توبہ--" وہ جی ہی جی میں خودغرض ماں کو ملامت کرنے لگی۔

باہر گل، نائمہ بیگم کی اتنی بڑی بات پر حیرت انگیز طور پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ نہ صرف انہیں یہ بات بری نہیں معلوم ہوئی بلکہ وہ نائمہ بیگم کے ہم خیال بھی ہیں وہ بھی اپنے ٹائپ کی ایک جہاندیدہ انسان تھیں۔ ایک سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں سمجھ گئیں کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ گل کا خود بھی گاؤں میں شادی کا عندیہ نہیں ہے بس یہ سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ ہو گا مارے باندھے ہو گا۔

نائمہ بیگم کے لئے اسی قدر اندازہ کافی ثابت ہوا۔ حالانکہ یہ اتنی بڑی بات انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر مگر جھجکتے ہوئے کی تھی، مگر اس کو کیا کیا جاتا کہ اندھیرے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیر فٹ بیٹھ گیا تھا۔

پھر وہ کافی دیر تک گل سے اسی موضوع پر گفتگو کرتی رہیں۔ اور بڑی کامیابی کے ساتھ ان کو شیشے میں اتارتی رہیں۔ حیرت انگیز طور پر گل بھی آج تقریباً کھل ہی بیٹھے تھے اور دبے دبے لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر گئے تھے۔

نائمہ بیگم کے مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ چلا چلا کر ساری دنیا کو اپنی کامیابی اور بے پایاں خوشی کی خبر سناتیں ایک کانٹا جو عباس کے انتقال کے وقت وہاں چند عورتوں کی طعن آمیز باتیں سن کر ان کے سینے میں گڑ گیا تھا آج گل کا عندیہ لینے کے بعد خود بخود جیسے کھل گیا تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں سکھ کا گہرا سانس لے کر سوچا تھا۔

'اب ہو گا میرا انتقام پورا---اس دین کیسا ہنس ہنس کر میرا مذاق اڑا رہی تھیں اور کیا غلیظ باتیں کر رہی تھیں--میں نے تو اسی روز اپنے دل میں قسم کھالی تھی کہ اگر گل میاں کو بھی تم لوگوں سے نہ چھڑا لیا تو میں اپنے باپ سے پیدا نہیں---'

اور جب رات کا کھانا باپ کے ساتھ کھانے کے بعد گل ہنستے مسکراتے چلے گئے اور مشکبار دل پر منوں بوجھ لئے دونوں بھائیوں کے ساتھ سونے کے لئے نیچے کی منزل پر اتر آئی تو نائمہ بیگم نے ایک بے ساختہ قسم کا قہقہہ لگا کر ابا میاں کو گل کی بانو کے لئے ناپسندیدگی کا قصہ خوب بڑھا چڑھا کر اور نمک مرچ لگا لگا کر بیان کرنا شروع کر دیا۔

وہ خاموشی سے سنتے رہے بیٹھے۔

نہ ڈھولک بجی، نہ سکھیاں سہیلیاں اکٹھی ہوئیں، نہ سہاگ گیت گائے گئے، نہ دھوم دھڑ کا ہوا۔

ہاں---بس مشکبار اور گل کا نکاح ہو گیا۔

دونوں انتہائی سادگی اور خاموشی کے ساتھ ---رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ اور وہ سادہ لوح اور کم نصیب لڑکی جو آج سے قبل گل کو بھائی جان کہہ کر پکارا کرتی تھی، اس موقع پر رو رو ہلکان ہوئی۔ اس کے اختیار میں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا سوائے اشکوں کی برسات بہانے کے۔

روتے روتے وہ نڈھال ہو گئی۔ آنکھیں اس حد تک متورم ہو گئیں کہ کھلنا محال اور ان بند آنکھوں میں رہ رہ کر بانو کا سراپا گھوم جاتا---فاطمہ پھوپھو، رئیسہ اور سکینہ بھابی کی شکلیں اور آ آ کر گڈمڈ ہونے لگیں۔ یہ سب تصور کر کے وہ اور بھی زیادہ بلک بلک کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس نے تو دانستہ کبھی کسی بے زبان جانور تک کا دل نہ دکھایا تھا کجا وہ آج انسانی دل توڑنے کے گناہ کی مرتکب ہو چکی تھی اور وہ بھی اپنی ہی اتنی عزیز اور پر خلوص سہیلی کا!

نکاح کے وقت اس کا دل اندر سے پکار پکار کر "نہیں...... نہیں۔" کہہ رہا تھا۔ مگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہائے رے مشرقی لڑکی کی مجبوریاں!

دوسری طرف نائمہ بیگم کی کہنی اس کا پہلو چھیلے دے رہیہ تھی۔ جو خبر نہیں کس مصلحت کے تحت نکاح کے وقت اس کے کمر...... کے ساتھ لگ کر بیٹھ رہی تھیں۔

اور یوں اس کا نکاح ہو گیا۔

نہ بارات سجی۔ نہ باجا بجا۔ نہ لمبے چوڑے کھانے دانے ہوئے۔

آخری مرحلے اس کے دل کا سارا دکھ درد، رنج و غم اور روح کی دکھن ایک شدید قسم کے غصے میں تبدیل ہو گئی اور اس غم و غصے کا بہاؤ گل کی طرف ہو گیا۔ جنہوں نے نائمہ بیگم کے منصوبے پر بے چون وچرا سر جھکا دیا تھا۔ ایسی انہونی ہوئی تھی کہ سرخ ساٹن کے معمولی سے جوڑے اور شیفون کے کناری والے دوپٹے میں ملبوس ہونے کے باوجود اسے بار بار خیال آتا تھا کہ ممکن ہے یہ سب ایک طویل اور بھیانک خواب کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ آنکھ کھلے تو کچھ بھی نہ ہو!

'اے کاش! ایسا ہی ہو......'

اس نے دکھے دل کے ساتھ ایک ٹھنڈا سانس کھینچا۔

کچھ بھی تو اہتمام نہ ہوا تھا اس بیاہ پر--- نہ جہیز کا معلوم تھا نہ بری برات کا۔ دونوں طرف سے مشترکہ طور پر ابا میاں نے چار جوڑے کپڑے چڑھائے تھے۔ زیور کے نام پر ناک کی کیل اور ایک انگوٹھی تھی۔ اور اسے دلہن بنا دیا گیا تھا۔

اندھیر تھا اندھیر۔

ان سے زیادہ بہترین اور اعلیٰ جوڑے و زیورات بذات خود نائمہ بیگم کو چڑھے تھے اور مدتوں ان کے ہاتھوں کی مہندی نہیں چھوٹی تھی۔ دنوں ایسے چاؤ چونچلے ہوئے تھے کہ کیا نئی نویلی کنواری بیاہ کر جانے والی دلہنوں کے اٹھائے جاتے ہوں گے! مگر بیٹی کی تقدیر ایسی پھوٹی تھی کہ کہیں مثال ملنی مشکل تھی۔ اول تو نائمہ بیگم نے اتنی ذرا سی عمر

میں بیاہ ڈالی تھی اور دوسرے اپنی ہی پوری سسرال کی مخالفت مول لے کر ایک طرح سے زبردستی بیٹی دے دی تھی۔ گاؤں میں جیسا تہلکہ نہ مچتا، کم تھا۔

مشکبار سے جتنے بھی آنسو بہائے گئے۔ اس نے بہا ڈالے، جی بھر کے اپنی کم مائیگی اور بدقسمتی کا ماتم کیا۔ لیکن نائمہ بیگم کا کٹر دل نہ پسیجا۔ نکاح کی رسم ادا ہوتے ہی انہوں نے رسمی ہی انداز میں اسے ایک بار گلے لے لگا کر زبردستی ایک دو آنسو بہانے کی کوشش کرتے ہوئے چند آہیں بھریں اور خراماں خراماں چلتی ہوئی آ کر باہر اپنی ان چند سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئیں جنہیں اس نکاح کی تقریب میں انہوں نے شامل کرنا ضروری سمجھا تھا۔

یہ عورتیں یہیں آس پاس کے رہنے والی تھیں۔ جن میں کئی ایک ابا میاں کے محلے والوں کی بیویاں تھیں اور...... کئی عملے والوں کی بیویاں تھیں جو نائمہ بیگم کی خوشنودی اور جی حضوری ضروری خیال کرتی ہوئی اکثر وقتاً فوقتاً حاضری دیتی رہا کرتی تھیں۔

ان چند احباب کے لئے رات کا کھانا، جسے دعوتِ ولیمہ بھی سمجھا گیا اور لڑکی والوں کی طرف سے رخصتی کا کھانا بھی، بریانی، قورمہ اور تندوری روٹی پر مشتمل تھا۔

ایک مہمان بی بی کو سارے دن کی تاریک کونے میں دبکی سہمی مشکبار پر بھی ترس آ گیا۔ ایک ٹرے میں کھانا سجا کر وہ اس کے سامنے رکھ گئیں۔

مشکبار کا جی جل کر خاک ہو گیا۔ مگر وہ ان بی بی کی رحم دلی کو قہر آلود نگاہوں سے گھور کر رہ گئی۔ حالانکہ ان بے چاری کا کا قصور تھا---!

آج ہنگامی حالات کی وجہ سے اس نے صبح سے دلشاد اور شمشاد کی خبر نہ لی تھی۔ اس وقت دونوں کو بلا کر اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔ چھوٹا دلشاد اس کے لال لال کپڑے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

کھانے دانے اور خوش گپیوں میں خاصا وقت گزر گیا۔ نائمہ بیگم سارے وقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔ آج گاؤں والوں کو نیچا دکھلا کر ان کا رواں رواں باغ باغ ہو گیا۔ ابا میاں قدرے خاموش خاموش سے تھے۔

تمام دن میں کئی مرتبہ انہیں اپنے عزیز رشتہ داروں کا خیال آیا تھا جن کو سرے سے اس اندوہناک خبر کی اطلاع ہی نہ تھی۔ مگر ابا میاں خوب آگاہ تھے کہ تا بکے---! ایک نہ ایک روز تو ظاہر ہے کہ ان کو پتہ ہی چلتا، پھر کیا ہوگا! یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان کئی مرتبہ ان کی نگاہوں کے سامنے لہرایا ضرور، مگر انہیں ایسی کچھ زیادہ پروانہ تھی۔ اپنی بیوی کے لئے ان کا دل بہت وسیع اور کشادہ تھا وہ دانستہ ان کا کہنا کس طرح نہ مان سکتے تھے۔

رات کے کوئی دس ساڑھے دس بجے کے قریب دو مہمان بی بیاں ہنستی مسکراتی اٹھیں اور مشکبار کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسری سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی، اسے نچلی منزل پر اسی کے مخصوص کمرے میں پلنگ پر بٹھا گئیں۔ جس پر آج نئی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کا گھونگھٹ درست کر کے دونوں دوبارہ اوپر چلی گئیں۔

تھوڑی دیر میں یہ چند مہمان بھی رخصت ہو گئے اور پوری عمارت پر ایک گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔

آج کی رات۔

نائمہ بیگم نے دلشاد اور شمشاد کو اوپر ہی روک لیا تھا۔ مصلحتاً نیچے کی منزل خالی رکھی تھیں اور وہ کمرہ جس میں یہ تینوں بہن بھائی سوتے تھے۔ آج فقط مشکبار کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ گویا یہی کمرہ اس کے میکے کی پناہ گاہ رہا تھا۔ یہی آج سسرال بنا دیا گیا تھا۔ اور یہی کمرہ آج حجلہ عروسی کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

پلنگ پر سرخ گٹھری کی صورت بیٹھی مشکبار کو دیکھ کر یہ احساس تو جاگتا تھا کہ یہ ایک دلہن کا کمرہ ہے مگر حجلہ عروسی تو کسی طرف سے نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہی روزمرہ کا سامان اور بکھری سمٹی چیزوں کے ڈھیر۔ فالتو چیزیں ویسے بھی اسی کمرے کا مسکن رہتی تھیں کیونکہ نچلی منزل پر یہ واحد ایک ہی کمرہ تھا۔ ہال نما بڑا سا طویل و عریض کمرہ، جس میں بچوں کے علاوہ نائمہ بیگم راشن، اجناس اور دیگر فالتو اشیا رکھواتی تھیں۔ پورے کمرے میں نہ کہیں سجاوٹ کا اہتمام تھا۔ نہ ہار پھول گجروں، سہروں یا زرتار لڑیوں کا۔ کمرہ مہک رہا تھا نہ خوابناک ماحول کی فسوں کاری تھی۔ بیلے کی کلیاں تھیں نہ کاغذی پھول۔ ہاں۔ یہ ضرور تھا کہ مشکبار ذرا ذرا دیر بعد پسینے میں نہا نہا جا رہی تھی۔

کافی رات گئے گل میاں کچھ جھجکتے، کچھ شرماتے کمرے میں داخل ہوئے۔

مشکبار کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ جی چاہا کمرے میں پڑی ہر چیز اٹھا اٹھا کر ان کے منہ پر دے مارے۔

لیکن سوچ لینا آسان تھا--- عمل انتہائی مشکل۔

گل دھیرے دھیرے چلتے ہوئے دوسری چارپائی پر، جس پہ دلشاد اور شمشاد سوتے تھے، آہستگی سے بیٹھ گئے، چارپائی ذرا سی دیر کو چرمرائی، اور پھر ہر آواز سکون و سکوت کی آغوش میں سو گئی۔

اب پھر ماحول پہلے کی طرح خاموش ہو چکا تھا۔

دونوں اپنے اپنے مقام پر جانے کیا کیا سوچ رہے تھے---!

گو کہ مشکبار دلہن بنی بیٹھی تھی مگر اس کے انداز تو دلہنوں والے ہرگز نہ تھے۔ نہ شرما رہی تھی نہ لجا رہی تھی۔ ایک گھبراہٹ سی ضرور طاری تھی وہ بار بار اسی دوپٹے سے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کا گھونگھٹ خود بخود اوپر اٹھ گیا تھا۔ اور یہی بات گل کے لئے الجھن کا باعث تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نئی نویلی دلہن کے تیور انہیں خاصے جارحانہ لگ رہے تھے۔

یہ ان کی توقع اور امیدوں کے قطعی خلاف تھا۔ مشکبار جیسی کم گو اور سہمی سہمی سی رہنے والی لڑکی نے اس وقت حیرت، تعجب اور الجھن میں مبتلا کر ڈالا تھا ان کو۔۔۔ وہ تو دل میں جانے کیسے کیسے ارمان اور امنگیں لے کر اندر آئے تھے۔۔۔

اس وقت کالی گرم شیروانی اور علی گڑھی سفید پاجامے میں ان کی جامہ زیب اور مکمل شخصیت خوب نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سچ مچ کے نوشہ میاں لگ رہے تھے خوبصورت آنکھوں میں ہزاروں ان کہی کہانیوں کے سائے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ چہرے پر حد درجہ جاذبیت، نکھار، سنجیدگی اور بردباری تھی۔

لیکن مشکبار کے خلاف امید کڑے اور انوکھے تیور دیکھ کر ان کی اپنی فطری جھینپ اور جھجک حیرت اور تشویش میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک مشکبار کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اتنے دنوں کی سوچ اور کڑھن الفاظ میں ڈھل کر ایک مضحکہ خیز جملہ بن گئی اور وہ بغیر سوچے سمجھے وقت اور حالات کا لحاظ کئے بغیر بولتی چلی گئی۔

"بھائی جان...... گل بھائی جان...... یہ آپ نے کیا کر ڈالا؟ اماں کی بات کیوں مان کر دی آپ نے۔ اللہ! کتنے کٹر ہیں آپ ﷺ آپ کو...... بانو کا بھی خیال نہیں آیا!!!"

گل جو چپ چاپ بیٹھے کچھ سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھے، اس کے خلاف توقع بات سن کر اچھل پڑے۔

خاص طور پر اس اہم ترین رات میں اس کے منہ سے نکلے لفظ "بھائی جان" نے تو قیامت ڈھا دی۔

نتیجے میں وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اس کی صورت تکنے لگے۔

مشکبار ان کی معصومیت کے اس اظہار پر مزید جل بھن کر کباب ہو گئی۔ جھلاہٹ

میں وہ پلنگ کے سرہانے کھسک کر پٹی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور چمک کر بولی "آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔ کیا اماں کی طرح آپ نے بھی مجھے پاگل اور سڑی سمجھ لیا ہے؟ اب میں ایسی بے وقوف بھی نہیں۔"

گل ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔۔۔

وہ بڑی حد تک اس کے رویے اور غم وغصے کا سبب جان چکے تھے۔ حالانکہ آج سے قبل وہ کبھی ان کے سامنے ایسی بدلحاظ نہیں ہوئی تھی۔

مشکبار کی بے صبری دیدنی تھی۔

اس دفعہ لہجہ اور تیور قدرے ہی کڑوے اور ضدی تھے۔

"سنئے بھائی جان! میں آپ کو صاف صاف بتائے دے رہی ہوں کہ میں آپ کی...... میں آپ کی بیوی بن کر...... ہرگز نہیں رہ سکتی...... یہ سراسر اماں کی زیادتی ہے اور انہوں نے آپ کو بھی بہکایا ہے۔ مگر میں یہ سب خرافات بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو ہر صورت سے بانو سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ وہ اماں کی ضد تھی تو یہ...... میری ضد ہے۔ اگر...... آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں آپ کو "بھائی جاان" بھی کہنا چھوڑ دوں گی اور...... گردن میں پھندا باندھ کر...... مر جاؤں گی۔"

اس نے گویا اپنی دانست میں بہت زبردست قسم کی دھمکی دے ڈالی۔

گل کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

ہنستے ہنستے ان کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ آنکھوں میں ڈھیروں پانی بھر آیا۔

گویا یہ ان کی سہاگ رات تھی! جس کے بارے میں دنیا جہان میں سینکڑوں داستانیں اور پچاسوں رومینٹک قصے دہرائے جاتے ہیں اور ان کی نکاحی بیوی بے خیالی میں انہیں "بھائی جان" بھائی جان، کہہ کر پکارے جا رہی تھی۔

لیکن اب ان کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بمشکل اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہنسی ضبط کی اور مسکراتے ہوئے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ بولے۔ "بھئی مجھے تو بڑی خوشی ہوگی اگر تم مجھے "بھائی جان" کہنا چھوڑ دو گی۔ اور یوں بھی یہ الفاظ کہتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ سمجھیں!!"

"کیوں...... شرم کیوں آنی چاہئے؟ میں نے کوئی پہلی دفعہ کہا ہے۔" وہ لڑنے والے انداز میں اور بھی زیادہ شور مچا کر بولی۔ "شروع شروع میں اماں نے ہم تینوں بہن بھائی کو سکھایا تھا کہ تم لوگ چھوٹے ہو۔ اس لئے ان کو خالی گل، نہیں، بلکہ "گل بھائی جاان" کہہ کر بلایا کرو۔ بڑوں کو نام سے پکارنا بد تمیزی کی علامت ہوتی ہے اور اب آپ......" اچانک اس کی بے تحاشا چلتی زبان میں بریک لگ گئے اور وہ دوپٹے کا آنچل دانتوں میں داب کر کچھ سوچنے لگی چہرے کے تاثرات میں سنجیدگی سی رچ گئی تھی۔

گل فوراً ہی بوجھ گئے تھے کہ وہ کس سوچ میں پڑ گئی ہے۔ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ "تمہارا کہنا بالکل درست ہے مشکبار! مگر...... اس وقت شاید تم یہ بھول رہی ہو کہ...... اللہ کے حکم سے آج سے ہمارے رشتے تبدیل ہو چکے ہیں اس میں میرا تمہارا کوئی قصور نہیں جو قدرت نے بہتر سمجھا وہ کیا ہے۔"

"اونہہ۔" وہ تنک کر بولی۔ "یہ سب کا سب اماں کا کیا دھرا ہے انہوں نے جو سوچا تھا وہ کر دکھایا اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں سب سے زیادہ آپ کا ہاتھ ہے۔ اگر آپ چاہتے تو ایسا ظلم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ پہلے پہل بے چارے ابا میاں بھی بانو کے خیال سے انکار کر رہے تھے۔ مگر اماں نے ان کی ایک نہ چلنے دی معلوم نہیں انہیں بانو بے چاری سے کیا دشمنی تھی۔"

"ارے جانے دو اب اس ذکر کو!" گل ایک ہی طرح کی باتیں سنتے سنتے ایک دم بیزار ہو گئے۔

"کیسے اور کیوں کر جانے دوں اس ذکر کو!"

جانے کیوں مشکبار کی آنکھیں خود بخود بھر آئیں۔ اور وہ تھوڑی دیر پہلے کی ساری چوکڑی اور غصہ بھلا کر رنجیدہ اور درد بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ "آپ خود ہی سوچئے، کتنی خراب اور معیوب بات ہے یہ! جو کوئی بھی سنے گا توبہ توبہ کرے گا۔ کیا یہ باعث شرم بات نہیں ہے! میں تو کس شوق اور سچے دل سے آپ کو "بھائی جان" کہتی رہی بھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مجھ پر جان بوجھ کر ایسا بے جا ستم توڑا جائے گا! اور پھر...... وہ بانو بے چاری...... اسے تو میں منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہی۔" اس کی آواز خود بخود گھٹ گئی اور باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

گل کو اس کی بھولی باتوں پر ہنسی بھی آئی اور رونے پر افسوس بھی ہوا۔ مگر وہ اپنے لہجے کو مزاحیہ بنا کر کہنے لگے۔ "اب بھئی مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ تم مجھے سچا دل سے بھائی جان کہتی ہو یا جھوٹے دل سے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں کچھ نہ کچھ فتور ضرور تھا---!"

"کیا کہا؟ فتور! اور وہ بھی میری نیت میں!" وہ اچھل کر بولی "آپ کو ذرا سا بھی لحاظ نہیں آ رہا۔ ایسی بے سروپا بات کہتے ہوئے! آپ بھلا کیا جانیں میری نیت! بدنیت تو اصل میں خود تھے اسی لئے تو فوراً ہاں میں ہاں ملانے بیٹھ گئے تھے۔ پل بھر میں اپنے گاؤں والوں کی ساری رشتہ داریاں بھول گئے۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ بانو بے چاری سے بچپنے کی منگنی تھی اور اس کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوں گے۔ اس نے آپ کے سوا بھی کسی دوسرے کے لئے سوچا تک نہ تھا۔ اسے تو جب یہ خبر ملے گی تو وہ مارے غم کے مر جائے گی......"

گل نے اس کی بات کاٹ دی اور نہایت متانت سے بولے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ وہ ہماری رشتے دار ہے اور ہم بہتر طور پر جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے رشتوں کی ہرگز کمی نہیں ہے۔

تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ جب اماں نے بذات خود مجھ سے بات کی، اپنی مرضی ظاہر کی اور بہت ساری باتیں کیں تو بھلا میں کیوں عذر کرتا! آج چونکہ موقع محل بھی ہے اور تم خود یہ باتیں کرید رہی ہو تو میں سچ سچ بتائے دیتا ہوں کہ حقیقت میں میری مرضی گاؤں میں شادی کرنے کی کبھی رہی نہ تھی۔ تم سے ملاقات تو بعد میں ہے۔ میں اکثر جب بھی تنہائی میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا تھا تو میرا اگھٹن اور بیزاری سے برا حال ہو جاتا۔ دراصل گاؤں اور وہاں کا رہن سہن میں کبھی بھی پسند نہیں کر سکا۔ یہ فقط میرے بزرگوں کا فیصلہ تھا اور خوشی کہ میں وہاں شادی کروں اور چونکہ اس وقت تک میرے سامنے کوئی واضح اور صاف راستہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی اور یہ سوچ کر صبر و تحمل سے کام لیتا رہا کہ میری قسمت میں یہی کچھ ہوگا۔ اور آخر کہیں تو شادی ہونا ہی تھی چنانچہ اگر اپنی کوئی واضح پسند نہیں ہے تو چلو والدین اور بزرگوں کی خوشی سہی--

آج میں تم سے قطعی طور پر سچ سچ بیان کر رہا ہوں مشکبار کہ مجھے اس رات کے تقدس کی قسم! تمہیں دیکھ کر بھی بلکہ آج سے ایک ڈیڑھ ہفتہ قبل تک میں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ میری شادی اگر ہو تو تمہارے ساتھ ہو۔ تمہیں دیکھ کر میری نیت کبھی ڈانواڈول نہیں ہوئی۔ ہاں! ایک بات ضرور ہے کہ اماں کا تمہارے ساتھ سخت رویہ دیکھ کر میں ضرور کڑھا کرتا اور قدرتی طور سے -- تمہارے ساتھ دلی ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ مجھے تم پر بے طرح ترس اور رحم آیا کرتا تھا۔ بسا اوقات میرا جی چاہتا کہ تمہارے مظلوم وجود کو دنیا کی بے رحمی اور کٹر دلی سے چھپا کر کہیں دور لے جاؤں اور ہر ممکن طریقے سے تمہاری حفاظت اور غمگساری کروں تمہیں پھولوں اور کلیوں

کی طرح اچھوتا رکھوں۔ اور یہ صرف میرا جذبہ انسانیت اور ہمدردی ہوتا تھا۔ اس میں خراب نیتی کو قطعی دخل نہ ہوتا۔

لیکن...... جب اماں نے مجھ سے تمہارے بارے میں صاف صاف میرا عندیہ معلوم کیا اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا تو...... خدا کی قسم! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تم میرے لئے ایک عظیم ترین انعام ہو...... تحفہ ہو...... میری کسی خاص نیکی کا صلہ ہو۔ مجھے یوں لگا مشکبار! گویا میں ازل سے تمہاری ہی تلاش میں تھا اور تمہاری چاہت میری نس نس میں خوشبو بن کر دوڑنے رینگنے لگی۔ چنانچہ میں نے کفرانِ نعمت کی چنداں ضرورت نہ جانی اور صدق دل سے اماں کو ہاں کہہ دی۔

جہاں تک تعلق ہے بانو کا -- تو شادی کے بعد نباہ تو یقیناً اس کے ساتھ بھی کرتا مگر --- اس دلی پسند اور دلی خوشی کے ساتھ نہیں، جو مجھے تمہارا ساتھ پاکر ہو رہی ہے۔ یہ ایک روحانی مسرت اور...... بے پایاں خزانہ ہے مشکبار! جس کا کوئی مول نہیں کوئی تول نہیں۔ یہ تو دلوں اور روحوں کے سنجوگ ہیں میں سمجھتا ہوں قدرت نے تمہاری صورت میں مجھے ایک نعمت عظمیٰ بخش دی ہے حالانکہ میں ایک بے مایہ شخص اس عظیم انعام کا مستحق بھی نہ تھا۔

میں تمہارا دکھ درد سمجھ رہا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ میں بانو کا دشمن ہوں۔ یا اسے غلط سمجھ کر نظرانداز کر رہا ہوں۔ نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں نے یہ سوچا کہ تم ایک یتیم بچی ہو، تمہارا سہارا دنیا میں شوہر کے سوا کون ہوگا۔ جبکہ بانو کا سگے خون اور رشتہ داروں سے کنبے کا کنبہ پڑا ہے۔ اس کے لئے ایک سے ایک بہترین رشتہ مل جائے گا۔ جبکہ تمہارا مسئلہ یہ تھا کہ جب اماں اس کمسنی میں تمہاری جان کی لاگو ہو ہی چکی تھیں تو میرے بجائے بھی جانے کس سے تمہارا مستقبل وابستہ کر سکتی تھیں۔

میرے لئے ایک۔ طرف اماں کی رضامندی ایک خوش آئند مستقبل کی نشاندہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر رہی تھی تو دوسری جانب انہوں نے مجھے یہ دل خوش کن اطلاع بھی فراہم کر ڈالی تھی کہ ابا میاں بھی دلی طور پر اس نئے ناتے کو پسند کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ اگر گل بذات خود بھی اس شادی کے حق میں ہے تو میں مخالفت ہرگز نہیں کروں گا۔ بلکہ مجھے دلی مسرت ہوگی۔

اب تم بآسانی اندازہ لگا سکتی ہو مشکبار کہ جوشِ مسرت اور اپنی خوش بختی پر مجھے کس قدر بے اندازہ خوشی ہوئی ہوگی!

لہٰذا میں نے بھی اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے خدا کے بعد اپنے سارے معاملات اماں اور ابا میاں کے سپرد کر ڈالے---اور یوں بلا کھٹکے ہمارے نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ ظاہر ہے جب ابا میاں کو اپنے کنبے برادری اور بچپن کے رشتے کے ٹوٹنے کا خیال رہا اور نہ قلق ہوا تو مجھے کیوں ہوتا سچ پوچھو تو میرے لئے گویا بس یوں سمجھ لو کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا---"

اتنا سب کچھ کہہ کر گل خاموش ہوگئے۔

یہ سب باتیں انہوں نے بہت سنجیدگی، متانت اور ایک جذب کے عالم میں کہی تھیں۔ مشکبار جو پٹی سے پیر لٹکائے بیٹھی نہایت غور اور خاموشی کے ساتھ ان کی یہ طویل و عریض گفتگو سن رہی تھی، ان لمحات میں بہت تعجب اور حیرت کے شدید عالم میں چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

گل کی سچی، سیدھی اور کھری باتیں سن کر اس کے سیدھے سادے دل میں ان کے لئے خود بخود ایک نرم اور گداز گوشہ وا ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر اتنا سب کچھ کہہ ڈالنے کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے گل ابھی کچھ مزید کہنے

کے لئے بے چین ہیں ان کی بے تابی اور بے قراری دیدنی تھی۔

مشکبار ان کی کیفیت سے بے خبر اپنے خیالات میں غلطاں تھی، ذہن زقندیں بھرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچا جا رہا تھا۔ کبھی وہ اماں کے متعلق سوچتی، کبھی اپنا دلفریب اور معصوم و بھولا بھالا بچپن یاد کر کے.....دل مسوسنے لگتی۔ آج کو اگر اس کے ابا زندہ ہوتے تو کاہے کو ایسے ایسے واقعات اور حالات پیش آتے۔ معلوم نہیں وہ اپنے ان تینوں بچوں کی بہبودی اور بہتر مستقبل کے لئے کیا کچھ کرتے---تب مشکبار یوں اس کمسنی میں ماں کے ہاتھ کٹھ پتلی تو نہ بنتی---!اور آج جو یہ شادی ہوئی تھی تو عین ممکن تھا کہ اپنے چچا کے ہاں بیاہ کر جاتی اپنوں کو چھاؤں میں بیٹھی ہوتی۔ کوئی فقر کوئی فاقہ اس کے قریب نہ بھٹک رہا ہوتا---

بچپن کے مرغزاروں سے نکل کر اس کا خیال بانو کی طرف چلا جاتا۔ اور وہ بھی اور بھی زیادہ رنجیدہ ہو جاتی۔ اس نے بذاتِ خود تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ بانو بے چاری کے حق پر ڈاکہ ڈالے گی۔ سچ پوچھو تو اب تک کی زندگی میں ایک بانو ہی تو اس کی سہیلی بنی تھی لیکن حالات ایسے پیدا کر دیئے تھے کہ مشکبار ہی اس کی چور بن بیٹھی تھی---!اور---اب اس وقت---گل نے اپنے دلی احساسات کچھ دوسرے ہی رنگ میں سنائے تھے۔ ورنہ وہ تو آج سے قبل تک یہی سمجھتی رہی کہ گل کو بانو کے ساتھ بہت الفت اور انسیت ہوگی---

وہ اپنے خیالات کی رو میں خود ہی الجھ رہی تھی، سلجھ رہی تھی کہ اچانک--چونک کر اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔

گل اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھے تھے۔ اور پلک جھپکتے میں اس کا چھوٹا سا نرم و نازک ہاتھ ان کے گرم گرم ہاتھ میں دبا تھا۔

"مشکبار---مشکبار!" انہوں نے دوبارہ دھیرے دھیرے اس کا نام لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لمحہ بھر خاموش رہے -- پھر بلا تمہید کہنے لگے،

"جو کچھ میرے دل میں تھا، وہ میں نے بلا کم و کاست اور بغیر کسی بناوٹ و ملاوٹ کے تمہیں سنا ڈالا۔ اب تم اس پر کس حد تک یقین کرتی ہو --- ! یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن -- ابھی ذرا دیر پہلے کی تمہاری گفتگو مجھے الجھن میں ڈال گئی ہے۔ دیکھو مشکبار -- شادی ایک دو دن ساتھ گزارنے یا ہنسی مذاق کا قصہ نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور باوقار مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اماں نے مجھ سے اس مسئلہ پر بات کی تھی تو اتفاق ہی سمجھو کہ میں ایک لمحے کے واسطے بھی یہ نہ سوچ سکا کہ اس سلسلے میں خود تمہاری کیا رائے ہوگی؟

❀

یہی سبب ہے کہ اس دن سے آج تک میں اس معاملے میں مطمئن رہا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ تمہاری رائے وغیرہ کا مجھے خیال کیوں نہ آیا؟ اب سوچتا ہوں تو یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اول ہمارا ماحول اور تہذیب شاید ابھی تک اتنی آزاد اور کھلے ذہن کی نہیں ہے کہ لڑکی سے ضروری ہوتے ہوئے رضامندی لی جائے۔ ہمارا معاشرہ ابھی ایسا ایڈوانس کہاں ہے! لڑکی تو لڑکی اپنے یہاں تو لڑکے کو بھی ماں باپ کے سامنے اس معاملے میں بولنے اور چون و چرا کی اجازت نہیں ہوتی۔ دوسرا سبب ممکن ہے یہ رہا ہو کہ اماں کے منہ سے تمہارے حصول کا سن کر میں ایسا مگن اور خوش ہوا کہ باقی تمام مسئلے فراموش کر بیٹھا۔

لیکن آج -- اس وقت تمہارے موجودہ رویے کی وجہ سے مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے --- جیسے تم اس سنجوگ پر خفا ہو --- ناراض ہو --- اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو صاف یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ تم اپنی مرضی کے خلاف اس بندھن میں باندھی گئی ہو۔

کیا یہ درست ہے مشکبار؟

تمہیں تمہاری سب سے عزیز ترین شے کی قسم -- سچ سچ بتا دو -- اپنے دل میں کوئی بات پوشیدہ مت رکھو۔

تمہیں کسی کا ڈر خوف، جھجک اور اندیشہ نہیں ہونا چاہئے --

جیسا میں ان لمحات میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں، مجھے قسم ہے --- میں بعد میں بھی تمہارا ایسا ہی غمگسار ہوں گا۔

میرے دل سے تمہاری قدر کم ہوگی نہ غیریت و اجنبیت کو جگہ ملے گی۔ پھر تم جیسا چاہو گی، جو کہو گی، میں تمہاری خاطر ضرور بالضرور کروں گا

بس میرے دل سے اپنی پسند ناپسند کا بوجھ اتار ڈالو -- ورنہ میں اپنے ضمیر کی مار سے ہی مر جاؤں گا مشکبار -- میں نے بانو کو نظر انداز کر کے تمہیں اپنایا ہے اور ایک بے حد قیمتی اور انمول انعام سمجھ کر اپنایا ہے، اب اپنی خاموشی سے مجھے بے موت مت مارو خدا جانتا ہے کہ تم بہر صورت اور بہر طور میری روح اور میرے دل سے نزدیک ترین رہو گی۔ خواہ ذاتی طور سے مجھے اچھا سمجھو یا نہ سمجھو ---

بولو --- !

جواب دو نا مشکبار ---!!

گل کے لہجے میں التجا ہی التجا بھری تھی۔

ان کی آنکھوں میں ہزاروں سوال مچل رہے تھے۔

جن کی مرکزِ نگاہ صرف اور صرف مشکبار تھی -- اور مشکبار --- اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی غش کھا کر گر پڑے گی۔ اس وقت حالات نے یکا یک ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ دنگ رہ گئی تھی۔

ہوش و خرد جیسے دامن چھڑوا کر دور ہی دور بھاگے چلے جا رہے تھے۔ سمجھ میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور گل کو ان کی باتوں کا کیا جواب دے؟

اور--اب تو وہ ایک دم ہی سے اس کی طرف سے بدگمان ہوئے جا رہے تھے۔ غلط فہمی کا شکار ہو رہے تھے---

اب وہ کیا کرے؟

ان کو کیا جواب دے؟ کس طرح اور کیونکر مطمئن کرے!!

فکر، پریشانی، حیرت اور شرم و حیا سے مشکبار کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے کان میں سائیں سائیں بجنے لگی اور وہ ان کی ملائم سی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر بے اختیار چہرہ چھپا کر بیٹھ رہی۔

اس کا سارا وجود دھیرے دھیرے لرزنے لگا۔

یوں جیسے اپنے آشیانے سے اچانک بچھڑ جانے والی معصوم فاختہ ہو۔ جسے راستہ سجھائی نہ دے رہا ہو۔ خوفزدہ، لرزاں، اکیلی اور تنہائی کی مار کھائی ہوئی فاختہ---

گل کو اس کی حالت پر بے حد ترس آرہا تھا۔

وہ اس کی کیفیت کو خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ مگر اپنے دل کے ہاتھوں بھی بہت مجبور تھے۔ وہ ہر صورت میں اس کی زبان اس کا عندیہ سننا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ کسی کی لاچاری، بے بسی اور بے زبانی سے فائدہ اٹھانا انہیں سراسر اپنی مردانگی پر چوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سب ان کی نیک نیتی اور فطری شرافت کے خلاف ہوتا۔

"مشکبار!"......انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسے بے حد ملائمت اور شہد آفریں لہجے میں مخاطب کیا۔ "اگر تمہیں میری باتیں ناگوار گزری ہیں تو بخدا میں معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ تمہارا دل دکھانا ہرگز میرا مقصد نہیں ہے میں تمہیں خوش و خرم اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں بس-- فقط اتنا ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ تم اس شادی پر خوش بھی ہو یا نہیں-- بانو کا خیال دل سے نکال کر صاف ہاں یا نا میں جواب دے دو۔ بس پھر میں کچھ

نہ پوچھوں گا--مشکبار---! مشکبار----"

گل سے ضبط نہ ہو سکا تو انہوں نے اپنا ایک ہاتھ دھیرے سے اس کے شانے پر رکھ دیا کیونکہ اب وہ بہت ہی واضح طور پر کانپنے لگی تھی۔

گل اس کی اس مسلسل کیفیت سے گھبرا گئے۔

ادھر ادھر دیکھا۔ کونے میں ایک اسٹول پر صراحی اور گلاس نظر آ گئے۔ انہوں نے دوڑ کر گلاس پانی سے بھرا اور---

بمشکل تمام اس کا منہ کھلوا کر پانی اس کے پنکھڑی کی طرح لرزتے لبوں سے لگا دیا-- شاید مشکبار کے جی کو کچھ تراوٹ محسوس ہوئی کیونکہ چند منٹ کے بعد اس کی گھبراہٹ اور خوف میں کمی ہو گئی۔ اور وہ گل کے بار بار کہنے اور اصرار کرنے پر پلنگ کے اوپر پاؤں کر کے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ان لمحات میں اس کے تیور خود بخود نرم پڑ گئے۔ جارحانہ انداز جانے کہاں جا سویا تھا اور وہ بہت زیادہ شرمائی شرمائی اور لجائی سی لگ رہی تھی۔ گل کو بار بار اس پر چنبیلی کی ڈالی کا گمان ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خوش رنگ پھولوں کی ٹہنی جھکی جھکی جا رہی ہو--

❁

گل کے سامنے جانے کیا سوچ کر اس کی پلکیں ہی نہیں اٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں مندی جا رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

گل کو اب اپنا سوال دہرانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر حقیقت یہی تھی کہ ان کے دل میں کھد بد برابر ہوئے جا رہی تھی اور وہ اس کی زبان سے کچھ سننا چاہ رہے تھے۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غلطاں تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رات شاید اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ باہر آسمانوں سے شبنم گرنے لگی تھی۔ فضا نمناک اور بوجھل ہو رہی تھی۔

سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی بھاری بھر کم گاڑی زور دار دھمک پیدا کرتی ہوئی تیزی سے گزر جاتی۔ ذرا سی دیر میں پھر پہلے کی طرح سکوت طاری ہو جاتا۔

خاصی دیر تک دونوں دولہا دلہن ہونقوں کی طرح خاموش رہے۔

پریشان ہو کر گل نے ہی پھر پہل کر دی---

"مشکبار---برا نہ محسوس کرنا۔ میں ایک دفعہ پھر اپنا سوال دہراؤں گا کہ --بانو کو نظر انداز کر کے تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے---؟ میرا مطلب ہے اگر بانو درمیان نہ ہوتی یا یوں کہہ لو، میری منگنی نہ ہوئی ہوتی تو تم بخوشی مجھ سے شادی کر لیتیں؟"

مشکبار نے کسمسا کر بیٹھے ہی بیٹھے پہلو بدلا، اپنے تمام تر حوصلوں اور ہمتوں کو یکجا کر کے بالآخر مہین سی آواز میں بولی۔ "مجھے دراصل بانو کے خیال سے ہی چین نہیں آ رہا ہے......اسی کی فکر مجھے ڈسے جا رہی ہے کہ......جب اسے یہ خبر ملے گی تو اس کا......اس کا کیا حال ہو گا......اور اس کے خیالات میری طرف سے کتنے خراب ہو جائیں گے۔"

گل کا چہرہ اس کی زبان سے اتنا ہی سن کر تمتما اٹھا تھا۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی قندیلیں سی روشن ہو گئیں چہرے پر بہاریں رقص کرنے لگیں۔

ان کی آواز جوشِ مسرت سے کانپ گئی مگر وکیلوں والی جرح جاری رکھی۔

"بس---اس کے علاوہ تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟"

"بھائی جان......میں بانو کو......"

مشکبار کی حیا میں ڈوبی ہوئی بوجھل آواز ابھری۔ اس نے ایک دفعہ بانو کی یاد دہانی کرانی چاہی مگر اس دفعہ گل کی پیار بھری ڈانٹ اس کی کمزور سی آواز پر حاوی ہو گئی۔

"تم نے پھر 'بھائی جان' کہا---!خبردار!"

رفتہ رفتہ مشکبار کی پریشان زندگی کو بھی کچھ سکون، کچھ ٹھہراؤ نصیب ہو گیا۔ پہلے ہر وقت کے سہمے سہمے رہنے والے احساسات میں کمی آ گئی۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ دلی خوشی، آسودگی اور مسرت کسے کہتے ہیں۔

گو کہ نائمہ بیگم کے رویے میں تو اسے بیاہ کر بھی کوئی لچک اور تبدیلی پیدا نہ ہوئی تھی وہی روزمرہ کے احکامات تھے، گھریلو کام کاج اور معمولات تھے۔ کوئی کام غلط معلوم ہوتا یا بگڑ اٹھتیں تو وہی پہلے کی طرح ہنگامہ آرائی اور ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتیں۔ خواہ گل میاں بھی سن رہے ہوتے۔ داماد کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھیں۔

بلکہ جب سے گل میاں، مشکبار کی وجہ سے یہاں رہنے لگے تھے، نائمہ بیگم کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوتی گئیں۔ بعض اوقات ان سے بازار کا سودا سلف تک لانے کی فرمائش کر بیٹھتیں۔ کبھی اپنے اور عاشی کے کپڑے درزی سے سلوا رہی ہیں، کبھی اپنی کوئی پسندیدہ چیز لانے کو بھیج دیا اور تو اور انہیں اپنے پاندان کا سامان تک گل کا خریدا ہوا پسند آتا۔

گل کی مجبوری یہ تھی کہ اب وہ ایک شادی شدہ مرد تو ہو گئے تھے مگر بیوی سمیت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہیں رہنے کا بندوبست کرنے سے قاصر تھے۔ جس کی سب میں بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک خود کفیل نہ ہو سکے تھے۔ ظاہر ہے اب سے چند ماہ قبل تو ان کا طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تھا۔ ابھی وہ اپنی ذاتی پریکٹس کہیں جما نہ پائے تھے کہ شادی ہو گئی۔ کچھ نہ کچھ تو بیوی کے بھی اخراجات تھے۔ اپنے بھی شوق تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی دل میں ہزاروں ارمان اور آرزوئیں، حسرتیں بن کر تڑپ رہی تھیں۔ وہ مشکبار کو اچھے سے اچھا پہنانا چاہتے۔ خوب سیر و تفریح کروانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ہزاروں اقسام کے زیورات اور پسندیدہ چیزیں خریدنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جب ان کی ذاتی...... پریکٹس خوب چمک رہی ہوتی مگر وہ فی الحال اسی ایڈووکیٹ کے دست نگر تھے جس کی نگرانی میں سیکھ رہے تھے۔ جب کوئی مقدمہ خوب زور و شور سے کامیاب ہو جاتا تو وہ ایڈووکیٹ ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے نکلتا اور یہ اس روز خوب خوش خوش بیوی کے لئے کوئی چیز لئے ہوئے گھر پہنچتے۔

چنانچہ ایسے حالات میں یہ بہت غنیمت تھا کہ باپ کے زیر سایہ انہیں رہائش بھی ملی ہوئی تھی اور دال پانی روٹی کی فکر سے بھی آزاد تھے۔ بلکہ اس حد تک مراعات مل گئی تھیں کہ خود بھی تینوں وقت یہیں کھانا کھانے لگے تھے۔

دھیرے دھیرے بہت سے دن گزر گئے۔

ماں کی طرف سے تو مسکبار کو کیا سکون ملتا، ہاں گل نے جی بھر کے اس کا دامن اپنی چاہت کے پھولوں سے بھر ڈالا تھا۔

بس یہ سکون، یہ ٹھہراؤ اس کے حصے میں آ گیا تھا۔

پہلے اکیلی تھی--- تنہائی کا زہر نس نس میں پھیلتا رہتا تھا۔ اب یہ فرق آ گیا تھا کہ ایک آنسو پونچھنے اور پر خلوص تسلی دینے والا میسر آ گیا تھا۔ جو نہایت خلوص اور نیک نیتی سے اس کے زخمی زخمی دل میں حوصلوں اور امنگوں کی فصل اگا جاتا۔ اور اس کے

اندر زندہ رہنے کی امنگ بڑھاتا۔

شب و روز انہی حوصلوں انہی امنگوں میں گزرنے لگے۔

شروع شروع میں کوئی ہفتہ بارہ دن نائمہ بیگم نے دانستہ شمشاد اور دلشاد کو اوپر ہی سلایا تھا۔ پھر خود بخود ایک دن دوبارہ نیچے بھیج دیا۔ مشکبار تو مشکبار، گل نے بھی اعتراض نہ کیا۔ اعتراض کرنے کا دونوں کو حق بھی نہ تھا۔ مشکبار نے بسر و چشم معصوم بھائیوں کو اسی کمرے میں جگہ دے دی۔ ان کا بہن کے سوا تھا بھی کون؟ اور وہ خود بھی ان کے بغیر بے چین سی رہا کرتی تھی۔ بچپن سے اب تک عادی ہو چکی تھی۔ بھائیوں کو سنبھالنے اور دیکھ بھال کرنے کی۔

❀

مشکبار کو اب بھی کبھی کبھی بانو کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا خیال آ جاتا تو پہروں رنجیدہ اور خاموش خاموش سی رہتی۔ مگر اب اس نے گل کے مسلسل سمجھانے بجھانے سے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اکثر ایسا ہوتا کہ بانو اور گاؤں والوں کا خیال آتا تو وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں الجھا لیتی اور بھول جانے کی کوشش کرتی۔

شادی کے شروع دنوں میں اکثر گل شام کو آتے تو وہ ان سے گاؤں والوں کے بارے میں کئی کئی بار استفسار کرتی کہ ان کو اس شادی کا معلوم ہوا ہے یا ابھی تک بے خبر ہیں! لیکن عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے کبھی اسے ٹھیک نہ بتایا کہ وہاں کے کیا حالات ہیں اور وہاں اس اچانک شادی کا کیا ردِ عمل ہوا۔

چونکہ شادی کے بعد سے آج تک گاؤں والوں میں سے کوئی بھی دوبارہ آ کر یہاں نہیں جھانکا تھا۔ اس لئے مشکبار نے از خود سوچ لیا تھا کہ ان کو ضرور کسی سے خبر مل چکی ہے اس لئے ان لوگوں نے آنا جانا قطع کر رکھا ہے اور خفا ہیں۔ ورنہ پھر بھی کبھی کبھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عباس یا کوئی دوسرا رشتہ دار آ ہی نکلتا تھا۔ لیکن اب ادھر کئی ماہ سے تو وہاں سے ایک چڑیا کا بچہ بھی آ کر نہ جھانکا تھا۔

ایک دن جبکہ سب لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، نائمہ بیگم نے وہ بات چھیڑ دی، جو گزشتہ کئی روز سے ان کے دماغ میں آئے جا رہی تھی۔

آج اتوار کا دن تھا اور گل کے علاوہ ابا میاں بھی صبح سے گھر پر تھے، چھٹی کے دن یہ دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

مشکبار نے کھانے کی سینی لا کر تخت کے بیچ رکھ دی اور پانی کا جگ لینے کے لئے چلی گئی۔ اب گرمی کی رت خاصی بڑھ چکی تھی، اس لئے دوپہر کے کھانے میں چاولوں کا خشکہ ضرور ہوتا تھا۔ چاول گل کا بہت پسندیدہ کھانا تھا۔ انہوں نے مہکتی ہوئی گرم گرم چپاتیوں کو نظرانداز کر کے سب سے پہلے اپنی پلیٹ میں چاول ہی نکالے اور دھلی ہوئی ماش کی مسالے دار دال ڈال کر کھانے لگے۔

نائمہ بیگم قدرے مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”گل میاں! ابھی تمہیں اپنے گاؤں کی دال یاد نہیں آئی جو تمہارے گھر میں پکتی ہے! خدا جانتا ہے اس ہنڈیا میں ہر مسالے کی خوشبو نہایت آسانی سے الگ الگ شمار کر لو۔“

گل نے ان کے اچانک تبصرے پر کوئی جواب نہ دیا بلکہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ ابا میاں کے سنجیدہ ہونٹوں پر بھی تبسم رینگ گیا تھا۔

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد نائمہ بیگم سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

”ویسے...... تم اپنی ذاتی پریکٹس کب سے شروع کرو گے؟ میرا تو خیال ہے اب تم اکیلے کیس حل کرنے کے قابل تو ضرور ہو گئے ہو گے! کئی مہینے تو گزر چکے۔“

گل کے چہرے سے ایک سایہ سا گزر گیا۔

انہوں نے چند گھونٹ پانی پیا اور چاول کی پلیٹ اپنے سامنے سے ہٹا کر جواب دیا۔

”جی ہاں...... اب صورتِ حال تو ایسی ہی ہو چکی ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے اکیلا بھی عدالت میں کیس لڑ سکتا ہوں۔ لیکن...... سوال یہ ہے کہ بغیر پیسے بغیر کوڑی کہاں پر کاروبار جماؤں؟ دکانیں تو کئی ایک موقع کے لحاظ سے نظر میں ہیں مگر میں فی الحال کسی سے سودابازی کرتے ہوئے کترا رہا ہوں۔ اس سلسلے میں میں خود بھی ابا میاں سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

انہوں نے صاف صاف بات کہتے ہوئے---باپ کی طرف دیکھا۔ جو بظاہر کھانا کھا رہے تھے مگر بیٹے کی بات بھی توجہ سے سن رہے تھے۔

مشکبار بھی باورچی خانے میں بیٹھی ادھر ہی کان لگائے ہوئے تھی۔

نائمہ بیگم نے گل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اے تم نے کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟ کیا پسند نہیں آیا کھانا؟ یہ چپاتی اور کوفتے لئے ہوتے۔ دیکھو مشکبار نے کس محنت سے پکائے ہیں۔“

مشکبار کی تعریف سن کر وہ قدرے مسکرائے مگر متانت سے جواب دیا۔ ”نہیں اماں-- کھانا تو ماشاءاللہ بہت لذیذ اور عمدہ ہے۔ مگر مجھے بس اتنی ہی بھوک تھی۔ اب گنجائش نہیں معدے میں۔“

حالانکہ آج بھوک تو انہیں بہت زوروں سے لگی تھی مگر نائمہ بیگم کے بظاہر مٹھاس بھرے لیکن درحقیقت طنزیہ انداز نے ایک دم طبیعت مکدر کر ڈالی تھی۔

”او ہو اچھا!“ وہ ایک طویل سانس کھینچ کر بولیں۔ ”میں ڈر گئی تھی کہ کہیں تمہیں میری کوئی بات بری نہ لگ گئی ہو۔“

”ارے واہ! آپ بھی بس کمال کرتی ہیں اماں۔“ گل ایک بناوٹی ہنسی ہنس کر بولے۔

ابا میاں جو دونوں ماں بیٹے کی باتیں سن رہے تھے کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ہاتھ دھوئے پھر خلال کرتے ہوئے گل سے کہنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اب موقع ہاتھ آگیا ہے کہ تم گاؤں جاؤ اور جاکر عباس سے اس سلسلے میں بات کرو۔ اس سے صاف صاف کہو کہ اب کم از کم اتنی رقم کا بندوبست کر کے دو دے کہ میں فکری اور سکون کے ساتھ اپنی پریکٹس جما سکوں۔ اس سلسلے میں میں خود تمہاری مدد کرتا مگر میری پوزیشن اس حد تک نہیں ہ۔ پنشن وغیرہ کا پیسہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اس لئے میری طرف سے تو مدد کا کوئی امکان ہی مت سمجھو۔ میں خود بھی گاؤں جاتا مگر آج کل کچھ گرمی کی وجہ سے طبیعت گری گری سی رہتی ہے۔ اس لئے فی الحال تو جانے کا ارادہ نہیں ہے مگر تم کو تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے آخر کو وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس سے نہ لو گے تو پھر کس سے لو گے۔ میرا تو یہ ہے کہ...... سال کے سال ہی حساب کتاب لیتا ہوں اس سے۔"

نائمہ بیگم ان کی باتوں سے قدرے مطمئن سی ہو گئیں۔

لیکن گل کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ گاؤں جاتے ہوئے وہ بہت ہچکچا رہے تھے، اس لئے مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔

یوں تو انہیں عباس بھائی پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا انہیں یقینِ کامل تھا کہ وہ کام کے لئے پیسے دینے سے ہرگز انکار نہ کریں گے مگر یہ از خود وہاں جانے سے کترا رہے تھے اور ان میں یہ...... ہچکچاہٹ اپنی اچانک شادی کے بعد آئی تھی۔ اڑتی اڑتی یہ اطلاع ان تک پہنچ چکی تھی کہ گاؤں میں مشکبار سے ان کی شادی کی خبر خوب دھوم دھام سے پہنچ گئی ہے۔ مگر کسی ردعمل سے بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔

گو کہ اپنی دانست میں گل نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ اپنے کئے پر پشیمان تھے۔ مگر تھا بہرحال یہ اقدام ان کی خاندانی روایات کے سراسر خلاف ہی-- بس جواب دہی کے خیال سے گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی ان پر۔

ادھر نائمہ بیگم کو گل کا بغیر پیسے کوڑی کے رہنا اب خار کی طرح چبھنے لگا تھا۔

حالانکہ انہوں نے خود ہی انہیں بطور داماد پسند کیا تھا مگر اب شدومد سے یہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد ایک امیر و کبیر وکیل بن جائیں اور اگر علیحدہ رہائش نہ بھی اختیار کریں تب بھی اپنے اخراجات ان کے ہاتھ میں دینے لگیں۔

اسی وجہ سے وہ بار بار اس تذکرے کو چھیڑ بیٹھتی تھیں اور گاہے گاہے میاں کے کانوں میں بھی یہ بات پھونکنے لگی تھیں۔ چنانچہ آج ابا میاں نے کھلے الفاظ میں بیٹے کو بڑے بھائی سے پریکٹس کے لئے رقم لینے کی رائے دی تھی بلکہ گاؤں جاکر خود معاملات طے کرنے کا حکم دیا تھا۔

❀

انہوں نے اپنے پاس سے کچھ نہ دینے کا صاف لفظوں میں کہہ دیا گویا نائمہ بیگم کے دل کی مراد پوری کر ڈالی تھی۔ عجیب بات تھی کہ جو کچھ وہ سوچتی تھیں وہ پورا ضرور ہو جاتا تھا۔ اس معاملے میں وہ نصیب کی دھنی تھیں۔ گل کے معاملے میں بھی وہ چاہتی تھیں کہ وہ کسی طرح بڑے بھائی سے زمین جاگیر میں اپنا حصہ وصول کریں اور یہ حصہ ہو بھی نقدی کی صورت میں۔ تاکہ ان کے کام بھی آسکے۔

مشکبار کو تو وہ کسی قطار شمار لاتی ہی نہ تھیں۔ خوب اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ کسی مسئلے میں دخل انداز نہیں ہو سکتی۔ جو یہ ماں کی حیثیت سے کہیں گی وہ بے چون و چرا سر جھکا کر کرے گی۔ اس کے سوا اس نے ماں سے سیکھا ہی کیا تھا! اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ گل کو اپنی راہ پر لگا کے مال وصول کر لیں اور جب تک ممکن ہو سکے خوب بہتے دریا میں ہاتھ دھوئیں۔

دوپہر کے وقت جب ابا میاں اور اماں آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو مشکبار بھی کام سے فارغ ہو کر نیچے اتر آئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں گل کمرے میں تنہا لیٹے چھت کی کڑیاں گن رہے تھے۔ دلشاد اور شمشاد کہیں باہر کھیل رہے تھے۔

مشکبار کو دیکھ کر وہ نیم دراز ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگے۔

"میں...... سوچ رہا ہوں مشکبار! کہ یہاں چھت پر ایک عدد برقی پنکھا ضرور لگنا چاہئے۔ اب تو موسم بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ رات کو کافی گھٹن اور گرمی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ چند دنوں میں باقاعدہ گرمی آجائے گی۔"

اس نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ "زیادہ تردد کی کونسی بات ہے ابا میاں کے کمرے سے اتار لائیے پنکھا۔"

"تم...... گویا میری غربت کا مذاق اڑا رہی ہو!" وہ قدرے افسوس کے لہجے میں بولے۔

"ارے میری توبہ...... ہزاروں بار توبہ۔" وہ جلدی سے کلے پیٹ کر کہنے لگی۔ "میں تو محض مذاق میں کہہ رہی تھی اور آپ...... برامان گئے...... افوہ بھئی...... یہ لیجئے! معافی مانگے لیتے ہیں۔" مشکبار نے بدستور ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیئے۔

گل نے مسکرا کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور نارمل لہجے میں کہنے لگے۔ "یہ تو خیر مجھے بھی معلوم ہے کہ تم مذاق کر رہی تھیں لیکن میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں کہ خدا نے چاہا تو جلد از جلد اپنی کمائی سے اس کمرے میں پنکھا ضرور لگواؤں گا۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں ہے بس نیت ہونی چاہئے۔"

"آمین۔ ثم آمین......" مشکبار نے اس دفعہ نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میری دعا ہے خدا تعالیٰ آپ کے نیک ارادے میں برکت دے، اسے پورا کرے اور ہمارے کمرے میں چھت کا پنکھا لگ جائے...... ہائے...... ایمان سے کتنے مزے کا کام ہوگا کم از

کم نیند تو چین کی آیا کرے گی۔ ہم تینوں بہن بھائی ہر سال اتنی سڑی گرمی میں گدھوں کی طرح پڑے ہانپتے رہتے تھے۔ آپ سے چلو فائدہ تو ہوگا کہ گرمی سے نجات مل جائے گی اور میرے معصوم بھائیوں کو بھی آرام ملے گا۔"

"اچھا جی...... تو گویا ہم سے اور کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔" گل نے شوخی اور شرارت سے پوچھا۔

"نہیں جی...... اور بھی بہت سارے فوائد ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ گوشت اور ترکاری بہت عمدہ لاتے ہیں اور خود نہایت کم کھاتے ہیں۔ اماں کے لئے ڈلی تمباکو اور پان جتنے اماں پیسے دیں، ان سے زیادہ لا کر دیتے ہیں ان سب فائدوں کے علاوہ مزید فائدے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کبھی سائیکل کا کرایہ وصول نہیں کرتے، نیز بلا تنخواہ یہ سب کام سرانجام دیتے ہیں، دھوبی، درزی، جولاہے، کپڑے والے، پرچون والے، ترکاری والے تقریباً ہر طبقہ خیال کے افراد سے آپ کی واقفیت اور دوستی ہے جن کی مراعات سے براہ راست اماں کو مالی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ کبھی کبھی نہایت سنجیدگی سے ملازم کو ہٹا دینے کا منصوبہ بنانے لگتی ہیں۔"

گل اس کے شوخ لہجے اور شرارت بھرے انداز پر کھسیانے ہو کر ہنسنے لگے۔ دل ہی دل میں اس کی باتوں سے قائل بھی ہو رہے تھے۔

"پھر...... کب لگوا رہے ہیں پنکھا؟ مجھے اشتیاق ہونے لگا ہے۔" مشکبار نے جھوٹ موٹ سنجیدہ بن کر پوچھا۔

"جب میرے مولا کو منظور ہوگا۔" گل نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "خدا کے ارخانے میں دیر ہے اندھیر تو نہیں۔ میں تمہاری طرح مایوس نہیں ہوں۔"

وہ سچ مچ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "خیر...... یہ تو آپ سراسر غلط کہہ رہے ہیں کہ میں یوس رہتی ہوں۔ جناب! مایوسی اگر میری فطرت میں ہوتی تو جانے کب سے...... اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیکار اور فالتو زندگی سے پیچھا چھڑا چکی ہوتی!"

گل جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور ملامت بھرے لہجے میں کہنے لگے۔ "یہ آج تم کیسی اوندھی سیدھی باتیں کئے جا رہی ہو! کیا ہو گیا ہے تمہاری زندگی کو؟ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ والدین تمہارے سر پر موجود-- بھائی خدا نے تمہیں دیئے۔ جیسا کیسا بھی ہوں میں تمہارا شوہر بھی دلجوئی کرنے کو تیار رہتا ہوں۔ اور تمہیں کیا چاہئے، آرام و سکون سے بسر کئے جاؤ۔ ناشکری تو خدا کو بھی ناپسند ہے۔"

مشکبار صرف مسکرا کر رہ گئی۔ جانے کیوں اس نے گل کی بات کا جواب نہیں دیا گا۔ گل خود ہی دوبارہ کہنے لگے۔

"بس اب تو خدا سے دعا کرو کہ ہمارے بھی مصیبت اور غربت کے دن کٹ جائیں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کتنے ارکان اور نیک جذبات ہیں یہ وہی جانتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے قدموں میں دنیا جہان کی نعمتیں ڈھیر کر دوں۔ اور تمہاری ہر خواہش ہر آرزو کہنے سے پہلے پوری کر دیا کروں۔ اب ابا میاں نے علیحدہ پریکٹس کا مشورہ دیا ہے۔ سوچ رہا ہوں کسی روز عباس بھائی صاحب سے جا کر اس معاملے میں بات کر ہی لوں۔ تاکہ جلد از جلد ٹھکانے سے بیٹھ جاؤں۔ کم از کم اپنی ذاتی آمدنی کی آس تو بندھے گی۔"

"ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔" وہ بھی جلدی سے خوش ہو کر بولی۔ "میں نے جب سے ابا میاں کے منہ سے یہ بات سنی ہے مجھے خوشی کا احساس ہو رہا ہے۔ جب آپ الگ دکان کھولیں گے اور آپ کی پریکٹس خوب چمک اٹھے گی تب کیسا مزہ آئے گا۔ سب لوگ مجھے کہا کریں گے کہ دیکھو! یہ وکیل صاحب کی بیوی ہیں۔"

وہ بے ساختہ ہنس دیئے۔

خوشی و مسرت کے اندرونی احساس سے ان کا چہرہ چمکنے لگا اور پیار سے اسے دیکھ

کر بولے۔

"انشاءاللہ...... تمہاری یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ بس ذرا ایک بار گاؤں کا چکر لگا آؤں پھر تو چند ماہ کے اندر اندر ہمارے دن پھر جائیں گے۔"

"کب جائیں گے آپ گاؤں!" مشکبار نے جلدی سے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو...... ہفتے ایک میں ارادہ باندھ تو رہا ہوں۔ آگے جو بھی میرے رب کو منظور ہو۔ تم بھی ہر نماز کے بعد دعا کیا کرو۔"

"ادھر...... بانو کے گھر بھی جائیں گے کیا؟"

"اچھا......! ادھر کیا جلتی پر تیل چھڑکنے جاؤں!" ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

وہ ایک دم ہی چپ ہو گئی اور سوچنے لگی۔

"سچ تو ہے...... اب وہاں یہ کس منہ سے جائیں گے...... یہ لوگ سوچیں گے بھلا! ہو سکتا ہے بات تک نہ کریں اور خود بانو کے دل پر کیا گزرے گی ان کو دیکھ کر......؟ ہائے محض ایک میری وجہ سے یہ بے چارے اپنے سارے کنبے خاندان سے بچھڑے گئے لیکن...... اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب کچھ تو اماں کی مرضی اور خواہش پر ہوا ہے...... اور اللہ کی شان دیکھو! وہی اب اچھا نہیں جان رہیں۔"

"یہ کس سوچ میں پڑ گئیں مشکبار؟"

گل نے اسے اندر ہی اندر کسی سوچ میں گھلتے دیکھ کر ملائمت سے پوچھا۔

"کسی بھی نہیں۔" وہ چونک کر جلدی سے ہنس دی۔ "میں بھلا کیا سوچوں گی۔ یونہی ذرا بانو کا خیال آ گیا تھا۔"

"بانو کا...... خیال؟" وہ متحیر رہ گئے۔ مگر پھر فوراً ہی ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگے۔

"ارے ہاں...... میں تو بھول ہی چکا تھا کہ کچھ عرصہ تک تمہارے سر میں ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لڑکی بانو کا سودا بھی ہوا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے...... آج پھر وہ جنون تازہ ہونے کا دن آگیا ہے۔"

وہ ان کے مذاق پر کھسیا کر مسکرانے لگی مگر خاموش رہی۔

گل شاید کچھ مزید تبصرہ کرتے مگر اسی وقت دلشاد اور شمشاد آپس میں کسی بات پر جھگڑتے ہوئے آگئے۔

گل نے دونوں کو ایک ایک ڈانٹ پلائی پھر انہیں اسکول کا کام کرانے لگے۔

مشکبار دوسری طرف چارپائی پر منہ موڑ کر لیٹ رہی۔ آج کل وہ بہت ست سی رہنے لگی تھی۔

❀

"اے بیٹے...... آپ کسی صورت مان ہی نہیں رہیں۔ حالانکہ میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں۔ اچھا!...... یہ بتائیے! مشکبار کے نکاح کو کتنے مہینے ہوگئے ہیں؟"

ماسٹر صاحب کی بیوی نے کسی بات پر مسلسل بحث کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ خاصی دیر سے نائمہ بیگم کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ نائمہ بیگم کی اچھی ملنے والیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اس وقت دونوں ایک ہی پلنگ پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ درمیان میں پاندان کھلا رکھا تھا ماسٹر صاحب کی بیوی بے حد آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ خود ہی پان بنا بنا کر کھائے جا رہی تھیں اور بحث کر رہی تھیں۔

نائمہ بیگم نے ان کی بات سن کر ذرا دیر انگلیوں پر حساب لگایا۔ منہ ہی منہ میں بدبداتی رہیں پھر سوچ کر بولیں۔

"ہاں...... میرے حساب سے آٹھ ماہ تو ہوگئے اس بیاہ کو۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" ماسٹر صاحب کی بیوی مطمئن ہو کر کہنے لگیں۔

"آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے لیکن دیکھ لیجئے گا میرا کہا کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ مشکبار کو کم سے کم بھی چار ماہ ہیں۔ بس اب تو خیر سے نانی بننے کی تیاری شروع کر دیجئے۔ اجی ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں آپ کی طرح۔"

نائمہ بیگم ان کے مذاق پر ہنس نہ سکیں۔ سوکھا سا منہ بنا کر بولیں۔ "اے آج کل تو دن لگتے دیر ہی نہیں لگتی۔ مجھ نگوڑ ماری نے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ نہ کبھی اس سے دریافت کیا۔"

"اے لو۔" ماسٹر صاحب کی بیوی ایک اور پان منہ میں رکھ کر گویا ہوئیں۔ "اس میں پوچھنے دریافت کرنے کی کون سی بات ہے۔ شادی بیاہ ہو جائے تو پھر یہی دھندے شروع ہو جاتے ہیں۔ کہیں لگاتار...... تو کہیں وقفوں کے ساتھ۔ کیا ہمارے آپ کے بچے نہیں ہوئے؟"

نائمہ بیگم جواب تک سنبھالا لے چکی تھیں مسکرا کر بولیں۔ "ہاں ہوئے کیوں نہیں۔ مگر میں حیران ہوں کہ تم نے پہچانا خوب...... میرے سامنے تو وہ چوبیس گھنٹے رہتی ہے اور مجھے پتہ نہ چل سکا۔"

انہوں نے تجربہ کار انداز میں آنکھیں چلا کر کہا۔ "اے ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن کر بتا ڈالیں۔ وہ تو اتنے عرصے سے آنا نہ ہوا اور نہ پہلے ہی بتا دیتے۔ اس وقت بھی محض اتفاق سے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس کے کمرے میں جھانک لیا۔ بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ بس فوراً اندازہ ہو گیا۔"

"ہاں...... ست ست سی لگی تو بہت دفعہ مجھے بھی تھی۔" نائمہ بیگم پاندان اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سوچ بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔ "ایک دن کہہ رہی تھی چکر آ رہے ہیں...... کبھی کبھی کمر میں درد بھی بتاتی ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماسٹر صاحب کی بیوی قدرے افسوس کے لہجے میں بولیں۔ "کمزور بہت ہے نا! اس لئے چکر وکر آجاتے ہوں گے۔ اے کیسی دھان پان سی تو رکھی ہے۔ ورنہ آپ جانتی ہیں پہلے پہل کے بچے کا تو تندرست لڑکیوں کو پتہ تک نہیں چلتا، ادھر سے ادھر بھاگی بھاگی پھرتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے کہنے سے بھی اچھل پھاند سے نہیں چوکتیں۔"

نائمہ بیگم کچھ قائل ہو کر کہنے لگیں۔ "ہاں۔ اس کی اٹھان ہی نازک سی ہے۔ اب اس قدرتی کمی کو کیا کیا جائے۔ اے اسے قے وغیرہ بھی کرتے تو نہیں دیکھی میں نے!"

"خیر یہ کوئی لازمی نشانی نہیں ہے۔" وہ اگلدان میں پیک تھوک کر اطمینان سے بولیں۔ "ہمیں ہی دیکھ لیجئے...... گیارہ بچوں کی اماں بن گئے ماشاءاللہ۔ مگر کسی دفعہ بھی قے تو در کنار...... کبھی معمولی سے ابکائی تک نہیں آئی۔"

نائمہ بیگم ہنسنے لگیں۔ "اے بہن! آپ نے تو اپنی ساری سوانح عمری سی دہرا ڈالی۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ کبھی کچھ محسوس نہیں کیا۔"

ماسٹر صاحب کی بیوی کو ایک دم پھر مشکبار کا خیال آگیا۔ اب آپ اپنی بیٹیا کا ذرا خیال رکھئے گا۔" بالی عمر کی بچی ہے اور کمزور سی۔ کہیں خدانخواستہ اونچا نیچا پاؤں نہ پڑ جائے۔ دوسرے آپ کے اتنی بہت سی سیڑھیوں کا زینہ ہے۔ سمجھاتی رہئے گا ذرا۔"

نائمہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ فقط سر ہلا کر رہ گئیں۔

یہ دونوں بہت دیر تک اسی نوعیت کی باتیں کرتی رہیں اور چونکہ ایک موضوع ہاتھ لگ گیا تھا اس لئے اپنی اپنی عادات اور مزاج بھی ایک دوسری پر عیاں کرتی جا رہی تھیں۔

اسی دوران نائمہ بیگم نے اٹھ کر شربت تیار کیا۔ خود بھی نوشِ جان کیا اور انہیں بھی پلایا۔ کچھ دیر بیٹھی وہ مزید باتیں کرتی رہیں پھر رخصت ہو گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد نائمہ بیگم نئے سرے سے سوچ میں غرق ہو گئیں۔ وہ سر سے پاؤں تک فکر میں مبتلا تھیں۔

انہیں پریشانی اس بات کی تھی کہ بیٹھے بٹھائے ایک خرچ مزید بڑھنے والا تھا۔ جبکہ گل کی آمدنی وغیرہ کا ابھی کچھ معلوم نہ تھا۔

انہوں نے اپنے دل کو سمجھانے کے لئے ایک بار پھر حساب جوڑا پھر از خود بولیں۔ "ہاں! اگر گل آج کل ہی میں گاؤں سے رقم لا کر اپنی پریکٹس شروع کر دیں تو ممکن ہے بچے کی پیدائش تک خود کفیل ہو جائیں۔ اس طرح اپنے اخراجات خود اٹھائیں گے...... ہاں تو اور کیا! بھلا میں کہاں سے لاؤں گی؟ کوئی ایک آدھ روپیہ تو خرچ ہوتا نہیں اس موقع پر۔ اللہ خیر کرے سینکڑوں ہی کا خرچہ پڑ جاتا ہے......"

نائمہ بیگم نے واقعی اب تک مشکبار کے حلئے پر توجہ نہیں دی تھی۔ مگر جب انہوں نے غور کیا تو---انہیں بھی ماسٹر صاحب کی بیوی کے انداز کی داد دینی پڑی اور انہیں بھی یقین آگیا کہ مشکبار امید سے ہے۔

اگلے---

جب ابا میاں اور گل ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر چلے گئے اور یہ دونوں ماں بیٹی گھر پر اکیلی رہ گئیں تو نائمہ بیگم نے موقع پا کر مشکبار سے دریافت کیا۔

"تم...... دوسرے جی سے ہو کیا مشکبار!"

"جی!" وہ حیران رہ گئی اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی صورت تکنے لگی۔

نائمہ بیگم کو سخت الجھن ہوئی، مگر سمجھا بجھا کر پوچھنے لگیں۔

ماں کے منہ سے یہ کھلی کھلی باتیں سن کر مشکبار کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑ گئی۔ ہونٹ پل بھر میں سوکھ کر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے اور وہ ماں کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

یونہی لگ رہا تھا جیسے اس نے چوری کر لی ہو---

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر نائمہ بیگم شپٹا کر رہ گئیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آخر کو ماں تھیں۔ دل ہی دل میں اسے پشیمان اور پریشان دیکھ کر خود بھی بڑی شرمندہ ہوئیں۔ سوچنے لگیں۔

'اے ہے۔ میں نے ناحق لڑکی کو کچا کیا۔ کیسی چوروں کی طرح سر جھکا کر کھڑی ہو گئی ہے جیسے کوئی انہونی سرزد ہو گئی ہو......

تھیں نہایت جہاندیدہ--- بات بدل کر جلدی سے بولیں۔

"اپنی طبیعت کا دھیان رکھا کرو بیٹی--- ابھی شروعات ہے اس لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے کوئی وزن وغیرہ مت اٹھانا سیڑھیاں سنبھل سنبھل کر اترا کرو۔ کچے پکے دنوں کی ذرا سی بے پروائی بعد کو ساری عمر کا روگ بن جاتی ہے...... اور ہاں دیکھو! میں گل سے بات کروں گی ذرا وہ تمہاری صحت کا خیال رکھے۔ کوئی فروٹ وغیرہ منگوا کر دوپہر کو کھالیا کرو...... اور جب تک وہ پیسے کا انتظام نہیں کرتا، تم رات کو ہمارے دودھ میں سے ایک پیالہ دودھ لے کر پی لیا کرو......"

ماں کی غیر متوقع اور غیر معمولی ہمدردی کی باتیں سن کر مشکبار کا دل بھر آیا اور جانے کیوں اپنے کمرے میں آ کر وہ کتنی ہی دیر روتی رہی اور سوچتی رہی۔

'ہائے اللہ! اماں کو ہمارا کتنا خیال ہے!'

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔

اور شدید گرمی کا عالم---

باہر دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ سنسنا رہی تھی۔ حبس کی وجہ سے دم گھٹتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ موسم کی اس قہر سامانی نے آوارہ گھومتے رہنے والے کتوں کو بھی ٹھنڈے اور سایہ دار مقامات پر دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بازار اور گلی کوچے سنسان پڑے تھے۔ ویران سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا۔ لوگ باگ بند کمروں میں گھسنے کو زیادہ ترجیح دے رہے تھے۔ امیر یا غریب، جی سب کا اس گھٹن اور شدید گرمی میں صرف آرام کرنے کو چاہ رہا تھا۔

ابا میاں آج سویرے سے ہی دفتر نہیں گئے تھے۔ اس وقت ان کے کمرے کے دروازے بھی بند تھے اندر سے برقی پنکھے کی گھوں گھوں کے سوا ہر آواز ناپید تھی۔ آنگن میں پیلی پیلی تیز دھوپ بکھری تھی۔ آنکھیں چندھیا دینے والی--

مشکبار نیچے اپنے کمرے میں کھری چارپائی پر لیٹی پسینے سے تر بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس گرمی اور گھٹن میں اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی، نیند کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسری چارپائی پر شمشاد اور دلشاد بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ پسینے میں وہ بھی سر سے پاؤں تک شرابور تھے۔

کسی کسی وقت مشکبار ہاتھ بڑھا کر انہیں بھی پنکھا جھل دیتی۔

ادھر بہت دنوں سے اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ اپنی ناتجربہ کاری اور کمسنی کی وجہ سے اسے پوری طرح احساس نہیں تھا ورنہ خون کی ایک دم کمی نے اس کے جسم کی ساری توانائی کھینچ لی تھی اور وہ چوبیس گھنٹے کمزوری اور دل بیٹھنے کی شکار رہنے لگی تھی۔ چلتے چلتے ایک دم آنکھوں کے آگے گہرے اندھیرے آجاتے، کمر میں درد اٹھتا تو دن بھر ہوتا رہتا۔ اب تو ہاتھ پیروں پر بے معلوم سا ورم بھی آنے لگا تھا۔

نائمہ بیگم بیٹی کی حالت کو خوب سمجھ رہی تھیں، آخر کو ماں تھیں۔ ایسا مامتا سے خالی دل بھی نہ تھا۔

جی ہی جی میں اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کبھی کبھی کڑھنے لگتیں۔ گل پر بے تحاشا غصہ آجاتا۔ جو پیسے کے تھے نہ کوڑی کے۔

وہ آج کل صرف اسی وجہ سے چپ سادھے ہوئے تھیں کہ چلو یہ روپیہ بھائی سے لے کر آئیں گے تو کاروبار کر ہی لیں گے۔ پھر پیسے کی ریل پیل ہو جائے گی۔

حتی الامکان مشکبار سے محنت طلب کام کم لینے لگی تھیں لیکن تابکے...... آخر کو اتنے بڑے رہتے بستے گھر کا دھندا تھا۔ خود کام کاج کی عادت تقریباً چھوٹ چکی تھی تاہم بیٹی سے انہوں نے اپنا رویہ خاصی حد تک نرم اور ہمدردانہ کر لیا تھا۔ سوچتی تھیں میں نے خود ہی تو آگا پیچھا دیکھے بغیر محض اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں یہ نکاح کروایا ہے۔ اب کچھ کہوں بھی تو کس زبان سے کہوں! اور لڑکی کا تو اس میں سرے سے ہی کچھ قصور نہیں ہے۔

خود ان کے اپنے گھر کا خرچ اتنا بڑا اور پھیلا ہوا تھا کہ وہ مشکبار کے دوا علاج، قیمتی دواؤں، فروٹ یا غذا پر اپنے پلے سے خرچ نہ کر سکتی تھیں۔ اب آج کل تو ان کی نگاہیں گل پر لگی تھیں کہ وہ کب گاؤں جائیں اور وہاں سے ایک خطیر رقم وصول کر کے لائیں۔

گل کو آج گاؤں گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔

مشکبار کو ایک ایک پل ان کا انتظار تھا۔

جب سے شادی ہوئی تھی۔ اس دفعہ پہلی بار وہ اتنے دنوں کے لئے اس سے دور ہوئے تھے۔ یوں بھی مشکبار کو سر سے پیر تک فکر لگی ہوئی تھی کہ دیکھو گاؤں میں سب لوگ ان سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ یہ بات تو پکی تھی کہ انہیں گل اور مشکبار کی شادی کی اطلاع مل چکی ہو گی۔ لیکن خود گل شادی کے بعد بالکل پہلی بار گئے تھے اور مشکبار نے صاف محسوس کیا تھا کہ بہت جھجکتے ہوئے گئے ہیں۔

اپنی واپسی کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے ہی بھائی صاحب نے رقم کا انتظام کر دیا وہ لے کر واپس چلے آئیں گے۔

مشکبار اس بلا کی گرم دوپہر میں سوچتی جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی مگر نینداس پر مہربان نہیں ہو سکی تھی۔

'اللہ...... گل جلدی سے پیسے لے کر واپس آجائیں۔ پھر یہاں ہمارے کمرے کی چھت پر بھی ایک عدد برقی پنکھا لگ ہی جائے گا!'

اس نے کروٹ بدل کر بڑی بے تابی سے سوچا، تصور میں ابا میاں کے ٹھنڈے ٹھار کمرے کا منظر گھوم گیا جہاں چوبیس گھنٹے برقی پنکھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھینکتا رہتا تھا۔

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

اور جی ہی جی میں کوفت کھا کر جلدی جلدی پنکھا جھل کر خود کو سکون پہنچانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر گرمی کی تپش اور گھٹن آمیز دوپہر میں بھلا آرام اور سکون کہاں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اچانک --- خاموش دوپہر کے اس جامد سناٹے میں کسی نے باہر کے دروازے پر کھٹکا کیا۔

پہلی آہٹ کو مشکبار اپنا واہمہ سمجھی۔

لیکن دوسری آواز پر وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس دستک کو وہ خوب اچھی طرح پہچاننے لگی تھی

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح بھاگ کر گئی اور پلک جھپکتے میں دروازے کی زنجیر گرادی۔ توقع کے عین مطابق گل اس کے سامنے کھڑے تھے۔

بیوی کو دیکھ کر انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

ان تباہ حال حلیہ دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گاؤں سے یہاں تک پیدل چلتے ہوئے آئے ہوں۔

جو کپڑے یہاں سے پہن کر گئے تھے، اس پسینہ بہاتی گرمی میں بھی وہی جوڑا ان کے جسم پر چپکا نظر آ رہا تھا۔ جو چکیٹ ہو چکا تھا جگہ جگہ پسینے اور مٹی کے داغ تھے۔ ایڑی سے چوٹی تک محاورے والا پسینہ بہہ رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ شیو بڑھی ہوئی اور آنکھیں اندر کو دھنسی دھنسی چہرے پر فاقہ مستوں والی بے بسی کے سائے--

مشکبار کے پیروں تلے کی مٹی سرک گئی۔

یہ تو اصلی گل میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہو گیا تھا۔

مشکبار نے ان کا وہ ہاتھ جو چوکھٹ پر رکھا ہوا تھا پکڑ کر کھینچنا چاہا اور لرزتی آواز میں بولی۔

"اندر آیئے نا--یہ باہر کیا کھڑے دیوانوں کی طرح دیکھ رہے ہیں!"

ہاتھ پر ہاتھ پڑتے ہی جیسے کسی نے اسے آگ کے دریا میں دھکا دے دیا۔ گل کا ہاتھ انگاروں کی طرح تپ رہا تھا۔ بخار جیسے ان کی رگ رگ سے ٹپک رہا تھا۔

مشکبار کا اپنا آپ ڈوبنے لگا۔

بیمار بدن ہولے ہولے کانپنے، تھرتھرانے لگا۔

مگر اس نے حوصلے سے کام لیا اور کسی نہ کسی صورت اپنا ناتواں سہارا دے کر شوہر کو اندر لے جانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

گل اس بخار کی حدت اور گرمی کی شدت میں کسی طرح گھر تک تو پہنچ گئے تھے مگر یہاں پہنچ کر انہیں کچھ ہوش نہ رہا۔

کمرے میں آکر چارپائی پر وہ دھڑام سے گر گئے۔ مشکبار کے کمزور ہاتھ پیر میں اتنا دم کہاں تھا کہ انہیں سنبھالے رہتی۔ اوپر سے وہ آگ کی طرح دہک رہے تھے۔

آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور تنفس تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

گرتے ہی ان پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

مشکبار سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گل کے دشمنوں کی یہ مردہ حالت دیکھ دیکھ کر اس کا دل پہلو سے نکلا جا رہا تھا۔ کہاں تک ضبط کرتی! گل ہوش میں رہتے تو قدرے تسلی بھی رہتی۔ اپنی بپتا میں وہ ابا میاں کا رعب اور اماں کا تیز مزاج بھی بھول گئی۔

دوپہر کی خاموشی اور سکوت میں اس کی بلکتی ہوئی آواز کمرے سے باہر نکل کر زینے بھی پار کر گئی لیکن مشکبار کو احساس نہ ہو سکا۔

اس کے رونے کی آواز سن کر شمشاد اور دلشاد اٹھ بیٹھے اور حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

عین اس وقت نائمہ بیگم ہانپتی، کانپتی غرارہ دونوں ہاتھوں سے سنبھالیں کمرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اندر داخل ہوئیں۔ گھبراہٹ اور پریشانی سے ان کی جان پر بنی تھی۔

"کیا ہو گیا..... کیا ہو گیا مشکبار؟" انہوں نے بدحواسی کے عالم میں دریافت کیا۔

روتی بلکتی مشکبار نے گل کی طرف اشارہ کر دیا۔ جو اپنے آپ سے بیگانے چارپائی پر آڑے ترچھے پڑے تھے اور بخار کی تیزی میں ہاتھ پیر پٹخ رہے تھے۔

"ارے یہ گل کو کیا ہوا..... اور یہ گاؤں سے کب آگئے؟" نائمہ بیگم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

باہر سے ابا میاں کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا پریشانی ہے نائمہ بیگم! میں اندر آسکتا ہوں۔"

وہ شاید بیوی کے ساتھ ہی بھاگتے ہوئے نیچے آئے تھے۔ مگر معاملے کی نوعیت نہ سمجھتے ہوئے اور آج گل مشکبار کی حالت کے پیش نظر باہر ٹھہر گئے تھے۔

"بھئی یہ گل یہاں مدہوش سے پڑے ہیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔" نائمہ بیگم نے پریشانی کے لہجے میں جواب دیا۔ گل کا سن کر ابا میاں اندر داخل ہو گئے اور جھک کر بیٹے کی نبضیں ٹٹولنے لگے۔

روتی ہوئی مشکبار کی آواز میں یکلخت بریک لگ گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ابا میاں اس کے سامنے اس کمرے میں آئے تھے۔ یوں بھی ان کی بارعب شخصیت کے سامنے سب کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔ اس نے بھی جلدی سے اپنے آنسو خشک کر لئے اور سر جھکا کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

ابا میاں نے بیٹے پر جھکے جھکے اس سے دو تین سوال کئے۔ جن کا وہ منمنا کر جواب دیتی رہی۔ بات میں کوئی تفصیل تھی بھی نہیں۔ بیوی کو وہیں موجود رہنے کا اشارہ کر کے وہ باہر چلے گئے۔

شاید---ڈاکٹر کو بلانے گئے تھے---

❁

گل نے ایک ہفتے تک پلنگ پکڑے رکھا۔

انگریزی دوائیں اور پرہیزی کھانا کھا کھا کر ان کا ناک میں دم آگیا۔ تب کہیں جا کر ان کا بخار ٹوٹا اور ڈاکٹر کی ہدایات سے جان چھوٹی۔

مگر اتنے ہی عرصے میں نائمہ بیگم ان سے بری طرح خار کھانے لگی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ انہیں ایک وقت کی بھی دوا مہیا نہ ہونے دیتیں اور نہ پرہیزی کھانا پکنے دیتیں لیکن اپنے میاں کے سامنے مجبور تھیں۔ جو کم از کم جان بوجھ کر تو بیٹے کو مسلسل بیمار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ ایک قدرتی امر تھا۔

نائمہ بیگم کی چڑ اور نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گل جیسے خالی ہاتھ گاؤں گئے تھے، ویسے ہی خالی جھولی لئے لوٹ آئے تھے۔

کسی وقت ابا میاں نے ان سے تفصیل معلوم کی ہو گی-- بعد میں یہ قصہ ان سے نائمہ بیگم نے سنا اور تبھی سے انہیں ہر ہر بات پر گل پر تاؤ آنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا ایسے داماد کو کچا چبا جائیں جو بقول ان کے نہ کمائی کا تھا نہ کجائی کا۔

دوسری طرف مشکبار نے گل کی بیماری کے دوران ان کی خدمت اور تیمارداری کرنے میں اپنی کمزور سی ہستی لڑا ڈالی تھی۔ شروع کے دو رات تو اس نے آٹھوں پہر ان کی پٹی سے لگ کر آنکھوں آنکھوں میں گزار ڈالے تھے۔ اور پھر ان کا پرہیزی کھانا، وقت پر دوا اور اپنے آرام کو آرام نہ سمجھ کر ان کی ایسی رکھوالی کی کہ نائمہ بیگم کڑھ کڑھ کر کباب ہو گئیں۔ مارے غصے کے بھنا بھنا کر انہوں نے کئی بار مشکبار کو ٹوکا اور اس قدر تیمارداری پر لعن طعن بھی کی، سمجھایا بھی کہ اس قدر ایک نکھٹو شوہر کو سر پر مت بٹھاؤ۔ مگر وہ اپنے دل سے مجبور تھی کس طرح انہیں تڑپتا ہوا چھوڑ دیتی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ہفتے کے دوا علاج کے بعد گل چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دوبارہ اسی وکیل کے ہاں حاضری دینے لگے۔

دیکھتے دیکھتے ان کی عادات اور مزاج میں زمین و آسمان کے فرق حائل ہو گئے تھے۔ اول تو گاؤں سے ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور منحوس ترین ذلت اٹھا کر لوٹے تھے اور اس ناکامی نے اندر سے ان کا کلیجہ چاٹ ڈالا تھا۔ مرے پر سو درے یہ کہ نائمہ بیگم نے صحیح صورت حال کا اندازہ ہوتے ہی طوطے کی طرح نظریں پھیر لی تھیں۔ ہر وقت جلی کٹی باتوں اور طعن آمیز لہجے کے سوا ان کے پاس کے پاس کچھ بھی نہ رہا تھا۔ گل سخت مجبور تھے۔ بڑی بے بسی اور لاچاری کے عالم میں ان کی جلی کٹی سنتے رہتے۔

ان میں اور پہلے کے تر و تازہ و خوش باش گل میں کوئی قدر مشترک نہ رہ گئی تھی۔ اماں سے تو اب وہ قدرتی طور پر سہمے سہمے سے رہنے لگے تھے۔ بعض اوقات وہ سوچتے۔ مشکبار غریب کا کوئی قصور نہیں ہے مگر اسے اپنا کر معلوم نہیں میں نے اچھا کیا یا برا کیا ہے! سوائے دکھ اور پریشانیوں کے کچھ بھی تو اسے نہ دے سکا۔ مجھ سے اماں کے بغض اور ناراضگی کی یہی وجہ ہے۔ کاش! میں کچھ آمدنی کے لائق ہوتا! لیکن مجھے تو کہیں کوئی ملازمت بھی نہیں ملتی، ایسے حالات میں ماسوائے نفرت اور حقارت کے کیا مل سکتا ہے؟ بغیر کام تو پتھر بھی بھاری لگتا ہے!"

❀

یہ زہریلی سوچیں اور فکریں گل...... کو ہر وقت اندر ہی اندر چاٹتی رہتیں۔ انہوں نے اوپر جانا بہت کم کر دیا تھا اور اگر ایسا کوئی اتفاق ہو بھی جاتا تو اماں کی پیشانی کے سینکڑوں بل دیکھنے کے قابل ہوتے۔ چہرے سے خشونت ٹپکنے لگتی۔

اماں کا رویہ مشکبار کی حساس اور غیور فطرت پر تازیانے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ بھی

سب کچھ کھلی آنکھوں دیکھ اور سن رہی تھی۔ مگر وہ تو گل سے بھی زیادہ عاجز اور بے بس تھی۔ گل تو پھر بھی دن کا ایک بڑا حصہ باہر گزار کر رات کو گھر آتے لیکن وہ تو چوبیس گھنٹے سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ کبھی کبھی اماں جھلا کر اس پر پلٹ پڑتیں اور ایک سانس میں سو سو صلوٰتیں سنا ڈالتیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے مجرموں کی طرح سنتی رہتی۔

❀

وقت وقت کی بات ہے۔ ورنہ یہی گل تھے، جن کی خاطر تواضع اور عزت و توقیر کرتے نائمہ بیگم تھکتی نہ تھیں۔ ویسے تو ان کا سلوک شروع ہی سے بہت اچھا رہا تھا۔ مگر جب سے الیاس کے انتقال کے بعد وہ گاؤں سے لوٹی تھیں اور انہوں نے دل ہی دل میں مشکبار کو گل سے بیاہنے کا منصوبہ بنا لیا تھا، تب سے تو گل قطعی طور پر ان کی آنکھوں کے تارے بن گئے تھے۔ ہر کام میں انہیں اہمیت دیتیں۔ پیش پیش رکھتیں غرضیکہ گل کو پہلے تو انہوں نے عرشِ معلیٰ پر بٹھایا--اور پھر--پل بھر میں عرش سے فرش پر دے پٹخا تھا۔

اس صورت حال سے گل دل برداشتہ تو بہت تھے مگر در حقیقت بے بس اور مجبور تھے۔ ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا وہ ایک سیدھے سادھے اور شریف النفس انسان تھے۔ دنیا کے چھل فریب سے فطری طور پر بہت دور--- بچپن سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ باپ کی حوصلہ افزائی اور بڑے بھائیوں کی مہربانی کی وجہ سے اتنے عرصے تک آزادی، خود مختاری اور بے فکری سے تعلیم حاصل کرتے اگر تعلیم کی خاطر شہر نہ پڑے رہتے تو کم از کم گاؤں میں اپنی زمینداری کے کام کاج سیکھے ہوتے۔

اب حقیقت یہ تھی کہ وہ ادھر کے رہے تھے نہ ادھر کے ع نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اتنا سرمایہ مل سکا کہ کہیں ڈھنگ سے بیٹھ کر کچھ کما

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکتے۔ اور نہ گاؤں میں رہن سہن اختیار کر سکے۔ اوپر سے افتاد یہ پڑی کہ نائمہ بیگم نے اپنی ضد کے پیچھے وقت سے پہلے شادی کے بندھن میں...... بندھوا ڈالا۔ اگر یہ شادی بجائے مشکبار کے بانو سے ان کے بزرگوں کی حسب مرضی ہوتی تو یقیناً یہ حالات بھی نہ ہوتے۔ وہ لوگ ضرور اپنے بیٹے کا ساتھ دیتے۔ اسے حسبِ وعدہ کاروبار کرتے، اور اب تو محض ایک نائمہ بیگم کی جہالت نے کئی طرف آگ لگا دی تھی۔

ایک رات --- جبکہ دلشاد اور شمشاد سو چکے تھے مشکبار نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

”آپ نے گاؤں سے آنے کے بعد بتایا نہیں کہ...... وہاں آخر ہوا کیا؟“

گل کچھ دیر خاموش لیٹے سوچتے رہے پھر بڑی آہستگی سے جواب دیا۔ ”اتنے دن ہو گئے تمہیں خود اندازہ نہیں ہو سکا! میرا خیال ہے ایسی بے وقوف تو تم بھی نہیں ہو کہ...... کچھ نہ سمجھو۔ کم سے کم اماں کے سلوک نے تو بہت کچھ...... بتا ڈالا ہو گا...... کیوں؟“

وہ شرمندہ سی ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

گل اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

”میرا مطلب تمہیں شرمندہ کرنا نہیں ہے۔ میں نے تو ایک سرسری سی بات کہہ دی۔ گاؤں کے متعلق تمہیں کیا بتاتا، کوئی حوصلہ افزا بات ہوتی تو تمہیں خوشی خوشی بتاتا بھی۔ وہاں کے مایوس کن حالات میں نے فقط ابا میاں کو بتلائے تھے۔ وہ بھی ان کے دریافت کرنے پر، انہی نے شاید اماں کو بتا دیئے ہیں۔ اسی لئے وہ مجھ سے برگشتہ ہو چکی ہیں۔ اور بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔“

”کیا عباس بھائی صاحب نے آپ کو برا بھلا کہا تھا؟“ ان کے خاموش ہوتے ہی مشکبار نے جلدی سے پوچھا۔

گل نے ایک نظر اسے بغور دیکھا پھر رنجیدہ لہجے میں بتانے لگے۔ ”تمہاری دل شکنی اور رنج کرنے کی وجہ سے میں بتاتا تو کبھی نہ۔ مگر تم بھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی ہو اور ویسے بھی سوچتا ہوں کہ آئندہ حالات معلوم نہیں کیسے ہوں۔ اس لئے تمہیں صحیح حالات سے آگاہ رکھوں تو بہتر ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رک گئے۔ مشکبار کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”سنو مشکبار!“ وہ اس سے نگاہیں چار کئے بغیر گویا ہوئے۔ ”وہ لوگ ہمیں اس قدر...... حقیر اور کمتر سمجھنے لگے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ وہاں جا کر مجھے ایسے ذہنی عذاب اور کوفت سے دوچار ہونا پڑا جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، اگر میری جگہ تم ہوتیں تو روتی ہوئی واپس آتیں -- میں یہاں سے یہ سوچتا ہوا گیا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی سب چھوٹے بڑے میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ چپکے سے شادی کر لینے پر جانے کیسے کیسے طعنے دیں۔ شکوے شکایات کے دفتر کھول دیں۔ بھابیوں سے جان چھڑانی تو قطعی مشکل ہو گی۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ بڑوں کے سامنے جواب دہی ہو گی۔ تب میں کیا کروں گا؟ اپنی مرضی کا مالک ہونے کے باوجود ان کے روبرو ان کے سوالوں کے جواب دینا بہت دشوار لگ رہا تھا۔ اگر میرا جانا از حد ضروری نہ ہوتا تو شاید ہرگز نہ جاتا۔ یا کم از کم جاتا تو ابا کے ساتھ جاتا۔ اب ساری سوچوں کی وجہ سے میں بہت ڈرتا جھجکتا اور قدرے خوف زدہ سا وہاں گیا تھا۔

مگر --- تمہیں سن کر تعجب ہو گا مشکبار! کہ --- میرے ساتھ وہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ کسی نے لعن طعن کی -- نہ شکوے شکایت کے دفتر کھلے۔ نہ بھائیوں نے چھیڑا -- حتیٰ کہ میری اتنی پیار کرنے والی فاطمہ پھوپھو تک نے کوئی سوال جواب نہ کیا۔ سب کے لبوں پر ایک ایسی خاموشی، ایسی جامد چپ کی مہر لگی تھی، جسے میری کوئی...... کوشش نہ توڑ سکی۔ یہ ایک ایسی اذیت ناک سزا تھی جس نے میرے دماغ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے دن میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں دل سے خواہش کرتا تھا کہ کاش! یہ لوگ مجھے طعن طعن کریں-- مجھے گالیاں دیں۔ برا بھلا کہیں۔ مجھ سے سوال کریں پوچھیں کہ ان سب سے کیوں کٹ کر رہ گیا ہوں۔ مگر......
ان کے ٹھنڈے رویے نے مجھے اندر سے برف کر دیا۔ بظاہر کوئی بات ایسی بھی نہ تھی کہ جس کی پکڑ کی جا سکتی۔ یا مجھے شکایت کرنے کا موقع ملتا-- یا میں اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتا۔ بغیر مانگے بھابیاں کھانا سامنے رکھ دیتیں، جس چیز کی ضرورت ہوتی بلا کہے مل جاتی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب مجھے بھول چکے ہیں۔ یا میرا شمار ان سب میں نہیں ہوتا۔ وہ پہلے کی سی فضا تھی نہ ماحول۔ کم سے کم میرے لئے سب کچھ بدل چکا تھا۔

بالآخر میں نے عباس بھائی کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔

میری طرف براہ راست دیکھے بغیر انہوں نے بغیر بحث و تمہید کے جواب دیا۔

"ہمارے پاس تمہارے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ کسی مغالطے میں یا خوش فہمی میں مبتلا مت رہنا۔ نہ ہی زندگی کے کسی بھی موڑ پر آئندہ یہاں کچھ لینے دینے کی نیت سے آنے کی زحمت گوارا کرنا۔ بے شک قانون طور پر یہاں زمینوں کی آمدن وغیرہ میں تمہارا حصہ ہے مگر اب اس وقت کہ جب قانون کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اگر اس سلسلے میں ابا میاں نے تمہاری حمایت کی تو میں از خود ان سے بات کر لوں گا۔"

اس سے زیادہ نہ انہوں نے کچھ کہا، نہ میں سن سکا اس کورے جواب نے باقی کوئی گنجائش نہ چھوڑی تھی۔"

اتنا کہہ کر گل خاموش ہو گئے۔

مشکبار کسی گہری سوچ میں ڈوبی سامنے دیوار کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

آنکھوں میں شفاف آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے--- جانے کیوں!

دسمبر کی ایک بے حد یخ بستہ دوپہر تھی۔

جب دو دن کی مسلسل تکلیف کے بعد مشکبار کو قدرت نے ایک عدد تندرست اور پیارے سے بیٹے کی ماں بنا ڈالا۔

نائمہ بیگم نے سکھ اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ورنہ ان کی جان تو ہولوں میں ہی ختم ہوئی جا رہی تھی۔ خون کی کمی اور کمزوری کی وجہ سے مشکبار کی جان بس خدا خدا کر کے ہی بچ پائی تھی۔ گھبراہٹ ہی گھبراہٹ میں نائمہ بیگم نے ماسٹر اس معاملے میں وہ بہت چھوٹے دل کی ثابت ہوئی تھی۔

ماسٹر صاحب کی بیوی نے جب انہیں ہنستے ہوئے نانی بننے کی مبارکباد دی تب ان کی جان میں جان آئی اور انہوں نے بے اختیار پوچھ لیا تھا۔ "کیوں بہن! مشکبار تو ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل بھلی چنگی۔" انہوں نے کھلکھلا کر جواب دیا تھا۔

اتفاق--- یا خوبی تقدیر سے اسی دن گل کو ان کے وکیل نے کوئی کیس جیتنے کی خوشی میں کچھ روپے دے دیئے۔ ایسا کافی دنوں کے بعد ہوا تھا۔

رات کو وہ خوش خوش گھر آئے۔ یہاں آکر بیٹے کی خوش خبری ملی۔ جوشِ مسرت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے وہ تو گلنار ہو اٹھے اور سارے روپے بڑی سعادت مندی سے اماں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ تو سمجھے تھے اماں بہت خوش ہوں گی مگر انہوں نے منہ بنائے بنائے کہا تو یہ کہا۔

"دیکھو میاں! بچے کا باپ بننا کھیل تماشہ ہے نہ ہنسی مذاق---ان روپوں میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا کہ دائی کے اخراجات پورے ہو جائیں یا میں ہاتھ کھینچ کھانچ کر تھوڑا سا اچھوانی (حریرہ) کا سامان منگوالوں۔ مگر گوند کا سارا سامان، گھی اور میوہ جات تو آنے سے رہے۔ اس لئے جتنی جلد ممکن ہو سکے مجھے روپے کا بندوبست کر کے دو---اوپر سے جاڑے آچکے ہیں۔ ماں بیٹا دونوں کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ اب آنکھیں بند کر کے کام نہیں چل سکتا۔ وہ تو میری بھولی بھالی لڑکی ہی تھی جس نے کبھی تم سے کوئی فرمائش کی نہ اچھا پہننے اوڑھنے اور کھانے کو مانگا۔ جیسا بھی ہوا تنگی ترشی سے گزر اوقات کرتی رہی۔ لیکن...... میں تو یہ سب برداشت نہیں کر سکتی! بہت دنوں سے چپ ہوں۔ مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میری مظلوم بچی جس طرح خون کی کمی اور مسلسل بیماری کی وجہ سے مر مر کر جی رہی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔"

آج نائمہ بیگم نے بہت دنوں کی تھمی ہوئی بھڑاس نکال ڈالی تھی۔

گل سر جھکائے چوروں کی طرح سنا کئے۔ اس کے سوا ان کے اختیار میں، کیا تھا! یہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ اب اماں کے ہاتھوں عزت محفوظ رہنی ممکن نہیں۔ مگر ان کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بیٹے کا باپ بننے کی جتنی خوشی ہوئی تھی سب کرکری ہو گئی۔ مشکبار بے چاری کو ڈھنگ سے مبارکباد دے سکے نہ بچے کو دل کھول کر پیار کر سکے۔ دل میں تو ساس جی کی باتوں نے پھانس چبھا ڈالی تھی۔ روح میں شگاف کر دیئے تھے--

چھٹی تک تو نائمہ بیگم نے کسی نہ کسی طرح بکتے جھکتے، سو سو باتیں بناتے مشکبار کو اچھوانی پیس پیس بگھار بگھار پلائی۔ مگر پھر ہمت ہار دی۔ وہ بھلا اس مشقت کی کہاں

عادی تھیں۔ وقتی طور سے مشکبار سے ہمدردی تو بہت ہو گئی تھی مگر جب اسے چارپائی پر پڑے سب کچھ پہنچانا پڑا تو بگڑ اٹھیں۔

یوں بھی وہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ انسان تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گل سے مزید بدظن اور برگشتہ ہوتی چلی گئیں۔

ان کا خیال تھا کہ گل میں ہی کوئی ڈھنگ نہیں ہیں ورنہ یہ حالات نہ ہوتے۔ نہلے پر دہلا یہ ہوا کہ گل باوجود ہزار کوشش کے مشکبار کے لئے گوند کا سامان مہیا کر سکے نہ مزید پیسے کا بندوبست..... کہ نائمہ بیگم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بیٹی کو گوند بنا کر کھلا سکتیں۔

ان کا کہنا تھا کہ جو مرد زچہ کے اخراجات نہ اٹھا سکے، وہ شوہر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ ایسے نکھٹو مرد بچے ہی مت پیدا کرو۔

کئی دفعہ انہوں نے ابا میاں سے بھی کھلم کھلا کہا۔

"گل کے ساتھ شادی ہو کر-- میری بچی کا نصیبہ پھوٹ گیا۔"

غرض یہ کہ حالات بدستور یہی رہے اور مشکبار نے چارپائی چھوڑ کر کام پکڑ لیا۔ وہ ایک صابر اور حساس لڑکی تھی۔ وقت اور حالات نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایک طرف بے قصور شوہر کی عزت بھی عزیز تھی تو دوسری طرف اس امر کا بھی شدید احساس تھا کہ وہ حالات کے ستم اور اپنی کم نصیبی کی وجہ سے ماں اور سوتیلے باپ کے ٹکڑوں پر پڑی ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن تھا، اپنی ہڈیاں چلائے جاوے۔

❀

کڑاکے کا جاڑا۔ اور اوپر سے سارا دن گھر کا کام دھندا، ننھا سا معصوم بچہ، مشکبار کو دن میں جیسے ہی فرصت ملتی بچے کو چھاتی سے چمٹا کر بیٹھ جاتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آج کل دن ایسے بوند بھر کے ہو گئے تھے کہ کام نمٹاتے ٹھنڈی یخ بستہ رات سر پہ آ جاتی۔ اس کا بیٹا بالکل باپ کا ہمشکل تھا۔ ننھی سی عمر میں ماں بن گئی تھی۔ اسے کلیجے سے چمٹا چمٹا کر جی رہی تھی۔ بعض اوقات اسے لگتا جیسے دنیا بھر میں بس یہ ایک خوشی قدرت نے اس کی تار تار جھولی میں ڈال دی ہو۔

دلشاد اور شمشاد بھی اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔

مگر قدرت ہر کسی کو تو ایسی خوشی راس نہیں آنے دیتی۔ مصلحت وہی نیلی چھتری والا جانے۔

حرارت تو اسے کئی دن سے تھی۔

لیکن مشکبار نے اماں کے گل پر بگڑ اٹھنے کے خیال سے ظاہر نہ کیا۔ ایسی تجربے کار بھی نہ تھی کہ بچے کی صحیح حالت کو سمجھ پاتی۔ سر شام ہی اس کا ننھا سا پنڈا ابخار کی شدت سے تپنے لگا تھا۔ گل کے آتے آتے ہلکی ہلکی کھانسی بھی اٹھنے لگی۔

دونوں میاں بیوی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی گل کی جیب میں حسب دستور پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی رات کے اس سے بغیر پیسے کے کس ڈاکٹر حکیم کو جا جگاتے! اماں سے کہتے لحاظ آ رہا تھا، وہ کہتیں کھاپی تو مفت کا رہے ہیں۔ اب ان کا دوا علاج بھی کراؤ۔ سوچا صبح تک خود ہی اتر جائے گا بخار ہی تو ہے!

اگلی صبح اتوار تھی--- چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اوپر کی منزل میں دن چڑھے تک الو بولتے رہے۔ آج کے دن ابا میاں دیر تک آرام کیا کرتے تھے۔ اور ان کے آرام میں خلل نہ پڑنے کے مارے نائمہ بیگم کا حکم تھا کہ اتوار کے دن کا آغاز دیر سے کیا کرو۔ اس لئے مشکبار دھوپ نکلنے کے بعد اٹھ کر کام سنبھالتی۔

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اس نے اپنے طاہر بیگ کی خبر لی۔ جو اس کے پہلو میں لیٹا سو رہا تھا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ننھے طاہر بیگ کی آنکھیں کھلی تھیں مگر سانسیں بہت تیز تیز لے رہا تھا۔

مشکبار نے گھبرا کر گل کو جگایا۔ وہ بھی اس کی کیفیت دیکھ کر بدحواس ہو گئے۔

"اف! میرے خدا!! اب میں کیا کروں؟"

انہوں نے بے چارگی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ مشکبار بچے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑی لجاجت سے کہنے لگی۔

"اماں اور ابا میاں تو ویسے بھی آرام کر رہے ہوں گے۔ خدا کے لئے آپ ہی کہیں جائیے اور کسی جاننے والے سے قرضہ مانگ لائیے، اسے حکیم جی کو دکھا دیں!"

گل نے کوئی جواب دیئے بغیر جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ماں بیٹے پر ایک الوداعی نظر ڈال کر باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے کافی دیر بعد نائمہ بیگم کو جانے کس کام سے نیچے آنا پڑا۔ شاید آج جلدی ناشتہ تیار کروانا تھا۔

یہاں مشکبار طاہر بیگ کو گود میں لئے چپکے چپکے زار و قطار رو رہی تھی۔

نائمہ بیگم بچے کی حالت دیکھ کر بھونچکی رہ گئیں۔ ان کی تجربہ کار آنکھوں نے پل بھر میں اس کی پسلی چلتے محسوس کر لی تھی۔

"اس کی یہ حالت کب سے ہوئی؟ تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟" انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"ہائے اللہ جی! رات کو تو بالکل ٹھیک تھا--- بس تھوڑا تھوڑا گرم لگ رہا تھا۔" ااس نے رو کر جواب دیا۔

"اور...... یہ گل کہاں غائب ہے؟ رات کو آیا ہی نہیں کیا آوارہ کہیں کا۔" انہوں نے جلے کٹے لہجے میں پوچھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آئے تو تھے۔" مشکبار نے بہتے آنسو پونچھ کر جواب دیا۔ "ابھی کسی دوست وغیرہ سے ادھار قرض لینے گئے ہیں ڈاکٹر کو دینے کے لئے۔"

ارے جاؤ --- وہ کیا لائے گا بدکماؤ کہیں کا۔ گھوم پھر کے آجائے گا یہیں۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ تاؤ کھا کر بولیں۔

پھر مزید کچھ کہے غصے میں سو سو بل کھاتی اوپر چلی گئیں۔ تھوڑی سی دیر میں ماسٹر صاحب کی بیوی اپنے گھریلو چٹکلوں اور ٹوٹکوں کے ساتھ ہانپتی کانپتی آموجود ہوئیں۔ لیکن طاہر بیگ کی حالت دیکھ کر وہ بھی سناٹے میں رہ گئیں۔ ڈھائی ماہ کا معصوم بچہ پل بھر میں نیم مردہ ہو کر رہ گیا تھا تاہم انہوں نے کئی چٹکلے آزما دیکھے۔ حتیٰ کہ پسلیوں پر تیل بھی ملا مگر تکلیف میں کمی نہ آسکی۔

گل کا ابھی تک بھی دور دور اتہ پتہ نہ تھا۔ نائمہ بیگم کا ان کی طرف سے جل جل کر جی خاک ہوا جا رہا تھا۔ جتنے کوسنے اور گالیاں ...... انہیں یاد تھیں، وہ مشکبار اور ماسٹر صاحب کی بیوی کے سامنے انہیں دے چکی تھیں۔

دن کے دس گیارہ بجنے کو ہوئے تو بالآخر انہوں نے میاں کو جگایا -- انہوں نے تکیئے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کچھ روپے انہیں دے کر بولے۔ "اس نالائق کا انتظار فضول ہے کہیں جوتے چٹخاتا پھر رہا ہوگا۔ تم خود بچے کو لے کر ہمارے والے ڈاکٹر کے پاس پہنچو ---"

نائمہ بیگم خود دو دن سے نزلے زکام کی شکار ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اسی وقت یکہ بلوایا اور مشکبار کے ہمراہ ماسٹر صاحب کی بیوی کو ساتھ کر دیا۔

ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر ماسٹر صاحب کی بیوی نے یہ دور اندیشی کی کہ مشکبار کو انتظار گاہ میں بٹھا کر خود بچے کو اندر شفاخانے میں لے گئیں۔

وہی بات جس کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹر نے ڈبل نمونیہ بتا کر دوا دے دی۔

واپسی میں مشکبار اپنے ننھے لختِ جگر کو کلیجے سے چمٹائے حقیقتِ محال سے بے خبر بیٹھی تھی اور یکہ سست رفتاری سے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

ماسٹر صاحب کی بیوی بچے کی ایک ایک سانس گن رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے جھک کر بچے کو مشکبار سے اپنی گود میں لے لیا اور دل ہی دل میں کوئی دعا پڑھنے لگیں۔

گھر پہنچ کر انہوں نے اسے پھول کی طرح آہستگی سے لٹا دیا اور خود مشکبار سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔

"...... صبر کر میری بچی ...... صبر کر ...... تیری گود اجڑ گئی ...... کسی بدبخت کی نظر کھا گئی اسے ...... وہ جنت کا پرند جنت کو اڑ گیا ...... چند دنوں کے واسطے تیرے پاس مہمان بن کر آیا تھا ...... وہ تیری چیز ہی نہ تھی۔ خدا نے ...... اپنی امانت تجھ سے واپس لے لی ...... صبر کر بیٹی صبر !!"

ایک ثانیے تک تو مشکبار انہیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے تکتی رہی۔

پھر وحشی اور زخمی ہرنی کی مانند بھاگتی ہوئی طاہر بیگ پر جا کے جھک گئی۔ جس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں بند تھیں، چہرہ پھول کی پنکھڑی کی طرح کمہلایا ہوا --- ننھا فرشتہ واقعی اس سے روٹھ گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخیں مارتی ہوئی اس کے ننھے سے لاشے سے لپٹ گئی۔

اس کی آواز سن کر نائمہ بیگم بھی نیچے اتر آئیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"...... طلاق...... اور صرف طلاق...... یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔" نائمہ بیگم غصے سے لال بھبوکا ہو رہی تھیں۔

اس وقت وہ ابا میاں کے سامنے بیٹھی تھیں اور انہوں نے یہ جملہ اپنے تکیئے پر ایک زور دار مکا رسید کر کے ادا کیا تھا۔ ان کے لہجے میں ایک عجیب سی ضد اور کھنکتا ہوا تحکم تھا۔

ابا میاں کو بے اختیار وہ دن یاد آ گئے، جب بالکل اسی لہجے، اسی انداز، اسی تحکم کے ساتھ نائمہ بیگم نے ان سے گل اور مشکبار کے نکاح کا مطالبہ کیا تھا!

"سنا آپ نے!" وہ ایک دفعہ پھر آپے سے باہر ہو کر چلائیں۔ "میں اپنی لڑکی کو اب ہرگز بھی مزید تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ آپ کا نکھٹو لڑکا بیوی کے لائق ہی نہیں ہے۔ اس سے تو سو رنگ کی باتیں بنوا لو۔ جس روز سے یہ شادی ہوئی ہے، اس نے کسی دن بھی مشکبار کو کوئی شوق کی چیز لا کر دی! اس کا دل رکھا! سوائے فاقہ مستیوں اور غربت کے ہے اس کے پاس کچھ؟ ایسا کیا اندھیر کچھ کما کیا ہی نہیں سکتا۔ ہاتھ پیر مفلوج ہیں کیا! میں مشکبار کو مزید جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔ غضب خدا کا...... کن خرابیوں سے بچے کے باپ بنے۔ سب کچھ میری مظلوم لڑکی نے اپنی ہڈیوں پر جھیل

لیا۔ لڑکا بیمار ہوا تو دوا نہ علاج --- نہ پیسہ نہ کوڑی --- حتیٰ کہ اسی عالم میں چل بسا --- اور اگر ہم انتظام نہ کرتے تو بے گور و کفن پڑا رہتا۔"

"استغفر اللہ۔" ابا میاں سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ پہلو بدل کر بے اختیار بول اٹھے۔ "تمہاری زبان کے سامنے بھی ہل چلتے ہیں نائمہ بیگم...... آخر کو وہ میرا پوتا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ بے گور و کفن پڑا رہتا! بات سوچ سمجھ کر زبان سے نکالا کرو۔ اسی زبان سے تم نے ایک دن ان دونوں کی شادی کا مطالبہ کیا تھا اور آج اسی زبان سے 'طلاق' کی ضد کر رہی ہو! کیا یہ شریفوں کا قاعدہ ہے؟"

"تو گویا، ہم رذیل ہو گئے؟" وہ غصے سے بے قابو ہو کر مزید زور سے چیخیں۔ "آپ کا وہ...... لڑکا بہت شریف ہے جس نے میری ہیرا سی لڑکی کی قدر نہ جانی۔ جسے کڑھا کڑھا کر پچاس بیماریاں لگا ڈالیں۔ اپنے نکھٹو پن میں گود تک اجڑوا ڈالی۔ جس کو مانگے سے کہیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ جو بیوی کا خرچ نہ اٹھا سکے، اسے بیوی رکھنا کیا فرض ہے! دیکھئے! میں صاف صاف کہے دے رہی ہوں کہ میری لڑکی کو صرف اور صرف طلاق چاہیے۔ یہ میری فاش غلطی تھی کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اور ظاہری ستھرائی دیکھ کر مشکبار کی قسمت پھوڑ دی۔ لیکن --- اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ طلاق دلوا کر میں اس کی کسی ڈھنگ کی جگہ شادی کروں گی اور جہاں تک ممکن ہوا اپنی غلطی کا ازالہ کروں گی۔"

اوپر یہ خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی اور زینے کے بیچ کھڑی مشکبار تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جس کے بچے کا ابھی کفن بھی اجلا تھا اور ماں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ گویا مشکبار اور گل کی کوئی مرضی ہی نہ تھی۔ جب چاہا، جس سے چاہا بیاہ رچا دیا۔ اور جب جی چاہا طلاق مانگ لی۔

"اماں...... اماں! یہ کیا کر رہی ہیں آپ! ہائے اللہ کیا ہونے والا ہے؟" وہ روئے جا رہی تھی۔ ساری جان کانپے جا رہی تھی اور اپنے آپ سے کہے جا رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی دن سے

نائمہ بیگم کو جیسے رٹ لگ گئی تھی --- طلاق --- طلاق --- طلاق --- گھر کیا تھا ایک اکھاڑا بن چکا تھا۔ انہیں ایسی اپنی فطری ضد سوار ہوئی تھی کہ اپنی گھریلو زندگی میں بھی آگ لگانے پر تل بیٹھی تھیں، گل کی اتنی جانی دشمن ہوئیں کہ ان کے قدموں کی چاپ تک سے بھڑک اٹھتیں۔

❀

ابامیاں جتنا چاہ رہے تھے کہ ناپسندیدہ مطالبہ نہ دہرائیں۔ گھر کا سکون غارت نہ کریں وہ اتنی ہی آپے سے باہر ہوتی گئیں۔ ہر لمحہ تلوار بے نیام رہنے لگیں۔

کئی بار ابامیاں نے ٹھنڈے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں عباس سے بات کر چکا ہوں وقتی اختلاف ہے سب ختم ہو جائے گا۔ اس فصل پر نہیں تو آئندہ فصل پر وہ گل کو ضرور کاروبار کے لئے رقم مہیا کرے گا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ نائمہ بیگم کے دماغ کو چڑھ چکی تھی۔ 'طلاق' کا بھوت سر چڑھ کر بول رہا تھا پورے زوروں سے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ --- نائمہ بیگم نے جاہل اور پھوہڑ عورتوں کی زبان کا آزادانہ استعمال شروع کر دیا اور اٹھتے بیٹھتے پکارتیں۔

"طلاق نہ دینے والے کتے کی موت مریں ---"

"خدا کرے سب پر بجلی کا گولہ ٹوٹے ---"

"سب کے سب بے موت مارے جائیں ---"

ایسی اور اس سے بھی بدتر گالیاں اور کوسنے ایجاد کر کے باپ بیٹے کو سناتیں۔

اور حرامی کا لفظ ابامیاں کے لئے کائنات کی سب سے بڑی گالی تھا۔

ایک رات ---

نمازِ عشا کے بعد وہ گل کو کان سے پکڑ کر مسجد میں لے گئے۔

اور وہیں پر --- مشکبار کو طلاق دلوا دی۔

اللہ اللہ --- کس درجہ مجبور اور بے بس تھی مشرق کی وہ بیٹی جس کا دل اندر ہی اندر اس سانحہ عظیم پر کراہ رہا تھا۔ مگر زبان پر چپ کی مہر لگی تھی --- کتنا صابر، مظلوم اور بیکس تھا وہ بیٹا -- جسے لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی طلاق دینی پڑی ---

دونوں کو یہ قطع تعلق نامنظور تھا ---

مگر دونوں ہی کو --- 'ہاں' کرتے بنی۔

ایک ماں کی طرف سے مجبور تھی تو دوسرے فریق کو باپ نے بے بس کر ڈالا تھا۔

❀

سننے میں یہی آ رہا تھا کہ وہ --- بہت بڑا آدمی تھا۔

امیر کبیر اور دھن دولت والا۔ روپیہ پیسہ اس کے گھر کی باندی اور مالی سکھ چین اس کی دہلیز کے دست بستہ غلام ---

تھوک پرچون کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔ وہ عام لوگوں کو اس کنٹرول کے زمانے میں ولایتی چینی اور مٹی کا تیل سپلائی کرتا تھا۔ اور کئی طرح کے کاروبار اس کی مٹھی میں تھے۔ غرضیکہ روپے پیسے کی اس کی ہاں کوئی کمی اور محرومی نہ تھی۔

نائمہ بیگم اور کیا چاہئے تھا۔ وہ بار بار کہیں،

"ارے یہ سب میری مشکبار کا کھلنے والا اونچا مقدر ہے کہ اتفاق سے اس کے ماموں جان ادھر آ نکلے اور یہ شاندار اور بڑھیا رشتہ بتا دیا۔ اللہ انہیں سکھی رکھے۔

اور حقیقت میں یہ رشتہ ذاکر حسین نے لگایا تھا۔ جو خدا جانے کس طرح گھومتے پھرتے ایک دن ادھر آ نکلے تھے، یہ وہی دن تھے جب مشکبار کی طلاق ہوئی تھی اور نائمہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیگم ادھر ادھر ملنے والوں سے کسی اچھے اور پیسے والے 'بر' کی تلاش کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ ہو-- لڑکا روپے پیسے والا ضرور ہو۔

طلاق کے بعد گل نے یہاں رہنا چھوڑ دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں رہ رہے تھے!

ابا میاں کو نائمہ بیگم کی سرگرمیوں سے کوئی واسطہ تعلق نہ تھا۔ سیاہ و سفید کی مالک وہی تھیں۔ مشکبار کو دوبارہ بیاہتیں، یا نہ-- ان کی مرضی پر منحصر تھا۔ لڑکی ویسے ہی اللہ میاں کی گائے تھی۔ اب چاہے جس بھی کھونٹے سے باندھ دی جاتی!

انہیں حسب مرضی 'بر' مل گیا تھا۔ ساری تفصیلات ذاکر حسین نے مہیا کی تھیں ایک مدت کے بعد دونوں بہن بھائی میں دوبارہ گھٹ گھٹ کر باتیں ہوئیں۔ اندر ہی اندر معاملات طے ہوئے، رسموں اور شرائط پر تبادلہ خیالات ہوا۔ غرض یہ کہ ہر مسئلے پر تفصیل سے بات چیت ہوئی لڑکے کی طرف سے ہر ذمہ ذاکر حسین نے اپنے سر قبول کیا تھا اور ہر طرح سے بہن کو اطمینان دلایا تھا اور بار بار بے فکر رہنے کی تاکید کی تھی۔

ایک روز بہن کے اصرار پر ذاکر حسین اس لڑکے کو اپنی کار پر ذرا سی دیر کو لائے بھی نائمہ بیگم نے دیکھا اور پسند بھی کیا چند ضروری قسم کی باتیں بھی طے کر لیں۔

اور اس طرح---

مشکبار کی رائے لئے بغیر ایک بار پھر نائمہ بیگم نے اس کے دو بول پڑھوا دیے۔

رخصتی کے وقت اس کا کیا حال ہوا، دلشاد اور شمشاد نے کیسی کیسی پچھاڑیں کھائیں اور اس کا سرخ زرتار آنچل پکڑ پکڑ کر نہ جانے کی التجائیں اور فریادیں کیں-- دیکھنے والوں کے کلیجے شق ہوتے تھے۔

گھونگھٹ کی اوٹ میں اس مظلوم و یتیم لڑکی کو غش آ آ گیا-- مگر رخصتی مسلم تھی-- وہ کسی دوسرے کے نام کی ہو چکی تھی۔ بھائیوں کے پاس کیسے رہ جاتی؟ کون رہنے دیتا۔

نیچے کا وہ کمرہ جو ایک زمانے سے اس کے دم سے آباد تھا جہاں اس نے بھائیوں کے ساتھ بچپن کا ایک حصہ گزارا-- جس کمرے کو میکہ بھی سمجھا-- سسرال بھی جانا-- گل کو ایک نئے روپ میں بھی دیکھا، جہاں ماں بھی بنی، گود بھی اجڑی، طلاق بھی پائی، سزا بھی کھائی-- اس کے جانے کے بعد وہی کمرہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

اس رات-- دونوں بھائی ایک دوسرے سے چمٹ کر خوب روئے۔

ان کی آپا بچھڑ گئی تھی، آج وہ سچ مچ تنہا ہو گئے تھے-- جیسے بن ماں باپ کے بچے! صحیح معنوں میں مشکبار اس دن بھائیوں سے جدا ہوئی تھی۔

ورنہ کسی نہ کسی صورت ایک دوسرے سے بچھڑنے تو نہیں پائے تھے۔ ان دونوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی آپا کن کالے کوسوں بیاہ کر گئی ہے! کونسا دیس تھا وہ! دونوں کہاں ڈھونڈھنے جاتے اسے۔ انہیں مزے مزے کی کہانیاں سنا سنا کر سلانے والی جا چکی تھی--- ان کی بے ضرر ضدیں اور شرارتیں سہنے والی جانے کہاں چھپ گئی تھی! اب ان کے اسکول کے بستے کون ٹھیک کرے گا! اماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے کون بچائے گا۔ پیار سے ماتھا چوم کر گود میں کون بھرے گا۔

اور پھر وہ سچ مچ اپنے بھائیوں سے ایسی بچھڑی کہ پھر کبھی نہ مل سکی۔ دل اندر ہی اندر سگے خون کے رشتوں کو پکارتا رہا۔

وقت کے سرد و گرم میں سال، صدیاں بن کر بیت گئے اور وقت کا پنچھی اپنے نوکدار پنجوں میں لمحوں کی ڈور تھامے کہیں سے کہیں جا پہنچا، مگر مشکبار کا میکے لوٹ کر نہ آنا ہوا۔ اسے ایک دیو کی قید سے رہائی نہ نصیب ہو سکی۔ وہ اپنی قسمت پر شاکر تھی۔

سارا دن کام دھندے میں نمٹ جاتا تو رات کو لیٹ کر گئے دنوں کا شمار کرنے لگتی-- دلشاد اور شمشاد کتنے بڑے بڑے ہو گئے ہوں گے! ابا میاں اور اماں کس حال میں ہوں گے--؟ گل خبر نہیں کہاں-- اور کیسے ہوں گے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس آدمی، سعید خان کے جتنے بھی قصے اس نے وہاں اپنے گھر میں سنے تھے، سب حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے تھے، بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی کھاتا پیتا اور امیر آدمی تھا۔ بڑے بڑے کاروبار میں اس کا ہاتھ تھا۔ سامان سے بھری بھرائی دکانیں، یہ بڑا عظیم الشان گھر تھا۔ اور گھر میں بہت سارے لوگ تھے--

جی ہاں-- بہت سارے لوگ۔ کئی ایک اس سے کہیں بڑی اس کی سوتیلی بیٹیاں تھیں--ایک شادی شدہ سوتیلا بیٹا تھا۔ اسی ترتیب سے ایک بہو اور چند پوتے پوتیاں بھی--اور--ایک عدد بھاری بھرکم سوت بھی تھی۔

سعید خان کی امارت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

کسی زمانے میں وہ بہت حسین اور رعنائی کا مجسمہ رہا ہوگا۔ مگر اب پچاس پچپن کے پیٹے میں آکر زمانے کے سرد وگرم کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ یوں بھی وہ ایک سخت گیر اور تند خو مرد تھا لہجے میں کاٹ سرکشی، دولت کا غرور، اپنی بڑائی کا زعم۔ بات کرتا تو طنز کے پیرائے میں۔ عورت درحقیقت اس کے نزدیک پیر کی جوتی تھی۔ اسنے مشکبار سے شادی محض بیٹے کے ارمان میں کی تھی۔

پہلی بیوی نے اسے پہلا بیٹا دینے کے بعد آگے پیچھے سات عدد ایک سے ایک حسین لڑکی کا باپ بنادیا تھا تاہم یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ کم سے کم ایک بیٹا تو اس نے پیدا کر ہی دیا تھا جس کے صلے میں سعید خان نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکالنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مگر دو چار بیٹوں کا ارمان اس کے دل میں گویا گڑ کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مشکبار سے سب سے پہلی بات بیٹے کی دہرائی تھی اور وہ بے چاری ٹکر ٹکر اس اپنی عمر سے کئی گنا بڑے شوہر نامدار کی صورت تکتی رہ گئی تھی جو اس

کی اماں اور ماموں کے بقول 'لڑکا' تھا---

اور بیٹے کا مطالبہ کچھ ایسے رعب سے کر رہا تھا جیسے مشکبار کے اختیار میں ہو۔

سال بھر کے بعد---

مشکبار کے ہاں پہلی بیٹی نے جنم لیا---

سعید خان نے اسے بھرے گھر کے سامنے پیٹ ڈالا۔ اس کی حالت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ دائی پیسے لئے توبہ توبہ کرتی بھاگ گئی، یہاں باقی سب سوتیلے رشتے تھے۔ کون بچاتا؟ کون حمایت و ہمدردی جتاتا۔ وہ اس وحشی کے ہاتھوں پٹتی رہی اور ہنسنے والے خوش ہوتے رہے۔ سوتیلی لڑکیاں ٹھٹھے لگایا کیں۔ سوت کے دل میں اس ناکردہ گناہ کی توہین اور پٹائی سے منوں ٹھنڈک اتر گئی۔

بعد میں تو گویا یہ سلسلہ چل ہی نکلا، ذرا ذرا سی بات پر روئی کی طرح دھنک کر ڈال دی جاتی۔ جوں جوں اس کے ہاں بیٹیوں کا اضافہ ہوتا گیا سعید خان کو گویا اس سے عداوت اور چڑ بڑھتی گئی۔

تین بیٹیوں کا باپ بن جانے کے بعد جب چوتھی بار مشکبار کا پاؤں بھاری ہوا تو سعید خان نے صاف صاف اسے جتادیا۔

"اگر اس دفعہ بھی---لڑکی پیدا کی تو تجھے تین طلاقیں کھڑے کھڑے۔"

مشکبار اس مدت میں اپنی جان تک سے بیزار ہو چکی تھی۔ اس نے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ "اے رب پاک تجھ سے کچھ طلب نہیں کرتی بس عزت کی موت چاہئے۔"

مگر منہ مانگی موت بھی مقدر والوں کا حصہ ہوتی ہے۔

مشکبار بھی زندہ رہی---اور چوتھی بچی بھی نو بہ تندرست پیدا ہوگئی۔

یہ وہ یادگار زمانہ تھا جب تقسیم ہند کے آثار مکمل ہو چکے تھے اور گلی کوچے محب وطن افراد کے پرجوش نعروں سے گونجنے لگے تھے--

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بٹ کے رہے گا ہندوستان---

لے کے رہیں گے پاکستان---پاکستان زندہ باد---

اور---اتفاق دیکھئے کہ جس رات مشکبار کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی، وہ تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی رات تھی، ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کی عہد آفریں رات، جب پورا ہندوستان ریڈیو پر کان لگائے بیٹھا تھا، سعید خان بے چینی سے اپنے گھر کے آنگن میں ٹہل رہا تھا۔ کان دائی کی آواز پر لگے تھے۔

چوتھی لڑکی ہوئی ہے......بیٹی مبارک ہو خان صاحب۔"

اس کی پہلی بیوی نے بند دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر طنزیہ اطلاع دی۔

سعید خان نے ایک سانس میں پچاس گالیاں دے ڈالیں۔ اس نے کھلے ریڈیو کی بات بھی نہ سنی جو اس علاقے کے ہندوستان میں شامل ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

سعید خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ---ایک زوردار ٹھوکر مار کر بند دروازہ ہلا ڈالا اور کمرے میں گھس کر پوری قوت سے دھاڑا۔

"نکل جا میرے گھر سے...... جس دن سے آئی ہے لڑکیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ میں تجھے سات طلاقیں دیتا ہوں۔ جا تجھے طلاق ہے۔ طلاق ہے۔ طلاق ہے۔ میں نے تجھے تیری ساری لڑکیوں سمیت چھوڑا---"

یہ کہتے کہتے اس نے مظلومیت کی تصویر بنی پڑی مشکبار کے بال مٹھی میں پکڑے اور گھسیٹتا ہوا گلی میں پٹخ آیا۔ پھر یکے بعد دیگرے ابھی کی پیدائش سمیت چاروں لڑکیوں کو بھی مشکبار کے پاس بٹھا آیا اور خود اندر گھس کر کنڈی لگالی۔

ظلم وستم اور بربریت کی انتہا ختم ہو چکی تھی۔ نہ کوئی سننے والا تھا نہ ساتھ دینے والا۔ لڑکیاں بلک بلک کر رو رہی تھیں مگر مشکبار کی آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس کی ویران اور سنسان آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ گر سکا--

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

یہ مسلمانوں کا محلہ۔ یہاں سب سے اونچا اور بڑا مکان سعید خان کا تھا۔ وہ یہاں کا سب میں امیر ترین آدمی تھا۔ جو رات کے سناٹے اور ان بوجھل لمحات میں بیوی بچوں کو باہر نکال کر شاید سکھ کی میٹھی نیند سو بھی چکا تھا۔

رات کے اس پہر-- جبکہ دنیا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی ان ماں بیٹیوں پر ادھر ادھر گلی کوچوں کے آوارہ گھومنے والے کتے بلے ٹوٹ پڑے۔ کبھی کوئی کتا آکر ستانے لگتا۔ تو کبھی کسی بلے بلی کو شرارت سوجھ جاتی۔ لڑکیاں سہم سہم کر ماں سے چمٹ جاتیں۔

مشکبار کے ہوش و حواس تو ویسے ہی معطل ہو چکے تھے اور کچھ تو کر نہ سکی۔ لڑکیوں کو لے کر گلی سے بہت پیچھے ایک-- کھنڈر پڑے ہوئے مکان کے سائے میں بھکارنوں کی طرح جا پڑی-- مگر گھر کا بند دروازہ اس نے بھی نہیں کھٹکھٹایا---وہ طلاق کی اہمیت کو سمجھتی تھی۔ وہ پہلے بھی یہ بول سن چکی تھی اب اس میں مزید ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ سعید خان کے جور و ستم سہہ سکے۔

بچیاں اونگھ اونگھ کر سو رہیں---خود اس پر بھی جیسے غشی طاری ہو گئی-- تب جیسے--اس کے حواس بیدار ہو گئے۔

اس نے دیکھا شعلوں کی روشنی میں بہت سارے لوگ کلہاڑیاں، بلم اور کرپانیں لئے سعید خان کا اونچا گھر گھیرے کھڑے ہیں اور زور زور سے چلا رہے ہیں۔

"ست سری اکال--گرو جی کی جے--ست سری اکال--"

"ہیں...... نہیں......" اس نے آنکھیں مل ڈالیں۔

"قدرت اتنی جلدی انصاف نہیں کر سکتی! سعید خان کو قیامت کے بورئیے گھسیٹنے ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن انصاف کی گھڑی واقعی آن پہنچی تھی۔

سعید خان پر توبہ کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ سارے علاقے کے سکھوں کا جتھا اس کے بلند و بالا گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ہر کسی کو مال کی کشش کھینچ لائی تھی۔

انہوں نے اندر سے چوہے کا ایک بچہ بھی نہ نکلنے دیا۔ مشکبار کے دیکھتے ہی دیکھتے ظلم و ستم کا گہوارہ وہ گھر جل کر خاک ہو گیا۔ روپیہ پیسہ اور عزتیں وہاں لے نکالنے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے سکھوں نے چاروں طرف سے اس میں آگ لگا دی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان کی خبر لانے لگے۔ اندر بند کمروں کے مکینوں کی چیخیں گونجتی رہیں اور صبح ہونے تک یہ سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ سعید خان کی دولت، روپیہ اور زندگی راکھ کا ایک بلند و بالا ڈھیر بن گئی۔

مشکبار نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے حق و انصاف کا بول بولا دیکھا۔ وہ تو ستم سہتے سہتے ایسی بے حس ہو چکی تھی کہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اور جب ظالموں کا حساب لینے کے لئے گرتی ہے تو تہہ و بالا کر ڈالتی ہے-- ذرا سی دیر میں وہاں دوبارہ سناٹا طاری ہو گیا۔ لوٹنے والے فتح کے نعرے لگاتے ہوئے کسی دوسری طرف حملہ کرنے چلے گئے اور اس محلے میں الو بولنے لگا۔

خدا کے اس آنکھوں دیکھے انصاف پر مشکبار ہنستی، کبھی روتی اس کھنڈر سے باہر نکلی اور اپنی نجات دہندہ چھوٹی بچی کو سینے سے چمٹائے گھسٹتی ہوئی اسی گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئی جہاں ایک دن سرخ جوڑا پہن کر اتری تھی۔ اور آج -- طلاق پا کر نکلی تھی--

❀

صبح صادق کا وقت تھا۔ ہر طرف مدھم اجالے بکھرنے لگے تھے اور اندھیرے

اجالے کے اس سنگم میں سعید خان کا گھر ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ جیسے ایک ڈراؤنا خواب۔ ایسے میں اچانک --ایک ٹرک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس سے کچھ فاصلے پر آ کر رکا۔ اور اس میں بلوچ رجمنٹ کے چند سپاہی کود کود اس کے گرد جمع ہو گئے اور ان میں سے ایک نے مشکبار سے مخاطب کر کے کہا۔

"چلو بی بی-- چلو-- دیر مت کرو۔ یہ ٹرک پاکستان جا رہا ہے۔ ہم تمہیں پہنچائیں گے۔"

"پاکستان--!" مشکبار کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر کلیاں سی چٹک اٹھیں۔

"ہاں پاکستان-- مشکبار پاکستان-- جو ہم سب کی آخری پناہ گاہ ہے۔"

اتنی مدت کے بعد گل کو سامنے یوں اچانک پا کر مشکبار کی نگاہیں جھپک گئیں۔ مگر آج -- معجزوں کا دن تھا، آج قدرت ہر نظارہ دکھانے کو تھی۔ گل نے اس کا گھر دیکھ کر کہا۔

"مشکبار! مجھے معلوم تھا یہ علاقہ ہندوستان میں جانے کو ہے۔ یہ ٹرک مہاجرین کو لے کر پاکستان جا رہا تھا میں نے محض شبے میں یہاں رکوا لیا۔ بس اب فوراً چل دو۔"

"امی! ہم کہاں جا رہے ہیں!" مشکبار کی بڑی بیٹی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"سایہ گل میں بیٹا!" مشکبار نے گل کی طرف دیکھ کر بے اختیار جواب دیا۔

اس ٹرک میں لٹے پٹے مہاجرین کی خاصی تعداد ٹھنسی تھی۔ مشکبار اور اس کی بچیوں کو بھی بٹھا لیا گیا-- وہیں دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستان سنائی۔

بعد میں گل کی شادی بھی بانو سے کر دی گئی تھی جو اسی برس ہیضے کی وبا میں چل بسی تھی۔ ایک لڑکا تھا جو گل اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اماں ابا لکھنؤ میں تھے۔ وہاں فساد نہیں ہوا تھا۔

اگلی شام -- جبکہ سورج ڈوبنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہ ٹرک لاہور کیمپ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے سامنے جارکا۔ یہاں لٹ لٹ کر آنے والے مہاجرین کے قافلے کے قافلے پڑاؤ ڈالے تھے۔ کوئی خاندان کے خاندان لٹا کر آیا تھا۔ کوئی رو رہا تھا کوئی بین کر رہا تھا۔

شام کے ملگجے اندھیرے میں گل نے ان سب کو نیچے اتارا۔ اپنے لڑکے اور مشکبار کی بچیوں کو ترتیب سے کھڑا کیا اور سامنے شہر لاہور کی چمکتی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"یہ سرزمین پاک ہے مشکبار -- جس کے خواب ہماری آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ جس کی خاطر اتنی قربانیاں دی گئیں -- تم نے ہندوستان سے چلتے وقت کہا تھا نا مشکبار کہ ہم سایہ گل میں جا رہے ہیں۔ تمہارے منہ سے نکلا ہوا یہ جملہ بہت قیمتی ہے۔ میرے نام کی مناسبت سے اسے مت جوڑو۔ یہ کہو کہ پاکستان واقعی ہم لٹے پٹے مہاجرین کے لئے سایہ گل ہے۔ ہم سب اس کی چھاؤں میں نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ یہاں محنت مزدوری کریں گے اور صاف نیت سے زندگی کے بقیہ دن گزاریں گے۔ پاکستان سایہ گل ہے۔"

مشکبار کی اشکبار نگاہیں لاہور پر جمی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو -- پاکستان سایہ گل ہے۔"

0301-7283296

المدینہ کشیدہ کاری
نزد گھنٹہ گھر کبیر والا
0301-7283296
0334-9630911

آئیڈیل پبلک لائبریری
نزد گھنٹہ گھر کبیر والا
0301-7283296
0334-9630911

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com